اسلام پر کیا گذری؟

ضحی الاسلام

(جلد اول)

تصنیف: علامہ احمد امین مصری

ترجمہ: مولانا عمر احمد عثمانی

پیشکش:

یزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷- بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور
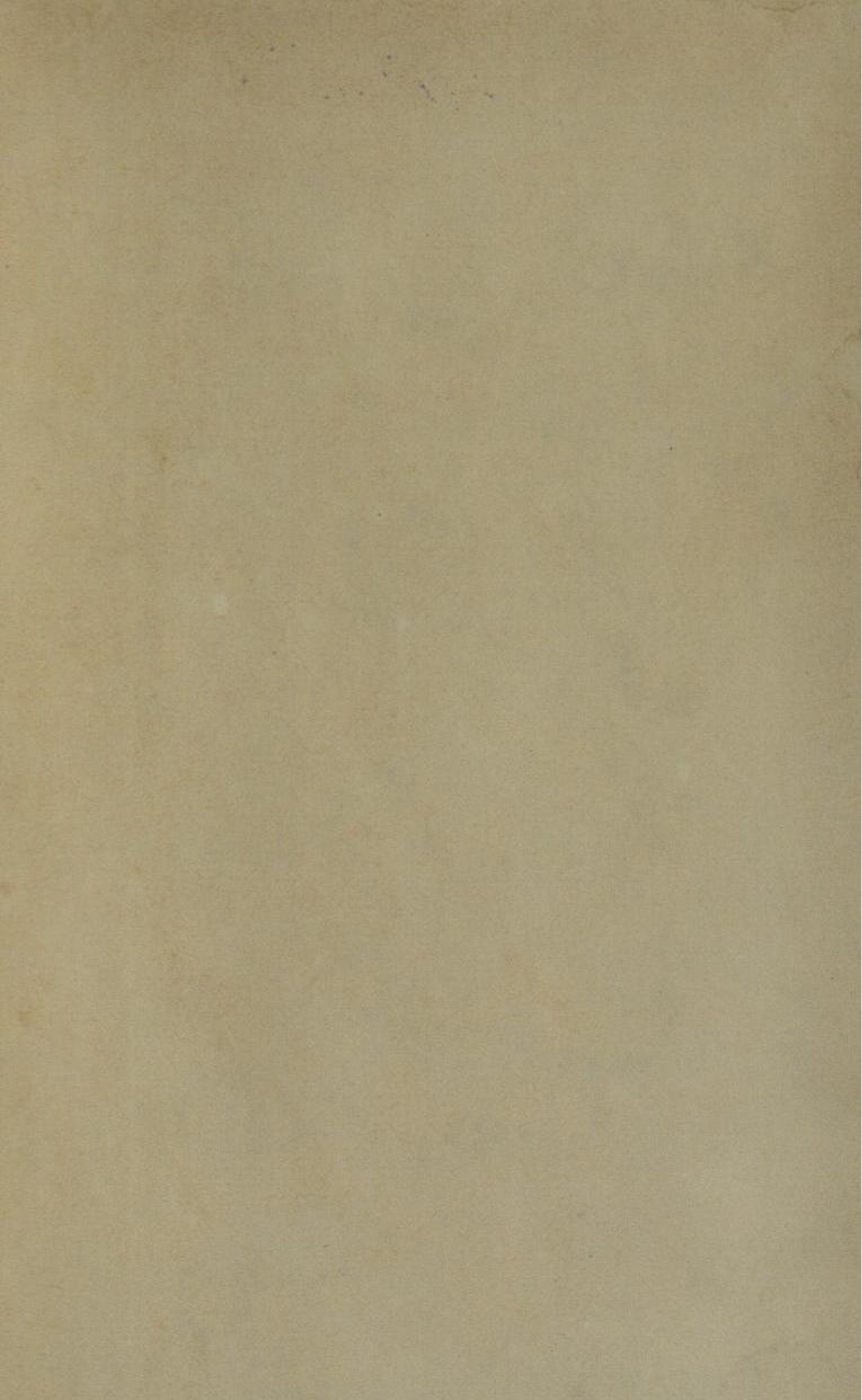
اسلام پر کیا گذری؟

ضحی الاسلام

تالیف
پروفیسر احمد امین مصری

جزء اول ـــ حصہ اول

(مترجمہ)
مولانا عمر احمد عثمانی

شائع کردہ:- میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ - لاہور

Kaka

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات

اسلام پر کیا گذری؟

جزو اوّل ـــــ جلد اوّل

عنوان	صفحہ
مقدمہ از مترجم	
تعارف از مصنف	
مقدمہ از ڈاکٹر طٰہٰ حسین	
پہلا باب	
فصل اوّل	۱
(دولت عباسیہ کے دور میں حیات اجتماعی)	″
علمی تحریک میں عہد اموی اور عہد عباسی کا مقابلہ	۴

صفحہ	عنوان
۱۰	وہ عناصر جن سے مملکت بنی تھی
۱۴	خواہشات اور سیاسی میلانات میں ان کا اختلاف
۱۶	ادب میں ان کا اختلاف
۱۸	عمل تولید
۲۳	مولّدین کے امتیازات
۲۸	تولید عقلی
۳۲	مختلف عناصر میں ہم آہنگی و یک رنگی
	فصل دوم
۳۵	(عربوں اور مَوَالی کے درمیان مقابلہ)
″	عرب جاہلیت میں قبائلی شعور کا غلبہ
۴۰	اسلام نے عربوں میں قومی شعور پیدا کیا۔
۴۱	قبائلی عصبیت
۴۵	موالی کے خلاف عربوں کا تعصب
۴۷	عصبیت کے خلاف اسلامی تعلیمات
۶۱	موالی کا عربوں کے خلاف تعصب
۶۵	عہد اموی میں دونوں عصبیتوں کی تاریخ
۷۵	عہد عباسی میں دونوں عصبیتوں کی تاریخ

صفحہ	عنوان
۹۶	معاملہ کی صورتیں
۱۰۷	اس کا نتیجہ
	تیسری فصل
۱۰۹	(شعوبیت)
"	اس عہد کے نمایاں رجحانات
۱۱۶	مساوات کا رجحان
۱۱۹	غیر عربی سیادت کا رجحان
۱۲۲	شعوبیت کا لفظ اور اس کا اصل سرچشمہ
۱۲۶	شعوبیت کی ابتداء
۱۲۹	شعوبیت کے اوصاف
۱۴۱	لٹریچر پر اہل شعوبیت کے اثرات
۱۵۰	شعوبیت کی مختلف صورتیں جن سے اس نے عربوں کے ساتھ جنگ کی
"	لٹریچر پر اہل شعوبیت کے اثرات
۱۶۰	
۱۷۵	علم پر اہل شعوبیت کے اثرات
	فصل چہارم

عنوان	صفحہ
(غلام اور تہذیب پر ان کے اثرات)	۱۸۰
اسلام میں غلاموں کا قانونی موقف	۱۸۰
غلاموں کی تجارت	۱۹۰
غلاموں کی مختلف انواع اور ہر نوع	۱۹۶
باندیوں کی تعلیم و تربیت	۲۰۳
ثقافت اور فنون پر باندیوں کے اثرات	۲۱۲
آزاد عورتوں اور باندیوں میں مقابلہ	۲۲۵
فصل پنجم	
لہو و لعب کی زندگی اور حقیقت پسندانہ زندگی۔	۲۳۱
امویوں اور عباسیوں کے درمیان مقابلہ	۲۳۲
اس عہد میں لہو و لعب کا تدریجی ارتقاء اور اس کی تاریخ۔	۲۳۶
سفاح	۲۳۹
منصور	۲۴۰
مہدی	۲۴۵
ہارون رشید	۲۵۵
امین	۲۶۶

عنوان	صفحہ
شراب کے متعلق گفتگو اور مذاہب کا بیان	۲۷۱
عباسی خاندان اور لوگوں پر اس کے اثرات	۲۷۹
ترفہ کے مظاہر	۲۸۱
ترفہ کا حجاز سے عراق کی طرف انتقال	۲۸۹
دولتمندی اور تنگدستی میں لوگوں کے مختلف حالات	۲۹۲
اصلاح کی تحریک اور زہد کی طرف میلان	۳۰۳
زہد اور اس کے اسباب	۳۰۶
علم، ادب اور فن پر ان حالات کے اثرات	۳۱۲
فصل ششم	
(زندقہ کی زندگی اور ایمان کی زندگی)	۳۱۸
زندقہ اور ایمان میں جنگ	″
عہد عباسی میں زندقہ پھیلنے کا سبب	۳۲۰
خلفائے عباسیہ کے عہد میں زندقہ کی تاریخ۔	۳۲۳
مختلف معانی جن پر زندقہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔	۳۳۸
موالی اور عربوں میں زندقہ	۳۵۲
زندقہ کے اسباب و وجوہ	۳۵۹

زندیق کے بارے میں فقہی فیصلہ	۳۶۶
ایمان	۳۶۷
مومنین کا بلند تر نمونہ	۳۶۸

اتحاد پریس بل روڈ لاہور

مقدمہ

(از مترجم)

"فجرالاسلام" کے بعد اسی سلسلہ کی دوسری کتاب یعنی "ضحی الاسلام" کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ محترم پروفیسر احمد امین مصری مرحوم کی یہ دوسری بلند پایہ کتاب ہے۔ جس میں ان کی علمی اور تحقیقی شان اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کتاب کا تعلق چونکہ عباسی دور حکومت سے ہے جو علمی اعتبار سے تاریخ میں اسلام کا نہایت درخشاں دور کہلاتا ہے۔ اس لئے مصنف نے بھی اپنی اس کتاب کا نام "ضحی الاسلام" تجویز کیا ہے۔ "ضحی" عربی زبان میں چاشت کے وقت کو کہتے ہیں جبکہ آفتاب اپنی پوری درخشانیوں کے ساتھ کافی بلند ہو چکتا ہے اور دنیا بقعۂ نور بن جاتی ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں یہ بتایا ہے کہ عباسی دورِ حکومت (دوسری

صدی ہجری) میں کون کونسی علمی تحریکات پیدا ہوئیں اور وہ کس کس انداز سے مسلمانوں کی حیات اجتماعی پر اثر انداز ہوئیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں یونانی فلسفہ، منطق، طب اور دیگر علوم و فنون عربی میں ترجمہ ہو کر مسلمانوں میں اچھی طرح پھیل چکے تھے۔ زردشتی اور مانوی فلسفۂ زندگی، ہندی ویدانت اور دیگر علوم و فنون، یہودی اور عیسائی ثقافت سے متعلق علوم و فنون اور سب سے بڑھ کر افلوطین اسکندرانی کا فلسفۂ جدیدہ اور تصوف عربی زبان میں منتقل ہو کر مسلمانوں میں رس بس چکے اور ان کے عقول و اذہان پر چھا چکے تھے۔ دیگر اقوام کے کثیر التعداد لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو کر اپنے اپنے ذہن اور اپنی اپنی عقل کے مطابق اسلام کی تعبیرات کر رہے تھے۔ دوسری قوموں کے جو لوگ مسلمان ہو رہے تھے ان کی اپنی اپنی ثقافت اور اپنی اپنی تہذیب تھی۔ ان کے اپنے اپنے علوم و فنون تھے اور ان کی اپنی اپنی رسوم و تقلیدات تھیں جو صرف اسلام کا کلمہ زبان سے پڑھ لینے سے بالکلیہ ان کے دماغوں اور ذہنوں سے محو نہیں ہو سکتی تھیں۔ جس ثقافت اور تہذیب پر وہ پیدا ہوئے اور جن علوم و فنون میں انھوں نے پرورش پائی تھی انھوں نے ان کی عقول و اذہان کو خاص سانچوں میں ڈھال دیا تھا۔ ان کا ایک خاص مزاج بنا دیا تھا یہ بالکل فطری چیز تھی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو انہی سانچوں کے

مطابق اور اپنے مزاجوں کے انداز سے دیکھتے اور انہی کے مطابق ان کی تعبیر و تشریح کرتے۔ اس طرح دو گونہ طریقوں سے مختلف ثقافتیں مسلمانوں میں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں۔ ایک تو تصنیف و ترجمہ کی راہ سے اور دوسرے دیگر اقوام کے اسلام میں داخلہ کی راہ سے۔

جب قومیں ایک دوسری سے ملتی ہیں اور مختلف علوم و فنون جنم لیتے ہیں تو تاثیر اور تاثر کا یہ عمل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ داد و ستد کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور امتزاج و اختلاط سے ایک ایسا معجون مرکب تیار ہو جاتا ہے جس میں ہر علم و فن کی چاشنی اور ہر قوم و ملک کی ثقافت کا رنگ جھلکتا ہے۔ دوسری صدی ہجری کا زمانہ مسلمانوں کے لئے دراصل ایسا ہی زمانہ تھا جس میں اختلاط و امتزاج کا یہ عمل اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری تھا۔ اور مسلمان اقوام کا ایک مرکب مزاج بننا شروع ہو چکا تھا۔ جو نہ تو خالص عربی یا اسلامی تھا اور نہ ہی خالص یہودی، نصرانی، زردشتی، مانوی، ہندی، یا اسکندرانی تھا۔ مختلف اقوام کے اختلاط و امتزاج اور مختلف ثقافتوں کے باہمی ازدواج کا یہ فطری نتیجہ تھا۔ اس میں نہ ان لوگوں کے ارادہ کو کوئی دخل تھا نہ ان کی کسی خواہش کو۔ مختلف قومیں جہاں بھی ایک جگہ جمع ہوں گی اور کچھ عرصہ تک ایک ساتھ رہیں گی وہاں ہمیشہ یہی اثرات

فطری طور پر مرتب ہوں گے۔

کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں، خود برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجئے۔ یہاں کچھ تو ہندوستان کے قدیم باشندے تھے جو پہلے سے یہاں بود و باش رکھتے تھے۔ جن کی اپنی تہذیب و ثقافت تھی اور اپنی رسوم و تقلیدات تھیں۔ محمد بن القاسم کے حملہ کے ساتھ عرب اقوام نے اِدھر کا رُخ کیا اور وہ یہاں آکر آباد ہو گئیں۔ اُن کی بھی اپنی زبان اپنی ثقافت اور اپنی رسوم و تقلیدات تھیں۔ اِس کے بعد ایرانی، افغانی، ترکی اور تاتاری قوموں نے اِدھر کا رُخ کیا اور ہر قوم اپنے ساتھ اپنی زبان اپنی ثقافت اور اپنی رسوم و تقلیدات لے کر آئی۔ یہاں کے قدیم باشندوں میں سے ایک جم غفیر اسلام میں داخل ہوتا رہا۔ اس کے بعد اختلاط و امتزاج کا عمل شروع ہوا اور اثر اندازی اور اثر پذیری یا داد و ستد سے کچھ عرصہ کے بعد ہندی مسلمانوں کی جو مرکب زبان، مرکب ثقافت اور مرکب رسوم و تقلیدات تیار ہوئیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ کہ ان کی زبان ان، تمام زبانوں کا مجموعہ اور ان کی تہذیب تمام تہذیبوں کا ایک معجون مرکب ہے جسے نہ آپ عربی کہہ سکتے ہیں، نہ ہندوستانی کہہ سکتے ہیں، نہ ترکی، افغانی، ایرانی یا مغل تہذیب کا خطاب دے سکتے ہیں۔

بعینہ یہی کچھ اور بالکل اسی انداز سے اس قسم کا اختلاط و امتزاج عباسی دورِ حکومت میں بھی ہوا تھا اور اس کے ویسے ہی نتائج مرتب ہوئے تھے جیسے کہ ہندوستان میں ہوئے ہیں۔ اور جیسا کہ یہاں یہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے ماتحت نہیں ہوا بلکہ خود بخود ہی غیر محسوس طریقہ پر ہو گیا ہے۔ بعینہ اسی طرح یہ سب کچھ بلا ارادہ اور بلا مقصد غیر محسوس طور پر اُس زمانہ میں بھی ہوا تھا۔ اختلاط و امتزاج کا یہ لازمی نتیجہ ہے جس سے کسی صورت میں بھی مفر نہیں ہو سکتا۔

بلاشبہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جنہوں نے شرارت کے ارادہ سے اپنی بہت سی چیزیں اسلام اور مسلمانوں میں ٹھونسنے کی کوششیں کی ہوں گی مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی محدود ہو گی جو ناقابلِ ذکر ہیں۔ ان کی شرارت آمیز کوششیں اس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں جتنی حیثیت آٹے میں نمک کی ہوا کرتی ہے۔

پھر عباسی دورِ حکومت ہی وہ دور بھی ہے جس میں مسلمانوں کے تصنیفی سلسلہ کا آغاز ہوا ان کے علوم و فنون اسی عہد میں کتابوں کی صورت میں مدوّن ہو کر محفوظ ہوئے۔ جو کتابیں جن علوم و فنون میں اِس عہد میں لکھ دی گئیں وہ بنیادی حیثیت کی مالک قرار پا گئیں اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے انہی کتابوں کی تقلید اور خوشہ چینی لازمی قرار

پا گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے جسم پر جس تراش و خراش اور جس وضع اور انداز کا جامہ اُس عہد میں فٹ کر دیا گیا تھا وہی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا اور جو رسوم و تقلیدات جس جس انداز سے اس عہد میں اسلامی قرار دیدی گئی تھیں وہ آج تک اسلامی چلی آ رہی ہیں۔ چونکہ اِس سے پہلے دور کی کوئی ایسی تصنیف ہم تک نہیں پہنچ سکی جس سے ہم یہ تحقیق کر سکیں کہ اس میں کونسی چیزیں خالص اسلامی ہیں اور کونسی چیزیں دوسری قوموں یا دوسری ثقافتوں سے اسلام میں آ کر مل گئی ہیں اس لئے ان تمام چیزوں کو الگ الگ کرنا اور ان کے درمیان کوئی امتیازی خط کھینچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں رہا۔ مختصر یہ ہے کہ ہمارا تمام علمی سرمایہ در اصل اس اسلام کی تعبیر و تشریح تو کر دیتا ہے جو دوسری صدی ہجری میں عام طور سے مسلمانوں میں مروّج تھا مگر اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اُس اسلام کی بھی صحیح تعبیر و تشریح کر سکتا ہے جو محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے اسلام کو عطا فرمایا تھا حقائق و واقعات کی رُو سے چشم پوشی کرنا اور قانونِ فطرت سے اغماض برتنا ہے۔

"ضحی الاسلام" کی تین جلدیں ہیں اور ان تینوں جلدوں میں عباسی دورِ حکومت کی سہ صد سالہ زندگی میں اسلام پر جو کچھ گذرا ہے اُس کی تفصیلی داستان بیان کی گئی ہے۔ زیر نظر کتاب "ضحی الاسلام"

کی پہلی جلد کے جزءِ اول کا ترجمہ ہے۔ اگر حالات نے مساعدت کی اور وقت نے اجازت دی تو میری آرزو یہی ہے کہ اس سلسلہ کی بقیہ مجلدات بھی آہستہ آہستہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں۔ وما ذالك على الله بعزیز۔

مجھے امید ہے کہ جس قدر افزائی کے ساتھ آپ نے "فجر الاسلام" کے ترجمہ کا خیر مقدم فرمایا تھا۔ اس سے "ضحی الاسلام" کا یہ ترجمہ بھی محروم نہیں رہے گا۔

آخر میں یہ گذارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مجھے اپنی کوتاہیوں خامیوں اور کمزوریوں کا پورا پورا احساس ہے اور یقین مانئے مجھے آپ حضرات سے کہیں زیادہ اس کا احساس ہے اس لئے میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ ناظرین کو اگر کہیں کوئی خامی نظر آئے تو مجھے اس پر متنبہ فرما دیں تاکہ آیندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جا سکے۔ میں آپ کی اس کرمفرمائی کا بہت بہت ممنون ہوں گا۔

والسلام

عمر احمد عثمانی

نوٹ از پبلشرز

فجر الاسلام کا ترجمہ، ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے ایک جلد میں شائع ہوا تھا۔ ضحی الاسلام، جلد اوّل کافی ضخیم کتاب ہے اس لئے مناسب یہی سمجھا گیا ہے کہ اس کا ترجمہ دو حصّوں میں شائع کیا جائے۔ زیر نظر جلد، حصّہ اول پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصّہ بعد میں شائع کیا جائے گا

جیسا کہ ادارہ طلوع اسلام نے فجر الاسلام کے مقدمہ میں لکھا تھا، ان کتابوں کا صرف ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ انہیں تنقیدی نگاہ سے پرکھنا ہمارے پیش نظر نہیں۔ یہ قارئین کا کام ہے۔

فجر الاسلام کا اردو ترجمہ بھی ذیل کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔ بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

(علامہ احمد امین مصری۔ مرحوم)

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ۔

کسی قوم کی تاریخ پر تحقیقات کرنے والے کو سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا اس قوم کی عقلی نشو و ارتقا کی تاریخ، دین کی تاریخ اور بیرونی آراء و مذاہب کے اثرات کی تحقیقات میں ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مادی اور مادیانہ قسم کے مسائل میں تحقیقات کا میدان واضح اور محدود ہوتا ہے۔ جو کچھ تبدیلیاں اس سلسلہ میں پیش آتی ہیں وہ بھی ظاہر اور نمایاں ہوتی ہیں۔ لیکن جہاں تک فکر کا تعلق ہے اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ وہ کیسے پیدا ہوئی، کیسے پھلی پھولی اور کن عوامل کے ساتھ وہ وجود پذیر ہوئیں اور کن عناصر نے انھیں غذا بہم پہنچائی، کیا کیفیات اس پر طاری

ہوئیں جنہوں نے اس میں اعتدال پیدا کیا اور صاف وشفاف بنایا۔ تو یہ باتیں آپ کو تھکا دیں گی۔ ان کا پتہ لگانے میں آپ بڑی دشواریاں محسوس کریں گے۔ کیونکہ کسی فکر کا ابتدائی دور میں کوئی ایسا نمایاں پہلو نہیں ہوتا کہ اس سے استدلال کیا جا سکے۔ وہ ایسے ایسے عناصر سے ترکیب پاتی ہے جن کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ اس کی تبدیلیوں اور اعتدال بخشیوں میں ایسے ایسے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جو انتہائی مخفی اور غیر نمایاں ہوتے ہیں۔ دینی مذاہب کا باعث اکثر وہ باتیں ہوتی ہیں جو خود اس کی تعلیمات کے خلاف ہوتی ہیں۔ کبھی اس کا باعث سیاسی ہوتا ہے حالانکہ اس کا خارجی مظہر ہر سیاست سے پاک نظر آتا ہے۔ کبھی اس کا باعث دین کو خراب کرنا ہوتا ہے مگر وہ بڑے ہی دیندارانہ لباس میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی دین تو ہر حیثیت سے صالح ہوتا ہے مگر اس کے نقل کرنے والے اس کے دشمن ہوتے ہیں۔ لہذا وہ اس میں اپنی طرف سے طرح طرح کی آمیزشیں کر کے اور لغویات کو شامل کر کے اسے خراب کر دیتے ہیں۔ ایک محقق حیران وپریشان کھڑا رہ جاتا ہے۔ وہ روشنی کی ایک ایک کرن کے پیچھے لپکتا ہے کہ شاید اسے راستہ مل جائے۔ وہ راہ کے دھندلے نشانات کے پیچھے لگتا ہے کہ شاید ان کے پیچھے چل کر ہی وہ اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

مزید برآں، افکار متنوع اور آراء گوناگوں ہوتی ہیں۔ ہر عہد کے فیصلے اپنے سے پہلے عہد سے قطعاً مختلف نظر آتے ہیں۔ ایک محقق جب انھیں دیکھتا ہے تو اول وہلہ میں انھیں بالکل نیا سمجھ لیتا ہے جن کا بظاہر اپنے ماضی سے نہ کوئی ارتباط ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی تعلق۔ پھر ایک مؤرخ خود اپنی فکر سے کام لیتا ہے کہ وہ کوشش کرکے ان کے درمیان کوئی لگاؤ اور تعلق پیدا کرلے اور علت و معلول کی کوئی کڑی متعین کردے۔ یہ کام اسے اپنی فکری صلاحیتوں سے خود ہی کرنا پڑتا ہے۔

فکر کے ایک مؤرخ کو کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور وہ کن کن صعوبتوں سے کن کن نتائج تک پہنچتا ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

میں "ضحی الاسلام" میں اسی رفتار سے چلتا رہا ہوں جس رفتار سے "فجر الاسلام" میں چلتا رہا تھا۔ صدق و اخلاص میرا رہنما رہا۔ اگر میں صحیح راستہ پر چلا ہوں تو خدا کی توفیق پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور اگر میں نے غلطی کی ہے تو میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تو حق ہی کی تلاش کی تھی۔ ہر آدمی کو اس کی نیت کے مطابق پھل ملتا ہے۔

میں نے ضحی الاسلام میں عباسی عہد کی پہلی صدی (۱۳۲ - ۲۳۲ھ) کو بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یعنی واثق باللہ کی خلافت کے عہد تک۔ وہ ایک زمانہ تھا جس کا ایک خاص علمی انداز تھا۔ جبکہ سیاست اور ادب میں بھی اس کا ایک خاص رنگ تھا۔ یہ عہد ایرانی عنصر کے غلبہ میں امتیازی درجہ رکھتا تھا۔ اس عہد میں ایک حد تک حریت فکر، معتزلہ کا غلبہ و تسلط، شعر و نثر میں ادبی رنگ آمیزی پائی جاتی تھی۔ جس کی زمانے گذر جانے اور مختلف حالات کے باوجود عرصۂ دراز تک پیروی کی جاتی رہی۔ یہ عہد اس میں بھی ممتاز تھا کہ عربی زبان میں جو چیزیں اب تک یونہی بر زبان ملتی تھیں انہیں کتابوں اور دفتروں میں قلمبند کر کے مدوّن کر لیا گیا اور جو کچھ علمی سرمایہ دوسری اجنبی زبانوں میں پایا جاتا تھا اُسے عربی زبان میں منتقل کر لیا گیا تھا۔ یہ عہد ان تمام امور میں اپنے سے پہلے اور اپنے سے بعد کے زمانوں سے مختلف تھا۔ یہ عہد گویا چار طرف سے خود اپنے ہی حلقہ میں گھرا ہوا تھا اس کا الگ نام رکھا جا سکتا ہے۔ اسے الگ کر کے بڑھایا جا سکتا ہے اور نمایاں کر کے الگ دکھایا جا سکتا ہے۔ میں نے اکثر فکر کی توضیح و تشریح کرنے کے لئے پچھلے عہد سے اس کا ارتباط بتانے اور سلسلہ بلسلہ آئندہ عہود کے ساتھ اس کا رشتہ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے اس کتاب کو چار ابواب پر تقسیم کیا ہے۔

باب اول میں اس عہد کی اجتماعی زندگی بتائی گئی ہے۔ اس میں سے میں نے صرف ان باتوں کو لیا ہے جن کا علم و فن پر قوی اثر تھا۔

باب دوم میں مختلف دینی اور غیر دینی ثقافتیں بیان کی گئی ہیں۔

باب سوم میں علمی تحریکات، علمی ادارے، حریت فکر، ان تحریکات میں مختلف شہروں کے امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب چہارم میں مذاہب دینیہ، ان کی تاریخ حیات۔ ان کے مشہور رہنما، اور اہم حادثات بیان کئے گئے ہیں۔

میرا اندازہ تھا کہ اس کا حجم بھی "فجر الاسلام" کے حجم کے برابر ہی رہے گا۔ لیکن جب میں نے لکھنا شروع کیا تو موضوع پھیلتا چلا گیا اور میں اس کی تفصیلات میں گم ہو کر رہ گیا۔ ایسے ایسے مسائل سامنے آ گئے جن کا مجھے خیال بھی نہیں تھا۔ لہذا میں نے بحث و تحقیق کو اس کی رفتار پر چھوڑ دیا اور اس کے تقاضے کے مطابق لکھتا چلا گیا۔ اب جو دیکھا تو اس کتاب کا حجم "فجر الاسلام" سے دوگنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہی ہو گیا۔ لہذا مجھے مجبور ہونا پڑا کہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دوں۔ اور ہر حصہ میں دو باب رکھوں۔

آج میں قارئین کے سامنے اس کا پہلا حصہ پیش کر رہا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ وہ اس حصہ کو پڑھ کر اتنے فارغ ہوں گے میں اس عرصہ میں اس کا دوسرا حصہ پیش کر دوں گا۔

میں نے ہر موضوع پر صرف ابتدائی باتیں بیان کی ہیں۔ اور صرف طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ اگر میں ہر فصل میں تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا تو یقیناً ہر فصل کی ایک کتاب بن جاتی۔ اگر میں محققین کو اس کتاب کی تنقید، اس کی غلطیوں کی اصلاح اور اس کے مباحث کی توسیع پر آمادہ کر سکا تو میرے لئے یہی کافی ہے حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

احمد امین

۲۳ر رمضان ۱۳۵۱ھ

۱۹ر جنوری ۱۹۳۳ء

مقدمۂ کتاب

(از ڈاکٹر طٰہٰ حسین)

ایک ڈراموں کے نقاد نے ایک ڈرامہ کی تعریف کرنا چاہی جو اُسے بہت ہی پسند آیا تھا اتنا پسند کہ اُس کی پسندیدگی اس کے جملہ جو اس پر چھا گئی تھی۔ مگر ڈرامہ نگار اس کا نہایت ہی گہرا دوست تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے تعریف کی تو لوگ مجھے ملامت کریں گے اور میری تعریف کو جنبہ داری پر محمول کریں گے۔ لیکن بالآخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اُسے اپنے دوست کو بغیر کسی تردد اور لحاظ کے اپنی پسندیدگی اور تعریف سے مطلع کر دینا چاہیے اور اُس نے صاف صاف علی الاعلان کہہ دیا کہ ــــ ڈرامہ مجھے بہت ہی پسند آیا ــــ یہ بھی ایک دوستانہ خیانت ہے کہ دوستی کی وجہ سے احباب کے واجب حقوق سے انکار کیا جائے اور ان کی فضیلت کو چھپایا جائے۔ اور ایک ایسا تردد و تذبذب کا سلبی پہلو اختیار کیا جائے

کہ تعریف بھی کی جائے تو نہایت دبے ہوئے الفاظ اور دھیمے انداز کے ساتھ تاکہ لوگ اسے مبالغہ اور غلو پر محمول نہ کرلیں اور آپ پر جنبہ داری کا الزام نہ رکھدیں، اور آپ کے قارئین آپ کے انصاف اور استقلال کے متعلق کسی بدگمانی کا شکار نہ ہوجائیں۔

اس نقاد نے یہی سمجھا ــــــ اور میں بھی قطعاً یہی سمجھتا ہوں ــــــ کہ دوستوں کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کرنا نہایت ہی بھونڈی قسم کی خیانت اور بدترین قسم کا ظلم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اپنی ذات کے متعلق بے اعتمادی اور اس کے متعلق بدگمانی کا مظاہرہ کرنے میں اسراف بھی ہے۔ ایک نقاد کو اپنی رائے ــــــ جیسی کچھ بھی وہ رائے رکھتا ہے ــــــ اس خیال کے ماتحت ظاہر نہیں کرنی چاہیئے کہ لوگ اس کے بارہ میں کیا سمجھیں گے اور کیا کہیں گے۔ خود اپنے نفس اور قارئین کے لئے اس پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جو کچھ اعتقادی طور پر وہ سمجھتا ہو کہ وہ خالص حق ہے اسے ظاہر کردے لوگ خوش ہوں یا ناراض ہوں۔ قارئین کی خواہشات اس کے موافق ہوں یا مخالف ہوں۔

میں نے تنقید کرنے میں ہمیشہ اسی اصول کی پیروی کی ہے اور جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے کوشش کی ہے کہ میں دوست پر اس کی دوستی کی وجہ سے اور دشمن پر اس کی دشمنی کی وجہ سے ظلم نہ کردوں۔ ظلم یہی نہیں ہوتا

کہ آپ کسی علمی یا ادبی کام کو کم کر کے دکھائیں یا اس کی اہمیت اور قیمت کو گھٹا دیں کیونکہ وہ علمی کام کرنے والا آپ کا دوست تھا یا آپ کا دشمن تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر قبیح اور شنیع ظلم یہ بھی ہے کہ آپ ایسے آدمی کی تعریف کر دیں جو تعریف کا مستحق نہیں تھا یا تعریف کرنے میں مبالغہ آرائی کریں حالانکہ آپ کو اس کی محدود تعریف کرنی چاہیئے تھی یا آپ کسی دشمن کی اس لیئے تعریف کر دیں کہ وہ آپ کا دشمن ہے اور آپ لوگوں سے یہ نہیں سننا چاہتے کہ وہ اس کا دشمن تو بنا مگر انصاف سے کام نہیں لے سکا اور خواہ مخواہ اس پر حملے کر بیٹھا۔

میں اپنے دوست "احمد امین" کے ساتھ خیانت کرنا نہیں چاہتا کہ ان کی مسرفانہ تعریف کر دوں۔ اور نہ ہی اس قسم کی خیانت کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی اور ان کے کام کی اہمیت گھٹا دوں۔ میں ان کی دوستی کو بھول جانا اور ایک طرف رکھ دینا چاہتا ہوں ـــــ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی۔ جو محبت میرے اور ان کے مابین ہے وہ پاک وصاف اور برادرانہ ہے۔ اسے ہم اغراض ومقاصد کی رنگ آمیزیوں سے بلند رکھ سکتے ہیں۔ میں یہاں ان سے انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے ضحی الاسلام پر غور و فکر کیا۔ اس کی ایک ایک بات کو تولا۔ اور پوری کوشش کی کہ مجھے اس کتاب میں کوئی ایسا بڑا عیب مل جائے

جو میں قارئین کے سامنے پیش کر سکوں مگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھے نہ کوئی چھوٹی بات مل سکی نہ بڑی۔

یہ میرا قصور تو نہیں ہے کہ "احمد امین" نے محنت، صداقت اور امانت کے ساتھ کام کیا مشقت اور تکلیف برداشت کی۔ خاص رجحانات سے یکسو ہو کر اور ان خواہشات سے الگ رہ کر جو لوگوں کے ساتھ عموماً کھیلا کرتی ہیں آپ کے سامنے اپنی تحقیقات کا نچوڑ پیش کر دیا اور اس سلسلہ میں انہیں خدا کی طرف سے وہ توفیق عطا ہو گئی جو اس زندگی میں کسی عالم کو نصیب ہو سکتی ہے۔

ہاں، یہ بھی تو میرا قصور نہیں ہے کہ "احمد امین" نے داد تحقیق دی اور خوب دی۔ انھوں نے پڑھا اور بہت اچھی طرح پڑھا۔ انہوں نے سمجھا اور خوب سمجھا انہوں نے استنباط کیا اور صحیح استنباط کیا۔ نہ یہ میرا قصور ہے نہ وہ ہے۔ یہ بھی میرا قصور نہیں ہے کہ ان سب باتوں کے بعد "احمد امین" نے عربی لٹریچر کے اسباق میں ایک نیا دروازہ کھول دیا جس کے سامنے بڑے بڑے علماء اور ادیب —— عہد جدید کے پورے عرصہ میں —— دم سادھے کھڑے رہے۔ وہ اس کے قریب جاتے اور پھر پلٹ جاتے۔ دروازہ کھٹکھٹاتے مگر نہ کھلتا اور "احمد امین" کو یہ توفیق نصیب ہو گئی کہ انہوں نے اس دروازہ کو چوپٹ کھول دیا۔

نہیں کرتا۔[۱] اصمعی کا قول ہے کہ چچازاد بہنیں زیادہ صابر ہوتی ہیں مگر اجنبی عورتیں زیادہ شریف ہوتی ہیں۔ اور عجمی عورتوں کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں سے زیادہ، بہادروں کی کھوپڑیاں کوئی نہیں اُڑا سکتا۔" کسی شخص سے رومی عورت کے بیٹے کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ ایسا لڑکا چھچھورا، خود پسند اور بخیل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس سے صقلبی عورت کے لڑکے کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ بہت گندا اور بہت کمینہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس نے سیاہ رو عورت کے بچوں کے متعلق سوال کیا تو اس نے بتایا کہ ایسے بچے بہادر اور سخی ہوتے ہیں۔ پھر اس نے گندم گوں عورتوں کے بچوں کے متعلق سوال کیا تو اس نے بتایا کہ ایسے بچے زیادہ ہونہار، نرم جسم اور خوش دہن ہوتے ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ عربی عورتوں کے بچے کیسے ہوتے ہیں تو اُس نے بتایا کہ کج خلق اور حاسد ہوتے ہیں۔[۲] جاحظ کہتے ہیں کہ "ہم نے خِلاسی لوگوں کو دیکھا۔ ــــ خِلاسی وہ بچے کہلاتے ہیں جو گورے اور حبشی کے میل سے پیدا ہوں ــــ عادۃً اس ملاپ سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے والدین سے زیادہ قد آور اور زیادہ قوی اور مضبوط ہوتے ہیں۔ نیز ہم نے یَسْرِی لوگوں کو دیکھا ــــ یَسْرِی وہ بچے کہلاتے ہیں جو گوروں اور ہندوستانیوں کے میل سے پیدا ہوں۔

۱؎ طیفور صفحہ ۱۴۳ ۲؎ محاضرات الادباء صفحہ ۲۰۷ ج ۱

——— اس قسم کے بچوں میں نہ ماں باپ جیسا قد رہتا ہے نہ قوت ہوتی ہے البتہ اپنے والدین سے زیادہ حسین اور ملیح ہوتے ہیں[1]۔ جاحظ ہی ایک دوسرے مقام پر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہ یہودیوں کے مقابلہ میں نصرانی لوگ صورت و شکل اور عقل و شعور میں زیادہ ممتاز کیوں ہوتے ہیں، لکھتا ہے کہ ایک اسرائیلی اسرائیلی لڑکی ہی سے شادی کرتا ہے۔ ان کے ہاں اجنبی عورتوں کا میل نہیں ہوتا۔ اور مختلف اجناس کے بہتر اثرات ان میں اپنا کام نہیں کرتے[2]۔

آپ کا جی چاہے تو کتاب الاغانی کو دیکھ جائیے آپ یہ چیز دیکھیں گے کہ حجاز میں اور اس کے بعد عباسی دور حکومت کی ابتدا میں جو ماہر فن گانے والی عورتیں ملتی ہیں وہ مدینہ منورہ کی وہی عورتیں ہیں جو ملی جلی نسل سے پیدا ہوئی تھیں، پھر ان کی شاگرد ہیں ——— مدینہ منورہ کی اس قسم کی عورتیں وہ ہیں جن کے باپ عربی تھے اور مائیں غیر عربی تھیں ——— اگر جی چاہے تو اس عہد کے علماء اور ادباء کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے اور تحقیق کیجیے کہ ان کے باپ کس جنس سے تعلق رکھتے تھے اور مائیں کس جنس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں زیادہ تر ملی جلی نسل کے لوگ ہی ملیں گے۔ خراسان کی ملی جلی نسل اور عجمی باندیوں کی اولاد کی عام شجاعت اور بہادری کی شہرت کا حال تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ پرانے زمانے میں

---

[1] کتاب الحیوان صفحہ ۴۶ ج ۱ [2] رسائل جاحظ بر حاشیۂ کامل صفحہ ۱۶۹-۱۷۰ ج ۲

یمن کے اندر بھی ایک خاص نسل پیدا ہو چکی تھی جسے اہل عرب "الابناء" کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں کسریٰ نے سیف بن ذی یزن کے ساتھ بھیجا تھا جب وہ حبشہ کے خلاف اس سے مدد مانگنے آیا تھا۔ ان لوگوں نے سیف بن یزن کی مدد کی اور بالآخر یمن کے مالک ہو گئے۔ انھوں نے ملک کا انتظام وانصرام کیا اور عربوں ہی میں شادیاں کرلیں۔ ان سے جو بچے پیدا ہوئے ان کو "اَبْنَاءْ" کہتے تھے۔ ان پر یہ نام اس لئے بولا جاتا تھا کہ ان کی مائیں ان کے باپوں کی جنس سے تعلق نہیں رکھتی تھیں[1]۔ ان ابنار میں سے جو مشہور علماء گذرے ہیں ان میں سے طاؤس بن کیسان اور وہب بن منبہ ہیں جو دونوں تابعی ہیں۔ ان ابنار کے باپ ایرانی تھے اور مائیں یمن کی عربی تھیں۔ لیکن عباسی مصر میں جو بچے پیدا ہوئے ان کے زیادہ تر باپ عربی تھے اور مائیں عجمی تھیں۔
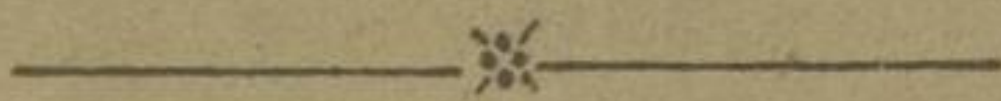
تولید عقلی جیسا کہ جسمانی طور پر عالم اسلام میں "تولید" کا یہ عمل اپنا کام کر رہا تھا اسی طرح عقلی طور پر بھی یہ اپنے اثرات مرتب کرتا جا رہا تھا۔ مختلف اقوام سے متعلق لوگوں کی عقلیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل جل رہی تھیں۔ ایک ایرانی، ایرانی عقل لے کر آتا اور اسلام کو قبول کر لیتا، عربی زبان کو سیکھتا۔ ان

---

[1] لسان العرب مادہ "ابن"

دونوں عقلیتوں کے اختلاط سے ایک نئی چیز پیدا ہوتی تھی جس سے نئے نئے افکار نئے نئے معانی جنم لیتے تھے۔ یونانی، نصرانی، رومی نصرانی، عراقی یہودی، عربی مسلمان سے ملتا جلتا اور اس طرح آراء کا، کہانیوں کا، فکر و نظر کا تبادلہ عمل میں آتا اور اس طرح ایک نئی فکر جنم لے لیتی تھی ــــــ یہی وجہ ہے کہ "عربی لٹریچر" اپنے وسیع معنی میں وہ لٹریچر بن گیا تھا جس میں ہر تہذیب و ثقافت کا حصہ تھا۔ وہ درحقیقت عربی لٹریچر نہیں رہا تھا بلکہ وہ ایک مخلوط لٹریچر تھا جس پر محض عربی اسلامی کی چھاپ لگی ہوئی تھی اور اس وجہ سے اسے عربی لٹریچر کہہ دیا جاتا تھا۔ ہم اس کی ایک مثال دیتے ہیں جس سے اس کی توضیح ہو جائے گی۔ ہم عربوں کو زمانۂ جاہلیت میں دیکھ چکے ہیں۔ ان کا لٹریچر صحیح معنوں میں عربی لٹریچر تھا۔ اگرچہ اس نے بھی اپنے اردگرد سے کچھ نہ کچھ ضرور لیا تھا لیکن یہ لینا ایسا ہی تھا جیسے آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ لیکن غالب اور قوی روح عربی روح ہی تھی۔ وہ عربی زندگی کی بہترین تمثیل پیش کرتا تھا۔ وہ ان کی حیاتِ اجتماعی کی مکمل تر صورت میں تصویر کشی کرتا تھا۔ اس میں ان کے خیالات تھے۔ ان کے شکار کے طریقے تھے۔ ان کی جنگوں کے اوصاف تھے۔ ان کا کھیل کود تھا۔ ان کے حقیقت پسندانہ رجحانات تھے ان کی خانہ بدوشی تھی۔ لیکن جونہی ہم عباسی عصر میں زقند لگاتے ہیں تو نقشہ ہی دوسرا نظر آتا ہے۔ لوگ خصوصیت کے ساتھ وہ ایرانی لوگ جو اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور جن کا کاروبار حکومت پر خاصا غلبہ و تسلط تھا اپنے ایرانی

ذوق کے ساتھ عرب کے جاہلی اشعار میں ان کو کچھ مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ اُنھیں اسی قسم کے اشعار گانے میں مزہ آتا تھا جن سے وہ مانوس چلے آرہے تھے کہ اشعار میں عشق و محبت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ خمریات کا نشہ ہو۔ چنانچہ عباس بن احمد (جو خاندانی طور پر خراسانی ہے) اور ابو نواس (جس کی ماں ایرانی ہے) ہی ان کے ذوق کی سیرابی کر سکتے تھے۔ عباس بن احمد عشقیہ مضامین میں اور ابو نواس خمریات میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ عرب کے جاہلی اشعار میں بھی عشق و محبت کا ذکر ہوتا تھا۔ ان کے ہاں بھی خمریات ہوتی تھیں۔ لیکن طرفہ کی خمریات اور ابو نواس کی خمریات میں کتنا بڑا فرق تھا۔ امرؤ القیس کے عشق میں اور عباس کے عشق میں کتنا بعد المشرقین تھا۔ مجھے اس سلسلہ میں جاحظ کا یہ قول بہت پسند آیا کہ امرؤ القیس کے اس شعر

تَقُوْلُ وَ قَدْ مَالَ الْغَبِیْطُ بِنَا مَعًا

وہ باتیں کر رہی تھی کہ یکایک اونٹ کی کاٹھی ہم دونوں کو ایک ساتھ لے کر ایک طرف کو جھک گئی۔

اور علی بن الجہم کے ان اشعار میں کس قدر تفاوت ہے ؎

سَقَی اللّٰهُ لَیْلًا ضَمَّنَا بَعْدَ هَجْعَةٍ

وَ اَدْنیٰ فُؤَادًا مِنْ فُؤَادٍ مُعَذَّبٍ

فَبِتْنَا جَمِیْعًا لَوْ تُرَاقُ زُجَاجَةٌ

مِنَ الْوَاحِ، فِيمَا بَيْنَنَا لَمْ تَسْرَبِ

(خدا اس رات کو ہمیشہ سیراب رکھے جس نے کچھ وقفہ کے بعد ہمیں اکٹھا

کردیا اور ایک دل کو دوسرے اذیت رسیدہ دل سے قریب تر

کر دیا۔ ہم دونوں نے اس طرح اکھٹے رات گذاری کہ اگر شراب

کی بوتل ہمارے درمیان میں گرا دی جاتی تو اس کا ایک قطرہ

نیچے تک نہ پہنچ سکتا۔

تنہا مدنیت اور حضارت ہی نہیں تھی جو اس فرق و امتیاز کا موجب تھی بلکہ اس کا بڑا سبب مختلف جنسوں کا ملاپ اور متفرق فکروں کا اختلاط تھا جیسا کہ اشعار میں تھا۔ ایرانیوں نے عربی وزن، عربی قافیہ اور عربی اسلوب کو لے لیا اور اس کے پہلو بہ پہلو انھوں نے ایرانی خیالات اور ایرانی ذوق کو بھی جگہ دی۔ ذرا اس قصیدے کو ملاحظہ فرمایئے جو خریمی نے کہا ہے۔ وہ بغداد کا تذکرہ کرتے ہوئے ان فتنوں کا بیان کرتا ہے جو پے در پے بغداد کو، امین اور مامون کی جنگ کے دوران میں ——— پیش آئے۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے

قَالُوْا وَلِمْ يَلْعَبِ الزَّمَانُ بِبَغْدَادَ وَ تَعْثُرُبِہٖ عَوَاثِرُھَا

لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بغداد کے ساتھ کیوں کھیلتا رہتا ہے اور

زمانہ کے حوادث اس پر کیوں گزرتے ہی رہتے ہیں۔

آپ ایسا محسوس کریں گے کہ شاعر ایک ڈرامائی طویل مگر مطمئن کن نظم پیش کر رہا

ہے، جس سے عربوں کو اب سے پہلے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ ذرا ایک نظر ہندی، ایرانی عربی حکمتوں پر بھی ڈالتے جائیے ـــــ جو ابن المقفع کے اقوال کلیلہ ودمنہ میں ملتے ہیں۔ پھر ان مختلف الانواع مقامات پر بھی تدبر کیجئے جو بدیع ہمدانی اور حریری کے عمل تفکیر کا نتیجہ ہیں۔ یہ ساری چیزیں ایسی انواع ہیں جو خالص عربوں کے خیال اور تصور میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ یہ تمام چیزیں یقیناً ـــــ شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے ـــــ اسی تولید کے اثرات اور نتیجہ تھے جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ اگر عرب تنہا رہتے، یا اگر ایرانی تنہا زندگی بسر کرتے تو یقیناً یہ چیزیں منصۂ شہود پر نہ آسکتیں۔ یہی کچھ ان انواع واقسام کے علوم ومعارف کے متعلق کہا جا سکتا ہے جن کو ہم آئندہ فصلوں میں وضاحت سے بیان کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عقلوں کے اس امتزاج واختلاط نے ایسی نئی نئی مخلوقات کو جو مخصوص امتیازات کی مالک تھیں بالکل اسی طرح جنم دیا جیسا کہ اجسام کی تخلیق میں نئے نئے اجسام کو جنم دیا تھا۔

⁂

مختلف عناصر میں ہم آہنگی ویک رنگی

اس کے بعد یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ ان متنوع اختلافات کے باوجود ـــــ جو ہم وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں ـــــ وہاں

ایک ایسی روح کارفرما تھی جو پورے عالم اسلامی پر سایہ فگن تھی۔ یہ مشرقیت کی روح تھی ــــ جو باوجود اجناس وانواع کے گوناگوں اختلافات کے ــــ سب میں یکساں طور پر موجود تھی۔ وہی روح جس نے یونانی شہروں میں داخل ہونے کے بعد یونانی فلسفہ کو بھی اپنے تابع فرمان بنا لیا اور اسے روحانیت اور الہامات کا لباس پہنا کر چھوڑا۔ یہی وہ روح ہے جس کا اعتراف تمام اجتماعیات اور تاریخ کے علماء نے کیا ہے اور بتایا ہے کہ مشرقی ممالک کے درمیان یہ ان مشترک خصوصیات میں سے ہے جو مغربی میلانات کے قطعاً مخالف ہے یہ وہ روح ہے جو مشرق نے قرنہا قرن سے بطور وراثت کے حاصل کی ہے۔ جس کی تکوین و تخلیق میں ان کے اندرونی طبعی اور اجتماعی احوال و ظروف نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس روح نے ان کے ذوق کو کچھ ایسا بنا دیا ہے کہ ایک مغرب کا رہنے والا ان کے ذوق کو محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اس روح کے ماتحت چیزوں کا ادراک اس طریقہ سے نہیں کرتے جس طریقہ سے مغربی اقوام کرتی ہیں۔ اس روح نے ان کی مدنیتوں کو ــــ مختلف جہات سے ــــ مغربی مدنیتوں کے برعکس پروان چڑھایا ہے۔ بدھ ازم، یہودیت، نصرانیت وغیرہ مختلف دین آئے۔ اس روح نے ان کو ایک خاص رنگ میں رنگا۔ یہ رنگ بہر حال مادی نہیں تھا۔ یہ سارے ادیان اس جہان سے اوپر ایک الٰہ پر ایمان رکھتے تھے۔ جنت کے امیدوار اور جہنم سے خائف تھے۔ سب کا یہ

خیال تھا کہ اس دنیوی سعادت اور جسمانی خواہشات کے بعد ایک دوسری روحانی سعادت بھی ہے۔ جب اسلام آیا اور اس نے مشرقی ممالک پر اپنا غلبہ و تسلط پھیلایا تو اس نے اس روح میں اضافہ ہی کیا اور اسے تقویت ہی پہنچائی۔ ان سب کو ایک کر دینے میں اس نے اپنا پارٹ ادا کیا۔ یہ ساری مختلف قومیں ایک قانون کی مطیع اور حکومت میں ایک نظام کی تابع فرمان تھیں۔ ایک زبان بولتی تھیں اور اکثر حالات میں ایک دین کے ماتحت زندگی گذارتی تھیں۔ باوجود نقل و حمل کی صعوبتوں کے علماء کے سفرنامے دور و دراز انتہائی زوروں پر تھے۔ یہ اعتقادات اور آراء میں ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ دینی اور سیاسی دعوتیں دیتے تھے۔ مرکز خلافت سے اطراف و اکناف میں ایسے حکام بھیجے جاتے تھے جو مختلف تعلیمات سے اور مسلح اور آراستہ ہوتے تھے۔ مگر یہ تعلیمات باوجود اختلافات کے اپنے جوہر میں ایک ہوتی تھیں۔

ان تمام چیزوں نے مل کر مختلف قوموں میں ایک قسم کی وحدت پیدا کر دی تھی اور ان سب کے مجموعہ سے ایک ایسی قوم بنا دی تھی جسے "امت واحدہ" کہا جا سکتا تھا۔ اس کا لٹریچر اب ایک تھا ان کی تہذیب ایک تھی اور ان کا علم مشترک تھا۔

فصل دوم

عربوں اور موالی کے درمیان مقابلہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے اندر اس کا کوئی قومی شعور موجود نہیں تھا کہ وہ کوئی امت ہیں۔ بلکہ ان

عرب جاہلیت میں قبائلی شعور کا غلبہ

میں قومی شعور اپنے قبیلہ سے متعلق ہوتا تھا۔ وہ جاہلی اشعار جن کی صحت ہمارے نزدیک قابل ترجیح ہو، قبائلی شعور سے پُر ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک عربی اپنے قبیلہ کی تعریف کرتا ہے، اس کی فتح و نصرت کے گُن گاتا ہے، اُس کی خوبیاں گناتا ہے اور اپنے قبیلہ کی وجہ سے دوسرے قبیلہ کی ہجو کرتا ہے۔ ایسا بہت ہی کم ملتا ہے کہ کوئی عربی اس کے گن گاتا ہو کہ میں عربی ہوں اور وہ غیر عربی اقوام پر فخر کرتا ہو۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یعنی عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں صحیح معنی میں

ایک امت یا ایک قوم نہیں تھے۔ وہ زبان اور دین کے اعتبار سے بھی کوئی ایک وحدت نہیں تھے۔ ان کی وطنی آرزوئیں یکساں نہیں تھیں۔ نہ ان میں وہ چیز پائی جاتی تھی جو کسی قوم کے لئے ابتدائی شرط ہوتی ہے۔ یعنی کوئی ایک شخصیت یا کوئی ایک ہیئت حاکمہ جو ایک کے بجائے متعدد افراد پر مشتمل ہو اسے اپنے احکام کو تمام افراد پر نافذ کرنے کی طاقت ہو، اور وہ انھیں اپنی اطاعت پر ابھار سکے۔ قبائلی معیشت کی طبیعت جس کے مطابق عرب اپنی زندگی گذار رہے تھے اس صورت حال کو گوارہ ہی نہیں کرتی تھی۔

اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ وہاں کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جو عربوں کو اس طرز فکر کی طرف متوجہ اور راغب کر سکے۔ کیونکہ جب وہ اس نظر سے غور کرتے تھے تو ان میں اپنے متعلق کسی عظمت اور فخر کا شعور پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک جہت سے ان کے گرد ایرانی تھے اور دوسری طرف سے رومی تھے۔ ان کے ساتھ عربوں کا تعلق کچھ اس قسم کا تعلق نہیں تھا جس سے اپنی قوت کا شعور پیدا ہو۔ وہ ان کے ساتھ تجارتی معاملات کرتے تھے۔ مگر یہ تعلق اس قسم کا نہیں تھا جو ایک برابر کے آدمی کا برابر کے آدمی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ یہ تعلق تو ایک مالدار کے ساتھ ایک فقیر کا سا تعلق یا ایک قوی قوم کے ساتھ ایک کمزور قوم کا سا تعلق تھا۔ ان میں سے جو تاجر ایران اور روم کی طرف منتقل ہو گئے تھے اور انھوں نے ان کی عظمت شان کا مشاہدہ کیا تھا وہ

ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بہت ہی کمزور محسوس کرتے تھے ۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ قصّے کہانیاں ایسی ملتی ہیں جو ہمارے اس دعوے کے خلاف جاتی ہیں۔ مثلاً قطامی نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ عربوں کا ایک وفد کسریٰ کے پاس گیا[1]۔ ایسے ہی نعمان بن المنذر کا عربوں پر فخر کرنا اور ان کو تمام قوموں سے افضل شمار کرنا جس میں وہ نہ ایران کا استثنار کرتا ہے نہ کسی دوسری قوم کا۔ اور یہ بات بھی کہ اگر کوئی قوم عربوں کے مقابلہ میں رکھی جائے تو عرب اپنی عزت، شجاعت، خوبصورتی، جنگی اہلیت، سخاوت، زبان کی صفائی اور محکمی، عقلی شدت، فخر، اور وفار وغیرہ میں اس دوسری قوم سے کہیں بہتر نکلے گی الخ لیکن ہمیں اس واقعہ کی صداقت میں کافی شبہ ہے۔ یہ واقعہ سوائے کلبی کے کسی اور مورخ نے بیان نہیں کیا اور کلبی مشہور وضاع ہے۔ پھر اس واقعہ کو اس قدر اہم ہونے کے باوجود اموی عصر میں کسی نے بھی بیان نہیں کیا۔

عباسی عہد میں یہ واقعہ صرف کلبی سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس واقعہ کے طرز بیان اور طرز ادا میں جو فنی کاریگری ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بات بناوٹی ہے ۔۔۔ بلکہ ہمارے پاس ایسی صحیح روایات موجود ہیں جو اس کے خلاف جاتی ہیں۔ دیکھیئے قتادہؓ فرماتے ہیں جو مشہور تابعین میں سے ہیں۔

---

[1] اس کا حال العقد الفرید صفحہ ۱۲۴ ج ۱ میں ملے گا۔

ساتھ ہی خالص عربی النسل قبیلہ سدوس کے ایک فرد ہیں۔ وہ "کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ قبیلہ لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل تھا۔ ان کی زندگی سب سے بدتر تھی۔ گمراہی میں سب سے آگے، ننگی کھالیں، بھوکے پیٹ۔ دو شیروں۔ ایران اور روم — کے درمیان ایک چٹان کے کنارہ پر بیٹھے ہوئے۔ بخدا ان کے ملک میں ان دنوں کوئی بھی تو ایسی چیز نہیں تھی جس پر کوئی ان پر حسد یا رشک کر سکے۔ ان میں جو زندہ رہتا وہ شوریدہ بختی کے ساتھ زندگی بسر کرتا۔ اور جو مر جاتا وہ سیدھا جہنم کا راستہ لیتا۔ انھیں دوسرے کھلاتے تھے وہ خود نہیں کھاتے تھے۔ بخدا ہمیں معلوم نہیں کہ ان دنوں تمام روئے زمین پر کوئی قبیلہ بھی ایسا تھا جو نصیبہ میں ان سے زیادہ کھوٹا اور شان و مرتبہ میں ان سے ذلیل تر ہو۔ حتیٰ کہ اللہ عزوجل نے اسلام کو بھیجا اور کتاب الٰہی کو ان کا وارث بنا دیا اور جہاد کرنے کے لئے دوسرے ممالک کو ان کے لئے حلال کر دیا۔ ان کے لئے رزق میں وسعت اور فراخی کر دی اور ان کو لوگوں کی گردنوں پر بادشاہ بنا دیا۔[1]

عربوں کا جب ایک قبیلہ یوم ذی قار میں ایرانی فوج کی ایک جمعیت پر فتحمند ہو گیا تو انھوں نے اسے اپنے لئے بہت بڑے فخر کی بات سمجھی۔ حالانکہ یہ کوئی

---

[1] تفسیر طبری صفحہ ۲۵ ج ۴

اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ کسی قوم کی کونسی جمعیت کبھی نہ کبھی شکست نہیں کھاتی لیکن عربوں نے اپنی فتح سندی پر بڑا فخر محسوس کیا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ انھیں یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ایرانی حملہ کو پسپا کر سکیں گے۔ بلکہ خود اس قصدہی میں ہمارے اس دعوے کی ایک دلیل موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب ذی قار کی اس جنگ میں عرب فتحمند ہو گئے تو انھوں نے ایرانیوں کے خلاف عربوں کی فتح کے گیت نہیں گائے بلکہ ان قبائل کی فتحمندی کے گیت گائے جو اس جنگ میں شریک تھے۔ یہ شیبانی، عجلی اور یشکری قبائل تھے۔ اس وقت بھی ان کے گیتوں میں عام عربیت کی روح جلوہ گر نہیں ہوئی۔

طبری نے ہمیں بتایا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ایران کی فتح کا ارادہ کیا تو عرب کے لوگ ایرانیوں سے خوفزدہ تھے۔ انھیں تعجب ہوتا تھا کہ وہ ایرانیوں سے کس طرح جنگ کر سکیں گے۔ طبری کا بیان ہے کہ عربوں کے نزدیک ایرانیوں کے چہرے نہایت ہی مکروہ اور خوفناک معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ سلطنت ایران کی شوکت عزت اور دیگر اقوام پر ان کے غلبہ کی داستانیں کافی مشہور تھیں۔ آخر مثنیٰ بن حارث کھڑے ہوئے اور انھوں نے فرمایا۔ لوگو! یہ چہرے تم پر بہت گراں نہ ہو جائیں کیونکہ ہم ایران کے سرسبز علاقوں میں گھس چکے ہیں اور سواد عراق کے بہترین نصف حصہ پر قابض ہو چکے ہیں۔ ہم نے ان سے مقابلے کئے ہیں اور انھیں کافی زخم پہنچائے ہیں۔ جو لوگ ہم سے پہلے گذر چکے ہیں وہ بھی ان سے ٹکر لینے کی

جرأت کر چکے ہیں اور خدا نے چاہا تو آیندہ بھی ایسا ہی ہو گا۔[1]

ان باتوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب اپنے قبائل پر عزت و فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ قابل تعریف بات جس پر وہ فخر کر سکیں وہی ہو سکتی تھی جسے ان کے قبیلے کے کسی فرد نے سرانجام دیا ہو۔ جب حاجب بن زرارہ نے کسریٰ کے پاس اپنی کمان رہن رکھی اور اس کے بیٹے نے رہن کی رقم ادا کر دی تو یہ ایسی بات تھی جس پر قبیلۂ تمیم فخر کیا کرتا تھا۔[2] کسی شاعر یا کسی بہادر پر اس کا قبیلہ ہی فخر کیا کرتا تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری قوم کی کسی خوبی کو خوبی شمار کرتے ہوں۔

اسلام آیا تو سارے عرب ایک امت بن گئے۔ اب ان میں امت واحدہ بننے کی وہ تمام خصوصیات ___ اتحاد زبان، اتحاد دین، اتحاد میلانات اور ان کے سروں پر ایک منظم حکومت کا وجود ___ بھی موجود تھیں۔ اس کے بعد اپنے زمانے کی دو عظیم المرتبت اور عظیم الشان قوموں۔

اسلام نے عربوں میں قومی شعور بیدار کیا

ایران اور روم ___ پر ان کو فتح بھی حاصل ہو گئی تھی۔[3] چنانچہ دونوں عصبیتیں

---

[1] تاریخ طبری ص۱۱۶ ج ۴ [2] ایضاً [3] لیکن دست پروردگانِ رسالتؐ میں یہ عصبیت باقی نہیں رہی تھی۔

ایک ساتھ پائی جاتی تھیں (عربی آدمی کی عصبیت اپنے قبیلہ، اپنے خاندان اور پھر اپنے کنبہ کے لیے) اور (عربی خون کی عصبیت، عربی اُمت کی عصبیت اور جنس عربی کی عصبیت) اسلام کے ابتدائی دور میں یہ دونوں عصبیتیں پہلو بہ پہلو چلتی رہیں۔

زمانۂ اسلام میں بھی ہم ایک عربی کو اپنے قبیلہ پر ایسا ہی فخر کرتا ہوا پاتے ہیں جیسا کہ وہ زمانۂ جاہلیت میں فخر کیا کرتے تھے۔ زمانۂ اسلام میں جنس عربی پر دوسرے فخر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

انا من النفر الذین جیادھم

طلعت علیٰ عاد بریح صرصر

وسلبن تاج ملک قیصر بالقنا

واجتزن باب الدرب من اصفر (۱۹)

ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے گھوڑے آندھی کی ہوا کے ساتھ

قوم عاد پر نکل پڑے تھے اور جنہوں نے سلطنت قیصر کے تاج کو

نیزوں کی ضرب سے چھین لیا اور رومیوں کے راستہ سے باب

الدرب کو کاٹ ڈالا

پہلی قسم یعنی قبائلی عصبیت ـــــ تو بنو امیہ کے عہد کے تاریخی حوادث اور ان کے دور کے قصائد سب کے سب اس عصبیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ جو ان قصائد

قبائلی عصبیت

ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کی کچھ مثالیں پیش کردیں۔ قبیلہ اسد بن خزیمہ کا کوئی آدمی یحییٰ ابن حیان کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

أَرَى جَعَلَ اللّٰهُ الْيَمَانِيْنَ كُلَّهُمْ
فِدًى لِفَتَى الْفِتْيَانِ يَحْيَى بْنِ حَيَّانٍ
وَلَوْلَا عُرَيْقٌ فِيَّ مِنْ عَصَبِيَّةٍ
لَقُلْتُ وَأَلْفًا مِنْ مَعَدِّ بْنِ عَدْنَانٍ
وَلٰكِنَّ نَفْسِيْ لَمْ تَطِبْ لِبَشِيْرَتِيْ
وَطَابَ لَهٗ نَفْسِيْ بِأَبْنَاءِ قَحْطَانٍ

دیکھو خدا سارے کے سارے یمنی لوگوں کو نوجوانوں کے نوجوان یحییٰ بن حیان پر قربان کر ڈالے اگر میرے اندر عصبیت کی چھوٹی سی ایک رگ نہ ہوتی تو میں یہ بھی کہتا کہ معد بن عدنان کے قبیلہ کے ایک ہزار آدمی بھی اس پر قربان کردے۔ لیکن میرا دل اپنے قبیلہ کے متعلق ایسی بات کہتے ہوئے خوشی محسوس نہیں کرتا البتہ اولاد قحطان کے متعلق ایسا کہتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہے۔

ہیرو نے قبیلہ ازد کے ایک بوڑھے سے نقل کیا ہے جو قابل اعتماد شخص ہے۔ وہ بوڑھا اپنے خاندان کے کسی آدمی کے متعلق نقل کرتا ہے

کہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا اور برابر اپنے باپ کے لئے دعائیں مانگتا جا رہا تھا۔ کسی نے اس سے کہا کہ "تم اپنی ماں کے لئے کوئی دعا کیوں نہیں مانگتے"؟ تو اس نے جواب دیا "اس لئے کہ وہ ہمارے قبیلہ کی نہیں تھی بلکہ قبیلۂ تمیم کی تھی"۔[1]

دعبل شاعر یمن پر فخر کرتا اور یمینوں کے فضائل و مناقب گنتا ہے اور کمیت کا جواب دیتا ہے کیونکہ وہ قبیلۂ نزار پر اپنے ایک قصیدہ میں جس کے اشعار چھ سو تک پہنچتے تھے فخر کر چکا تھا۔ اس قصیدہ کا پہلا شعر یہ ہے

اَفِیْقِیْ مِنْ مَلَامِكِ یَا ظَعِیْنَا
کَفَا فِی اللَّوْمِ مَرُّ الْاَرْبَعِیْنَا

اے ہودج نشین! اپنی ملامت کو بند کر دے۔ مجھے چالیس سال کا گذر جانا ہی ملامت کے لئے کافی ہے۔

مسعودی نے دونوں قصیدوں کا کچھ حصہ نقل کیا ہے[2] اور ان کو نقل کرنے کے بعد اس نے کہا ہے کہ کمیت کے اس قصیدہ نے نزاریہ اور یمانیہ میں مخالفت کی آگ بھڑکا دی۔ نزار نے یمن پر فخر کیا۔ اور یمن نے نزار پر فخر کیا۔ اور ہر فریق نے اپنے اپنے مناقب گنوا لئے۔ لوگ دو جماعتوں میں بٹ گئے۔ اور عصبیت کا

---

[1] الکامل صفحہ ۱۹۰ ج ۱ [2] صفحہ ۱۵۵ ج ۲

فتنہ دیہات اور شہروں تک پھیل گیا۔ مروان بن محمد جعدی کا حادثہ اس کے ماتحت ظہور پذیر ہوا کہ اس میں یمن کے خلاف اپنی قوم نزار کے لئے تعصب پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں یمن کے لوگ اس سے منحرف ہو گئے۔ اور دعوتِ عباسیہ کے مددگار و معین بن گئے۔

عرب کے اکثر گورنروں میں معاملاتِ حکومت میں بھی یہی عصبیتِ سیئہ کارفرما نظر آتی تھی۔ کہ ہر گورنر کا قبیلہ اسے گھیرے رہتا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ جب کوئی آدمی کہیں کا گورنر بن جاتا تھا تو گویا اس کا پورا قبیلہ ہی گورنر بن گیا ہے۔ چنانچہ جب ابن ہبیرہ کو عراق کا گورنر بنایا گیا تو فزارہ کو یہ خیال ہو گیا کہ گویا اسے حکومت مل گئی ہے۔ لیکن جب اسے معزول کر کے خالد بن عبد اللہ القسری کو گورنر بنایا گیا تو قبیلۂ قسر کی گردنیں تن گئیں اور فزارہ ذلیل ہو گئے۔ چنانچہ فرزدق کہتا ہے ؎

لَعَمْرِیْ لَئِنْ نَابَتْ فَزَارَۃَ نَوْبَۃٌ

لَمِنْ حَدَثِ الْاَیَّامِ تَحْسِبُھَا قَسْرُ

(میری جان کی قسم اگر فزارہ کی ایک اور باری آ گئی تو قبیلۂ قسر اسے زمانہ کے حادثات میں سے ہی ایک حادثہ تصور کرے گا۔

عباسی عہد حکومت میں جب معن بن زائدہ شیبانی یمن کا گورنر بنا تو اس نے یمن کے بہت سے لوگوں کو اپنی قوم ربیعہ وغیرہ (جو بنو نزار میں سے

تھے) کے تعصب کی وجہ سے قتل کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد عقبہ بن سالم۔ عمان اور بحرین کا والی ـــــ اپنی قوم (جو قحطان میں سے تھی) کے تعصب کی وجہ سے تیبیون کو قتل کر ڈالتا تھا۔ محض اس مکر کا جواب دینے کے لیئے جو معن نے یمن میں کیا تھا[1]

اس کی مثالیں تو بے شمار ہیں۔ لیکن یہاں ہمارے موضوع کے مطابق جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ دوسرا رجحان ہے۔ یعنی عربوں کا تعصب موالی کے خلاف۔

موالی کے خلاف عربوں کا تعصّب

عربوں نے اسلام قبول کیا اور خدائے تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (یقیناً خدا کے نزدیک ایک مکمل دین صرف اسلام ہی ہے) وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَ ھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ (جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین طلب کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا)۔ ان کا اس پر ایمان تھا کہ اسلام ہی بہترین دین ہے اور جو لوگ ان کے ارد گرد آباد ہیں وہ سب گمراہ ہیں۔ عرب اسلام کے حامی اور دین قویم کے حاملین

---

[1] ملاحظہ ہو مسعودی صفحہ ۱۵۵ ج ۲

تھے۔ ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ وہ تمام دوسرے لوگوں کو دعوت دیں کہ اپنا پرانا دین چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو جائیں اور اس دعوت دیدینے کے بعد ان کا فریضہ جہاد تھا۔ وہ ایران پر فتحمند ہوئے اور انھوں نے ایران کے تخت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ وہ رومیوں پر غالب آگئے اور ان کی فوجوں کو انھوں نے تتر بتر کر دیا۔ اور ان میں سے بیشتر علاقوں پر قابض ہو گئے جن پر رومی اور ایرانی قابض تھے۔ مختصر یہ کہ انھوں نے دیکھا کہ دنیا کی سرداری ایران اور روم کا حصہ تھی جو یکبارگی ان کی طرف منتقل ہو گئی۔ یہ ایرانی جن کی قوت سے کل تک عرب خوف زدہ تھے آج ان کے تابع فرمان ہو گئے۔ یہ رومی جن کے متعلق عربوں کی یہ آرزو رہا کرتی تھی کہ وہ مصر اور شام کے دروازے ان کے لئے کھلے رہنے دیں تاکہ وہ وہاں تجارت کر سکیں ان کے سامنے شکست کھا کر بھاگ گئے اور سارا ملک ان کے ہاتھوں میں سونپ گئے ان واقعات سے عربوں کے نفس میں ذرا ابھار پیدا ہوا اور بعض لوگوں نے اس میں مبالغہ اور غلو سے کام لیا۔ ان میں یہ شعور بیدار ہونے لگا کہ جو خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے وہ کوئی ممتاز خون ہے اور ایرانی اور رومی خون اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس شعور نے ان کے اندر سیادت اور عظمت کے خیالات پیدا کئے اور وہ دوسری قوموں کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے ایک مالک اپنے غلاموں کی طرف دیکھا کرتا ہے۔ اموی حکومت کی بنیاد اسی نظریہ پر تھی ـــــ واقعہ یہ ہے کہ عربوں نے اپنے اس نظریہ میں اسلام کی تعلیمات

عصبیت کے خلاف اسلامی تعلیمات

کی پیروی نہیں کی۔ حق تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ اِلَّا بِالتَّقْوٰی (عربی النسل آدمی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں مگر محض تقویٰ کی وجہ سے) حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر حذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم آج زندہ ہوتے تو میں ان کو اپنی جگہ خلیفہ نامزد کر دیتا۔ میں جب "عرب" کا لفظ بولتا ہوں تو اس سے میری مراد سارے عرب نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہاں بھلے اور نیک لوگوں کی بھی ایک بڑی جماعت موجود تھی جو اسلامی تعلیمات پر صحیح معنوں میں عمل پیرا تھی۔ اور جو فضیلت کا پیمانہ دینداری کو قرار دیتے تھے نہ کہ خون کو چنانچہ حضرت علی ابن ابی طالبؓ کسی شریف کو غیر شریف پر اور کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت یا ترجیح نہیں دیتے تھے۔ وہ روساء اور امراء قبائل سے بنائے رکھنے کی فکر بھی نہیں رکھتے تھے۔ یہ چیزیں ہی ان قوی اسباب و وجوہ میں سے تھیں کہ عربوں نے حضرت علیؓ کا کبھی ساتھ نہیں دیا[1]۔ مدائنی نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ کے کچھ اصحاب ان کے پاس چل کر گئے اور ان سے درخواست کی کہ ان اموال کو تقسیم کر دیں اور تقسیم کرتے ہوئے

---

[1] شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید عن المدائنی صفحہ ۱۸۰ ج ۱

اشرافِ عرب اور اشرافِ قریش کو موالی اور عجمی لوگوں پر خاص ترجیح دیں اور مشورہ دیا کہ جن لوگوں کی مخالفت کا اندیشہ ہو ان کو اس مال کے ذریعے سے اپنی جانب مائل کر لیجئے ـــــ انھوں نے یہ اس لئے کہا تھا کہ امیر معاویہؓ اموال کی تقسیم میں ایسا کچھ ہی کرتے تھے ـــــ تو حضرت علیؓ نے ان کو جواب دیا ـــــ "کیا تم مجھے یہ ہدایت کرنا چاہتے ہو کہ میں ظلم کر کے فتح حاصل کر دوں؟" ـــــ عام عربوں، اور بنو امیہ کے امراء و حکام میں یہ عربی عصبیت بہت قوی تھی۔ اس بنا پر وہ غیر عربوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ لٹریری کتابیں اور تاریخی حوادث اس کے شواہد سے بھرے پڑے ہیں۔ جریر ایک مرتبہ بنو العنبر کے کسی قبیلہ میں آیا۔ انھوں نے اس کی مہمان نوازی نہیں کی۔ اسے ان کے ہاں کھانا خرید کر کھانا پڑا۔ جریر واپس جاتے ہوئے یہ کہتا گیا۔

یَا مَالِكَ بنَ طَرِيفٍ إِنَّ بَيْعَكُمْ
رِفْدَ الْقِرَىٰ مُفْسِدٌ لِلدِّيْنِ وَالْحَسَبِ
قَالُوْا ! نَبِيْعُكَهُ بَيْعًا، فَقُلْتُ لَهُمْ
بِيْعُوْا الْمَوَالِيَ وَاسْتَحْيُوْا مِنَ الْعَرَبِ

اے مالک بن طریف تمھارا میزبانی کے سامان کو فروخت کرنا دین وحسب

۱؎ شرح نہج البلاغۃ صفحہ ۱۰۲ ج ۱

میں فساد پیدا کرنے والی چیز ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم تجھے میزبانی کی
چیزیں قیمتہً دیں گے تو میں نے ان سے کہہ دیا، آزاد کردہ غلاموں کے
ہاتھوں، فروخت کرتے رہو مگر عربوں سے تو شر ملتے رہا کرو
مبرد کا بیان ہے کہ موالی (آزاد کردہ غلاموں) کی اکثریت ان اشعار پر بہت ناراض
ہوئی کیونکہ جریر نے ان کی توہین کی تھی اور انھیں کمینہ بتایا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ اب
کے نزدیک مَوالی کے ساتھ اس قسم کی بدسلوکی کرنا کوئی عیب نہیں تھا۔[۱]

مختار نے ابراہیم ابن الاشتر سے جنگ خازر کے دن کہا تھا —— یہ وہ دن
تھا جس میں عبید اللہ ابن زیاد قتل کیا گیا تھا —— کہ تیری فوج میں زیادہ تر
یہ سُرخ لوگ (یعنی موالی) ہیں۔ اگر جنگ نے اپنے دانت گڑو دیے تو یہ لوگ
بھاگ کھڑے ہوں گے۔ گھوڑوں پر عربوں کو سوار کرو اور ان سُرخ رنگ
لوگوں کو ان کے آگے آگے پیادہ رکھو۔[۲]

اغانی نے بیان کیا ہے کہ کسی آزاد کردہ غلام نے بنو سلیم کے کسی بڈی
کی لڑکی سے شادی کا پیغام دیا اور اس سے نکاح کر لیا۔ محمد بن بشیر فوراً مدینہ
منورہ پہنچا جہاں ان دنوں ابراہیم بن ہشام بن اسماعیل گورنر تھا۔ محمد بن بشیر
نے گورنر سے اس واقعہ کی شکایت کی۔ گورنر نے اس آزاد کردہ غلام کو بلوایا اور فوراً

---

[۱] الکامل صفحہ ۲۷۳ ج ۱ [۲] الکامل صفحہ ۲۷۴ ج ۱

اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کردی۔ شوہر کو دو سو کوڑے کی سزا دی
اس کے علاوہ اس کا سر ڈاڑھی اور بھنویں منڈا کر اس کی تشہیر کرائی۔ اس پر محمد
بن بشیر نے کہا ہے

قَضَيْتَ بِسُنَّةٍ وَحَكَمْتَ عَدْلًا
وَلَمْ تَرِثِ الْحُكُومَةَ مِنْ بَعِيْدٍ

تو نے سنت کے مطابق اور انصاف کے موافق فیصلہ کیا اور بات یہ ہے
کہ تو نے حکومت کہیں دور سے وراثت میں نہیں پائی (یعنی تیرا خاندان
تو برابر حکومت ہی کرتا آیا ہے۔

محمد بن بشیر اسی واقعہ کے متعلق کہتا ہے

وَفِي الْمِائَتَيْنِ لِلْمَوْلَى نَكَالٌ
وَفِي سَلْبِ الْحَوَاجِبِ وَالْخُدُوْدِ
إِذَا كَافَأْتَهُمْ بِبَنَاتِ كِسْرَى
فَهَلْ يَجِدُ الْمَوَالِي مِنْ مَزِيْدٍ
فَأَيُّ الْحَقِّ أَنْصَفُ لِلْمَوَالِي
مِنْ أَصْهَارِ الْعَبِيْدِ إِلَى عَبِيْدٍ

دو سو کوڑوں میں ایک غلام کے لئے کافی سزا ہے۔ اور بھویں اور گال صاف
کرا دینے میں۔ جب تو نے ان کو کسریٰ کی لڑکیوں کا ہم پلہ قرار دیدیا ہے

تو یہ غلام اس سے زیادہ اور کیا پا سکتے ہیں۔ غلاموں کے لئے اس سے زیادہ کونسا حق انصاف کے مطابق ہوگا کہ غلاموں کی شادیاں غلاموں ہی میں ہونی چاہئیں[۵]۔

حجاج بن یوسف ــــ اموی دولت کے ارکان میں سے ایک رکن ــ اس سیاست پر سختی اور مبالغہ کے ساتھ عامل تھا۔ اس نے پچھنوں سے نبطیوں کے ہاتھوں تک کو گدوا دیا تھا۔ چنانچہ اس بنا پر کوئی شاعر کسی غلام کے متعلق کہتا ہے ؎

لَوْ كَانَ حَيًّا لَهُ الْحَجَّاجُ مَا سَلِمَتْ
صَحِيْحَةً يَدُهُ مِنْ وَسْمِ حَجَّاجِ

اس کے لئے اگر آج حجاج زندہ ہوتا تو اس کا ہاتھ حجاج کے نشان لگنے سے محفوظ نہ رہ سکتا[۶]۔

حجاج جب واسط میں آیا تو اس نے تمام نبطیوں کو واسط سے شہر بدر کرا دیا اور بصرہ میں اپنے عامل کو ــ ان کا نام حکم بن ایوب تھا ــ لکھا کہ جب تمہارے پاس میرا یہ خط پہنچے تو فوراً جتنے نبطی وہاں آباد ہوں ان کو شہر سے نکال دو۔ کیونکہ یہ لوگ دین اور دنیا دونوں میں فساد ڈالنے والے ہیں۔ حکم بن ایوب نے جواب دیا کہ میں نے تمام نبطیوں کو شہر سے نکال دیا ہے البتہ ان نبطیوں کو شہر میں

---

[۵] اغانی صفحہ ۱۵۰ ج ۱۴ [۶] شرح نہج البلاغت صفحہ ۱۳۳ ج ۴

رہنے دیا ہے جو قرآن کریم پڑھتے ہیں اور دین کی سمجھ حاصل کر چکے ہیں۔ تو حجاج نے اسے دوبارہ تحریر کیا۔ کہ جب میرا یہ خط تمھیں ملے تو جس قدر طبیب وہاں موجود ہوں ان کو طلب کر لو اور ان کے بیچ میں تم سو جاؤ تاکہ وہ تمھاری رگوں کا پورا جائزہ لے سکیں۔ اگر انھیں تمھارے جسم میں کوئی نبطی رگ مل جائے تو اسے فوراً کاٹ ڈالو۔ والسلام[1]

حجاج کا یہ فرمان تھا کہ کوفہ میں عربی آدمی کے سوا کوئی شخص امامت نہ کرے[2]۔

جب سعید بن جُبیر کو گرفتار کیا گیا جنھوں نے ابن الاشعث کے ساتھ مل کر حجاج کے خلاف بغاوت کی تھی۔ تو حجاج نے ان سے کہا۔ تمھیں یاد نہیں کہ جب تم کوفہ میں آئے تھے تو کوفہ میں عربی النسل آدمی کے سوا کوئی دوسرا آدمی امامت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر میں نے تم کو امام بنایا۔ سعید بن جبیرؒ نے جواب دیا کہ آپ کا فرمانا صحیح ہے۔ حجاج نے کہا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میں نے تمھیں قضا کا منصب عطا کیا جس پر تمام کوفہ والے چلا اٹھے تھے کہ قضا کا منصب عربی النسل آدمی کے سوا کسی کو نہیں دیا جانا چاہیئے۔ تو میں نے ابو بردہ بن ابی موسیٰ اشعری کو قاضی بنایا مگر انھیں اس کا پابند کر دیا کہ وہ کوئی فیصلہ تمھارے استصواب کے بغیر نہ کریں۔ سعید بن جبیرؒ نے جواب میں کہا کہ یہ فرمان بھی بجا ہے۔ حجاج نے اس کے بعد کہا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میں نے تمھیں اپنے خاص قصہ گوؤں میں جگہ دی جن میں سب کے سب عرب کے سردار

---

[1] محاضرات الادبار صفحہ ۲۱۸ ج ۱ [2] العقد الفرید صفحہ ۲۰۷ ج ۱

تھے، سعید بن جبیرؒ نے اس کا بھی اعتراف کیا۔ تو حجاج نے پوچھا کہ ان تمام باتوں کے باوجود پھر وہ کونسی چیز ہے جس نے تمہیں میرے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا الخ[۱]

اصفہانی کہتے ہیں کہ دولتِ عباسیہ کے قیام تک عربوں کا حال یہ تھا کہ کوئی عرب بازار سے آرہا ہوتا اور اس کے ساتھ کچھ سامان ہوتا اور کوئی راستہ میں آزاد کردہ غلام نظر آجاتا تو سامان کو گھر تک پہنچانے کے لئے وہ اسے پکار لیتا۔ کسی غلام کی یہ مجال نہیں تھی کہ اس سے انکار کر دیتا۔ اربابِ حکومت بھی اس پر کچھ بھی نوٹس نہیں لیتے تھے۔ اگر کسی عربی کو سامنے سے آتا ہوا کوئی غلام مل جاتا جو بدقسمتی سے کسی سواری پر آرہا ہو اور عربی النسل شخص چاہتا کہ وہ سواری سے اتر جائے تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ اگر کسی کو خواہش ہوتی کہ ان کی کسی لڑکی سے شادی کرے تو وہ اس کے آقا کو اس کا پیغام دیتا تھا۔ اس لڑکی کے باپ دادا سے اسے بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی[۲]

جریر بن الخطفی نے ان موالی کی تعریف میں ایک شعر کہہ دیا تھا تو موالی کو اس کی کس قدر بے اندازہ خوشی ہوئی تھی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ وہ شعر یہ تھا

فَیَجْمَعُنَا وَالْغُرَّ اَوْلَادَ سَادَۃٍ

اَبٌ لَا یُبَالِیْ بَعْدَہٗ مَنْ تَعَذَّرَا

---

[۱] الکامل صفحہ ۳۹۷ ج ۱ [۲] محاضرات الادبار صفحہ ۲۲۰ ج ۱

ہمارا اور ان روشن پیشانی والے سرداروں کی اولاد کا باپ تو ایک ہی ہے
اسے اس کی کچھ پروا نہیں کہ اس کے بعد ان میں سے کس نے بے وفائی
کی راہ اختیار کر لی۔

اس شعر پر موالی اس کے گرد جمع ہو گئے وہ اسے سلام کرتے تھے اور اس سے پوچھتے تھے ابو ورزہ آپ کا مزاج کیسا ہے؟ ان لوگوں نے ایک سو جوڑے انھیں تحفے میں دیئے۔[1]

بلکہ عرب تو ان لوگوں کو بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو باندیوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے ـــــ یہ وہی لوگ تھے جن کی علمی قابلیت اور خصوصیات کو ہم گذشتہ فصل میں بیان کر چکے ہیں ـــــ انھوں نے عربی آدمی کے ایسے بیٹوں کو جو باندی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے ھَجِیْن کا خطاب دیا تھا۔ لسان العرب میں ہے کہ ھُجْنَۃ ایسی بات کو کہتے ہیں جو تمھیں عیب لگاتی ہو۔ ھَجِیْنٌ وہ عربی آدمی ہے جو باندی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو کیونکہ وہ بھی عیب دار ہوتا ہے۔

ابن عبد ربہ کا بیان ہے کہ "بنو امیہ باندی زادوں کو خلیفہ نہیں بناتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ عرب کے لوگ ان کی اطاعت نہیں کریں گے" اصمعی نے ان کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بنو امیہ باندی زادوں کو

---

[1] ملاحظہ ہو اغانی صفحہ ۶۵ ج ۷

اس لئے حکومت نہیں دیتے کہ وہ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ وہ ان کو حکومت دینے میں اس لئے پس و پیش کرتے تھے کہ بنو امیہ کو یہ اندیشہ تھا کہ ان کی حکومت کا زوال ایک ایسے شخص کے ہاتھوں پیش آنے والا ہے جو کسی باندی کے پیٹ سے ہوگا۔" لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس بارہ میں لوگوں کا خیال صحیح تھا اور اصمعی کی توجیہہ صحیح نہیں ہے۔۔۔۔ کیونکہ لوگوں کا جو کچھ خیال تھا اس کی تو واقعات، منطق اور بنو امیہ کی سیاست ساری چیزیں تائید کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی گورنر منتخب کرتے تھے تو اس کے عربی ہونے کو سب سے پہلے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ قاضی یا امام کا انتخاب کرتے تھے جو لوگوں کو نماز پڑھا سکے تو اس میں بھی وہ اس کی رعایت رکھتے تھے۔ جیسا کہ اصمعی کا خیال ہے وہ یہ سب کچھ محض کسی نجومی کی پیش گوئی کے ماتحت نہیں کرتے تھے۔ خیال تو کیجیے ایک خالد بن عبداللہ قسری کو عراق کا گورنر بنانے میں بنو امیہ کو کس قدر دشواریاں پیش آئی تھیں اور خود خالد بن عبداللہ کو شعراء کی کس قدر ہجو کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ جس کی وجہ محض اتنی تھی کہ خالد بن عبداللہ کی ماں ایک رومی باندی تھی۔ اصمعی کے خیال کی تردید کے لئے سب سے بڑی دلیل تو یہی ہے کہ بنو امیہ نے عملاً یزید بن الولید، ابراہیم بن الولید اور مروان بن محمد کو خلیفہ بنایا ہے۔ حالانکہ ان سب کی مائیں باندیاں تھیں۔ اگر نجوم پر ان کا عقیدہ ہوتا تو وہ کبھی ان کو خلیفہ نہ بناتے۔۔۔۔ ان کو خلیفہ بنانے کی حکمت یہی تھی کہ اموی عہد کے آخری زمانہ میں موالی کی

طاقت بڑھ چکی تھی اور وہ ان کی قوت کے سامنے ایک طرح سے جھکنے پر مجبور ہو چکے تھے۔

ایک بدوی سوار قاضی کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ میرا باپ مر گیا ہے۔ اس نے ایک تو مجھے چھوڑا ہے اور ایک میرے بھائی کو — یہ کہہ کر اس نے ایک طرف دو لکیریں کھینچیں — پھر کہا کہ اور ایک ہمارا ہجین بھائی چھوڑا ہے — پھر اس نے دوسری طرف ایک تیسری لکیر کھینچی — اس کے بعد اس نے سوال کیا کہ باپ کا مال ہمارے درمیان کس طرح تقسیم ہوگا۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ اگر تمھارے سوا کوئی اور وارث نہیں ہے تو مال کے تین حصے کر دئیے جائیں گے۔ اس بدوی نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات کو سمجھے نہیں۔ اس کا ایک بیٹا تو میں ہوں دوسرا بیٹا میرا بھائی ہے اور تیسرا ایک ہجین ہے قاضی نے سوار سے کہا کہ ہاں ہاں۔ مال تم تینوں میں برابر سرابر تقسیم ہوگا۔ بدوی نے حیرت سے کہا کہ ہجین کو بھی اتنا ہی مال ملے گا جتنا مجھے اور میرے بھائی کو ملے گا۔ قاضی نے کہا کہ ہاں تینوں کو برابر ملے گا۔ بدوی سخت ناراض ہوا اور کہنے لگا۔ خدا کی قسم معلوم ہوتا ہے کہ صحرائے عرب میں تمھاری خالائیں بہت ہی کم ہیں۔

---

[1] عیون الاخبار صفحہ ۱۹ ج ۲ کہتے ہیں کہ صحرائے عرب میں باندیاں نہیں ہوتیں وہاں آزاد عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ الکامل للمبرد۔

جاحظ نے بیان کیا ہے کہ میں نے عبید کلابی سے کہا ـــــ عبید کلابی بڑے فصیح و بلیغ مگر محتاج آدمی تھے ـــ کہ کیا تمھیں یہ بات پسند ہے کہ تم ہجین ہوتے اور تمھارے پاس ایک ہزار جریب زمین ہوتی ؟" عبید کلابی نے جواب دیا کہ میں اس کمینگی کو کسی بڑی سے بڑی چیز کے بدلے میں بھی قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کیوں۔ آخر امیرالمؤمنین بھی تو باندی ہی کے شکم سے ہیں۔ عبید کلابی نے کہا کہ خدا اسے بھی ذلیل کرے جو ایسے امیرالمؤمنین کی اطاعت کرتا ہو۔ رقاشی کہتا ہے

إِنَّ أَوْلَادَ السَّرَارِي

كَثُرَتْ يَا رَبِّ فِينَا

رَبِّ أَدْخِلْنِي بِلَادًا

لَا أَرَى فِيهَا هَجِينَا

باندیوں کی اولاد، خدایا! ہم میں بہت ہو گئی ہے۔ خدایا! مجھے تو کسی ایسے ملک میں لیجا جہاں مجھے کسی باندی زادہ کی صورت نظر نہ آئے۔

محمد بن عبداللہ بن حسن بن الحسن بن علی ابن طالب رضہ نے ابو جعفر منصور کو طنز کرتے ہوئے اور عار دلاتے ہوئے لکھا تھا۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں فتح کے بعد اسلام لانے والوں یا ملعونوں کی اولاد نہیں ہوں۔ مجھ میں کسی باندی کا خون نہیں ہے اور نہ مجھے باندیوں نے دودھ پلایا اور نہ گودوں میں کھلایا ہے۔ الخ

سچی بات یہ ہے کہ اموی حکومت اس حیثیت سے اسلامی حکومت نہیں تھی

کہ اس میں تمام آدمیوں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جاتا ہو۔ اور اچھی باتوں کا نیک بدلہ ہر ایک کو دیا جاتا ہو خواہ وہ عربی النسل ہو یا کوئی غلام ہو۔ یا سزا ہر مجرم کو دی جاتی ہو چاہے وہ عربی ہو یا عجمی ہو۔ اور حکام ساری رعایا کے یکساں طور پر خادم ہوتے ہوں۔ بلکہ ان کی حکومت عربوں کی حکومت تھی اور حکام محض عربوں کے خادم ہوتے تھے اور ٹیکس غیر عربوں سے وصول کرتے تھے۔ عام طور سے عربوں پر جاہلی رجحانات چھائے ہوئے تھے۔ اسلامی رجحانات کا کہیں نام و نشان مشکل ہی سے ملتا تھا۔ حق اور باطل کے فیصلے یہ دیکھ کر کئے جاتے تھے کہ ان کا صدور کن لوگوں سے ہوا ہے۔ ایک کام حق بن جاتا تھا اگر وہ کسی عربی النسل آدمی سے صادر ہوا ہے یا کسی خاص قبیلہ سے سرزد ہوا ہو اور وہی کام باطل قرار پاتا تھا اگر کسی آزاد کردہ غلام سے یا کسی دوسرے قبیلہ کے آدمی سے سرزد ہوا ہو۔۔ ہم یہاں اس امر سے بحث نہیں کر رہے ہیں کہ ان عجمیوں کی مجموعی حالت عربوں کی حکومت کے ماتحت زیادہ بہتر تھی کیونکہ یہ امور ان لوگوں کے لئے اہم ہو سکتے ہیں جو سیاسی حالات کی تحقیق کریں۔

یہ بات ہم یہاں پھر دہرا دینا چاہتے ہیں۔۔ جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سنگدلانہ نگاہ سارے عربوں میں عام نہیں تھی کہ عربوں کا ہر فرد اس نظریہ کا شکار ہو بلکہ ہمارے کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ عام طور پر دیہاتی لوگوں اور حکام میں یہی رجحان کارفرما تھا۔ لیکن اس کے برعکس عام علمی اور دینی حلقوں میں

پورے طور پر مساوات کارفرما تھی۔ عالم آدمی کی عزت کی جاتی تھی خواہ وہ غلام ہوتا تھا یا عربی النسل ہوتا تھا۔ چنانچہ سربرآوردہ تابعین میں بہت سے لوگ غلاموں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگ ان کی اسی طرح عزت و اکرام کرتے تھے جیسا کہ عربوں کی عزت و احترام کرتے تھے۔ ان میں فرق ہوتا تھا تو محض دین اور علم کی بنا پر ہوتا تھا۔ چنانچہ امام زہری۔ مسروق بن الاجوع، شریح، سعید بن المسیب اور قتادہ کو تابعین کے سادات میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ سارے کے سارے عربی النسل تھے۔ مگر ان کے ساتھ ہی امام حسن بصری۔ محمد بن سیرین، سعید بن جبیر، عطار ابن یسار، ربیعۃ الرائے، ابن جریج بھی تابعین کے سادات میں شمار ہوتے تھے۔ یہ سارے کے سارے غلاموں کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگ ـــــ خواہ وہ عربی ہوں یا غیر عربی ـــــ بغیر کسی فرق و امتیاز کے سب سے ہی برابر علم حاصل کرتے تھے۔ ایک کے حلقۂ درس سے اٹھ کر دوسرے کے حلقۂ درس میں شریک ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ تاریخ میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ امام حسن بصریؒ خلفائے بنو امیہ پر سخت سے سخت تنقیدیں کرتے تھے۔ یزید بن المہلب کو بُرا کہہ لیتے تھے۔ وہ علانیہ اس رائے کا اظہار کرتے تھے کہ یزید اور ان کے ساتھی اور بنو امیہ گمراہ ہیں جو دین اسلام سے نکل گئے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری آرزو تو یہ ہے کہ زمین نے یزید بن معاویہ اور یزید بن المہلب کو ایک ساتھ نگل لیا ہوتا۔ پھر تاریخ میں ہمیں یہ بھی

ملتا ہے کہ یزید المہلب اپنے قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ حسن بصری کے پاس
آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی آدمی ارادہ کر لیتا ہے کہ امام حسن بصری کو قتل
کر ڈالے تو یزید بن مہلب اسے روکتا ہے اور کہتا ہے آہنی تلوار کو نیام میں
کر لو۔ بخدا اگر تم نے کچھ بھی کیا تو یہی لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں پلٹ کر خود
ہمیں قتل کر ڈالیں گے[1]۔ امام حسن بصریؒ کا جب انتقال ہوا تو شہر کے
تمام لوگ ان کے جنازہ کے پیچھے چل دیئے حتیٰ کہ مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے
کے لئے بھی کوئی آدمی نہیں رہا۔ حجاج بن یوسف نے ہزاروں عربوں اور موالی
کو تہ تیغ کیا مگر لوگوں نے اس کا اتنا برا نہیں منایا جیسا کہ محض ایک سعید
بن جبیرؒ کے قتل کا برا منایا۔ اس کی وجہ محض ان کا علم اور دینداری تھی۔
حالانکہ وہ موالی ہی میں سے تھے۔

یہ وجہ جو ہم نے بیان کی ہے تاریخ و سیر کے ان مختلف بیانات
و واقعات کی تشریح کر دیتی ہے جن سے کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے
لوگ موالی کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور کبھی یہ نظر آتا ہے
کہ وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مطالعہ کرنے والا ابتدائی مرحلہ میں یہ
سمجھتا ہے کہ ان بیانات اور واقعات میں تضاد ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے

---

[1] ابن خلکان صفحہ ۲۰۰ ج ۲

کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سیاسی حلقوں، قبائلی اشراف کے حلقوں اور دیہاتی حلقوں میں موالی کو حقیر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن دینی اور علمی حلقوں میں کسی جنس یا کسی خون کے لئے کوئی تعصب موجود نہیں تھا۔ وہاں صرف دین اور علم کے لئے تعصب ہوتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں جہاں ملتی تھیں ان کی پوری پوری قدر کی جاتی تھی۔

موالی کا عربوں کے خلاف تعصب

اس عربی عصبیت کے مقابلہ میں موالی کی بھی ایک عصبیت تھی۔ خصوصیت کے ساتھ ایرانیوں کی عصبیت۔ انھیں بڑا ہی تعجب تھا کہ عرب کے لوگ ان پر کس طرح غالب آگئے۔ بعض لوگ تو اس مضمون کو ان الفاظ سے تعبیر کرتے تھے کہ عربوں کی حکومت تقدیر کا ایک مذاق ہے جو ان کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ برابر اپنی قدیم بزرگی اور پرانی عزت پر عربوں کے خلاف فخر کرتے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم ایک عظیم الشان تہذیب کے مالک ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ملکوں کا انتظام کس طرح کیا جاتا ہے۔ جب ان کی حکومت تھی تو انھیں کبھی عربوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن جب عربوں کی حکومت قائم ہوئی تو وہ ایک دن بھی ان کی مدد کے بغیر حکومت نہیں کر سکے۔

ایرانیوں میں قبائلی عصبیت نہیں تھی۔ وہ اپنے نسب ناموں کو عربوں کی

طرح خاص طور پر محفوظ بھی نہیں رکھتے تھے۔ ان میں کبھی تو ملک کے نام پر تعصب ہوتا تھا۔ چنانچہ مثلاً اہل خراسان میں اس قسم کا تعصب تھا۔ خراسانیوں کو خراسانیوں کے ساتھ شدید عصبیت ہوتی تھی۔ یا کبھی ان میں قومیت کی عصبیت ہوا کرتی تھی اور یہ چیز فطری تھی۔ کیونکہ — عرصہ دراز سے — وہ خانہ بدوشی کی زندگی کو قطع کر کے مدنیت و تہذیب کے عادی ہو چکے تھے۔ اور وہ اپنے مکمل اور صحیح معنوں میں ایک قوم بن چکے تھے۔ بنو امیہ کے زمانہ ہی سے وہ عربوں کے خلاف فخر کرنے لگے تھے — چنانچہ آپ اسماعیل بن یسار کے اشعار تو دیکھ چکے ہیں[1]۔ وہ ہمیشہ ایرانیوں کی عظمت کے گیت گاتا ہی رہتا تھا — وہ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک کے دربار میں پیش ہوا۔ ہشام نے اس سے اشعار سنانے کی خواہش کی۔ اُس نے اپنا یہ قصیدہ شروع کر دیا جس میں وہ کہتا ہے کہ ؎

إِنِّیْ وَجَدِّكَ مَا عُوْدِیْ بِذِیْ خَوَرٍ
عِنْدَ الْحِفَاظِ وَلَا حَوْضِیْ بِمَھْدُوْمٍ

أَصْلِیْ کَرِیْمٌ وَ مَجْدِیْ لَا یُقَاسُ بِهٖ
وَلِیْ لِسَانٌ کَحَدِّ السَّیْفِ مَسْمُوْمٌ

---

[1] فجر الاسلام جلد اوّل ص ۱۳۸

أَحْمِی بِهٖ مَجْدَ أَقْوَامٍ ذَوِی حَسَبٍ
مِنْ كُلِّ قَوْمٍ بِتَاجِ الْمُلْكِ مَعْمُوْمٍ
جَحَاجِحٍ سَادَةٍ بُلْجٍ مَرَازِبَةٍ
جُوْدٍ عِتَاقٍ مَسَامِيْحٍ مَطَاعِيْمٍ
مَنْ مِثْلُ بَسْرٰی وَسَابُوْرِ الْجُنُوْدِ مَعًا
وَالْهُرْمُزَانِ لِفَخْرٍ أَوْ لِتَعْظِيْمٍ؟
أُسْدِ الْكَتَائِبِ يَوْمَ الدَّوْعِ إِنْ زَحَفُوْا
وَهُمْ أَذَلُّوْا مُلُوْكَ التُّرْكِ وَالرُّوْمِ
يَمْشُوْنَ فِیْ حَلَقِ الْمَاذِیِّ سَابِغَةً
مَشْیَ الضَّوَاغِمَةِ الْأُسْدِ اللَّهَامِيْمِ
هُنَاكِ إِنْ تَسْأَلِیْ تُنْبَئِیْ بِأَنَّ لَنَا
جُرْثُوْمَةً قَهَرَتْ عِزَّ الْجَرَاثِيْمِ

میری عزت کی قسم! حفاظت کرتے وقت میری لکڑی ٹیڑھی نہیں
ہے اور نہ ہی میرا حوض منہدم شدہ ہے۔ میرا خاندان شریف ہے
اور میری بزرگی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ میرے پاس ایسی
زبان ہے جس کی دھار اتنی تیز ہے جتنی زہر پلائی ہوئی تلوار کی دھار
ہوا کرتی ہے۔ میں اس تلوار سے ایسی قوموں کی بزرگی اور عظمت کی

جو صاحبانِ حسب ہیں ہر بے ہودہ آدمی سے جس کے سر پر حکومت
کا تاج عمامہ کی شکل میں باندھ دیا گیا ہو حفاظت کرتا ہوں۔ اصحاب،
مکارم سردارانِ قوم، روشن رو اور روسا رملک، عمدہ اور اصیل
گھوڑوں والے، چشم پوشی کرنے والے اور لوگوں کو کھلانے والے۔
کسریٰ اور شاپور ــــ صاحبِ افواج ــــ اور ہرمزان جیسا
آدمی فخر اور تعظیم کے لیے اور کون ہے؟ نوجوں کے شیر جنگ کے
دن جب حملہ کرنے کے لیے نکلیں جنھوں نے ترک اور روم کے
سلاطین کو ذلیل کر کے رکھ دیا تھا پورے جسم کو ڈھانپنے والی
زرہیں پہن کر یوں چلتے ہیں جیسے شیر ببر چلا کرتے ہیں۔ اس موقعہ
پر اگر تو پوچھ بیٹھے تو تجھے بتایا جائے گا کہ ایک چھوٹا سا جرثومہ بڑے
بڑے جرثوموں کی عزت کو خاک میں ملا دیا کرتا ہے۔

یہ اشعار سن کر ہشام غصہ سے بے تاب ہو گیا اور کہنے لگا۔ کیا تو میرے
سامنے فخر کرتا ہے اور مجھے وہ قصیدہ سناتا ہے جس میں تو نے اپنی اور اپنی
قوم کے کافروں کی مدح سرائی کر رکھی ہے؟ اسے پانی میں ڈبو دو! چنانچہ ہشام
کے حکم کے مطابق اسے ایک حوض میں ڈبو دیا گیا حتیٰ کہ اس کی جان نکلنے کے
قریب ہو گئی۔ آخر ہشام نے حکم دیا کہ اسے باہر نکال لو۔ جب اسے نکالا
گیا تو وہ بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ ہشام نے اسے اسی وقت شام سے

حجاز کی طرف نکال دیا۔[1]

عہد اموی میں دونوں عصبیتوں کی تاریخ

لیکن اس رجحان کو بنو امیہ نے بڑی سختی سے دبایا۔ اور طاقت اور قوت کو اس کے خلاف استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علانیہ فخر کے بجائے اب خفیہ طور پر سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ یہی دراصل عباسی دعوت کی سازش کی ابتدا تھی۔

ہم یہاں یہ بات پھر صاف کر دینا چاہتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بھی صاف کر چکے ہیں —— کہ یہ رجحان تمام ایرانیوں میں نہیں تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو دل کی گہرائیوں سے مسلمان ہو چکے تھے۔ مثال کے طور پر وہ حضرات تابعین جن کے نام ہم پہلے بتلا چکے ہیں وہ اسے فراموش کیے ہوئے نہیں تھے کہ عربوں کا ان پر اتنا بڑا احسان ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ احسان یہ تھا کہ انھیں اسلام کی طرف رہنمائی انہی کی بدولت میسر آئی تھی۔ وہ عرب ہی تھے جنھوں نے انھیں مجوسیت کی گمراہی سے نکال کر وحدانیت کی ہدایت کی تھی۔ علمی اور دینی حلقوں میں ایرانی لوگ اس عربیت یا ایرانیت پر ایمان نہیں رکھتے تھے جو دوسرے حلقوں میں نظر آتی تھی بلکہ وہ اسلام پر ایمان رکھتے تھے جس نے تمام نوعِ انسانی کو

---

[1] اغانی صفحہ ۱۲۰ ج ۴

مساوات کا شرف بخشا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ عام لوگوں میں زیادہ تر اور خصوصیت کے ساتھ ایران کے شرفاء عربوں کو ناپسند کرتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ حکام اور بنوامیہ کو تو وہ ایک آنکھ پسند نہیں کرتے تھے۔ صاحب اغانی کی روایت ہے کہ اسمٰعیل بن بسار نے عمر بن یزید بن عبدالملک سے ملاقات کی خواہش کی۔ اسماعیل کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ کچھ دیر کے بعد ان کو اندر بلایا گیا تو وہ روتے ہوئے اندر داخل ہوئے عمرو بن یزید نے کہا، ابوفائد کیا بات ہے کہ تم رو رہے ہو؟ اسماعیل نے کہا، "اور کیوں نہ روؤں"؟ اپنی اور اپنے باپ کی مردانگی کے باوجود آج میری یہ قدر رہ گئی ہے کہ مجھے آپ سے ملاقات کے لئے دیر تک باہر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ عمرو بن یزید ان سے معذرت کرتے رہے اور وہ روتے رہے حتٰی کہ جب تک عمرو بن یزید نے اس کو انعامات واکرامات سے ڈھانپ نہیں دیا وہ خاموش نہیں ہوا۔ اسماعیل وہاں سے نکلا تو ایک شخص نے اس سے پوچھا۔ اسماعیل! تیرا ناس ہو، ذرا مجھے بتا تو سہی، وہ تیری، اور تیرے باپ کی کونسی مردانگی تھی جس کا تو اس شدومد سے ذکر کر رہا تھا؟ اسماعیل نے کہا کہ ہماری مردانگی یہی ہے کہ ان عجمی لوگوں سے بغض رکھتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک مروان اور اس کی اولاد کا تعلق ہے تو میری بیوی کو طلاق ہے اگر میری ماں روزانہ تسبیح وتہلیل کے بجائے مروان اور اس کی اولاد پر لعنت نہ بھیجتی ہو۔ اور اگر میرے باپ کو مرتے دم یہ کہا جائے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ کہہ لو اور وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ کہنے کے

کے بجائے لعن اللہ مروان نہ کہے اور اقرار توحید کے بجائے اس کو خدا کے تقرب کا ذریعہ اور اس کا قائم مقام نہ سمجھے۔"[۱]

موالی بنو امیہ کی حکومت کو دل کی گہرائی سے ناپسند کرتے تھے۔ ان کا زاویہ نظر یہ تھا کہ بنو امیہ اپنی حکومت میں ہمارے درمیان انصاف سے کام نہیں لیتے۔ ہمیں اس انتظار میں عرصہ گذر گیا کہ حکومت ایک خلیفہ سے دوسرے خلیفہ کی طرف منتقل ہو تو شاید حالات میں کچھ تبدیلی آجائے مگر یہ توقعات بھی سراب سے زیادہ ثابت نہیں ہوئیں۔ ظلم و تعدی کی رفتار برابر یکساں چلی آرہی ہے۔ صرف ایک عمر بن عبدالعزیز کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے مگر وہ اس گھرانے میں شاذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ہمارے امکان میں نہیں کہ ہم عربوں سے حکومت چھین کر ایرانیوں کی طرف منتقل کر سکیں اور ایرانی خود صاحب حکومت ہو جائیں کیونکہ حالات اس قسم کے ہو چکے ہیں کہ اقتدار اعلیٰ تو عربوں کے ہاتھ ہی میں رہے گا۔ علاوہ ازیں اگر اس قسم کی کوشش کی گئی کہ حکومت عربوں کے ہاتھ سے چھین کر ایرانیوں کے قبضہ میں آجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ سارے عرب اور غیر ایرانی موالی ہمارے خلاف متحد ہو جائیں گے۔ لہذا مناسب یہ ہے کہ ہم ایسی کوشش کریں کہ اقتدار اعلیٰ تو عربوں ہی کے ہاتھ میں رہے مگر حکومت بنو امیہ کے ہاتھوں سے نکل کر بنو ہاشم کے خاندان

---

[۱] اغانی صفحہ ۱۲۵ جلد ۴

میں چلی جائے۔ لوگوں کے دل اس دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ کیونکہ ہاشمی بھی عرب ہی ہیں اور بنوامیہ کی بہ نسبت رسول اللہ صلعم کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اس لئے اس دعوت کے مقبول ہو جانے میں جلد کامیابی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ اسے دینی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ آخر میں یہ کہ جب ہم بنو ہاشم کی امداد کریں گے تو وہ یہ محسوس کریں گے کہ حکومت انھیں ہماری مدد سے ملی ہے اور وہ ہماری تدبیر سے ہی کامیاب ہوئے ہیں۔ اس طرح حکومت بظاہر ان کے ہاتھوں میں ہو گی مگر درحقیقت ہمارے قبضۂ اقتدار میں رہے گی۔ بلند ترین مناصب ہمارے ہاتھوں میں رہیں گے اور حالات مملکت کی تدبیر بھی ہم ہی کریں گے عربوں کے لیے محض خلافت کی شان و شوکت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ رہجائیگی۔ صورت اور شکل ان کی ہو گی اور جوہر ہمارا ہو گا۔ غالباً یہی وہ اہم تر خیال تھا جو خلافت عباسیہ کے ایرانی مؤسسین کے دلوں میں تھا۔ چنانچہ نصر بن سیار نے نزاری اور یمانی قبائل کو مخاطب کر کے انھیں ان کی اس اندرونی دشمنی سے ان الفاظ میں متنبہ کیا تھا۔

ابلغ ربیعة فی مرو و اخوتهم

فلیغضبوا قبل ان لا ینفع الغضب

ولینصبوا الحرب ان القوم قد نصبوا

حربا، یحرق فی حافاتها الحطب

ما بالکم تلحمون الحرب بینکم

کان اھل الجا عن حی أبکم غزب

و تترکون عدوا قد اظلکموا

مما تأشب، لا دین ولا حسب

فدما یدینون دینا ما سمعت بہ

عن الرسول ولم تنزل بہ الکتب

فمن یکن سائلا عن دینھم

فان دینھموا ۔ ان یقتل العرب

ہر دیں بنو ربیعہ اور ان کے بھائیوں کو میرا یہ پیغام پہنچادے کہ قبل اس کے کہ ان کی غضب آلودگی بے سود ہو جائے انھیں غصّے سے بھر جانا چاہیئے۔ اور جنگ کی ابتداء کر دینی چاہیئے کیونکہ لوگوں نے جنگ شروع کر دی ہے۔ ایسی جنگ جس کے تمام کناروں پر جنگ کا ایندھن جلایا جا رہا ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا کہ تم آپس ہی میں دست و گریباں ہو رہے ہو اور لڑ جھگڑ رہے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل والے تمہارے عقلوں سے پرے ہٹ گئے ہیں۔ تم نے اس دشمن کو چھوڑ رکھا ہے جو تمہارے سروں پر آ چکا ہے، نہ اس کا کوئی دین ہے نہ حسب ہے۔ وہ قدیم زمانہ سے ایک ایسے دین کی پیروی کرتے آئے ہیں جسے ہم نے

کسی رسول سے نہیں سنا اور نہ اسے لے کر کوئی کتاب نازل ہوئی۔ اگر کوئی شخص ان کے اصل دین کے بارہ میں سوال کرے تو ان کا دین محض یہ ہے کہ عربوں کو قتل کر دیا جائے[1]۔

ابراہیم امام نے ابو مسلم خراسانی کو لکھا تھا کہ "اگر تمہیں یہ قدرت ہو کہ خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ چھوڑو۔ ہر عربی بولنے والے کو قتل کر دو تو ضرور ایسا کر ڈالو۔ ہر وہ لڑکا جو پانچ بالشت کا ہو چکا ہو اور تمہیں اس کے متعلق شبہ ہو تو اسے بھی قتل کر دو۔ مضر پر خصوصیت سے نظر رکھو کیونکہ یہ وہ دشمن ہے جس کا وطن بھی قریب ہی ہے۔ ان کی سرسبزی کا بالکلیہ صفایا کر دو۔ اور زمین پر ان کا کوئی متنفس زندہ نہ رہنے دو[2]۔

عباسی دعوت کا گہوارہ خراسان تھا۔ یہ ایک بڑا ملک تھا اور آج کی بہ نسبت اس کا علاقہ دوگنا تھا۔ اس کے گورنر عرب ہی ہوا کرتے تھے جو کبھی مضری ہوتے تھے اور کبھی یمانی ہوتے تھے۔ ان کا انداز حکومت خالصتہً عربی بلکہ قبائلی ہوتا تھا۔ اس چیز نے ابتداءً تو عربوں اور خراسانیوں کے درمیان کینہ اور حسد کی آگ بھڑکائی اور اس کے بعد مضریوں اور یمانیوں میں بھی یہی آگ بھڑک گئی قبیلہ ازد والے اہل یمن کی نمائندگی کرتے تھے اور قبیلۂ تمیم اور قیس بنو مضر کی

---

[1] العقد الفرید صفحہ ۳۵۳ جلد ۲ [2] شرح نہج البلاغت صفحہ ۳۰۹ ج ۱

نمائندگی کرتے تھے۔ ہر قبیلہ لیڈر شپ اور غلبہ و اقتدار کے لئے کوشاں تھا۔ اگر یمنی گورنر ہوتا تھا تو وہ اہل یمن کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا اور مخالف قبائل کو ذلیل کراتا۔ اگر مضری گورنر ہو جاتا تو وہ اس کے برعکس کرتا۔ خراسانی لوگ ان دونوں کے درمیان میں پس رہے تھے۔ مہلب بن ابی صفرہ اور اس کی اولاد طویل عرصہ تک خراسان کی گورنر رہی۔ یہ ازدی۔ یعنی یمنی تھے ــــ حکومت ان کے ہاتھوں میں تھی اور عربی قبائلی طرز کی حکومت کرتے تھے کہ سب سے پہلے مال و جاہ کے ذریعہ سے یمنیوں کی مدد کرتے تھے۔ مدائنی کا بیان ہے کہ یزید بن مہلب کے وکیل نے ایک خربوزوں کی فالیز چالیس ہزار درہم میں فروخت کی جو یزید بن مہلب کی ملکیت تھی۔ اس کی اطلاع جب یزید کو ہوئی تو یزید نے اپنے وکیل سے کہا کہ تو نے ہمیں بقال بنا دیا ہے۔ کیا قبیلہ ازد کی بوڑھی عورتیں نہیں رہی تھیں کہ اس فالیز کو ان میں تقسیم کر دیتا۔[۱]

عمر بن عبدالعزیزؒ یزید بن مہلب اور اس کے اہل خاندان کو ناپسند فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "یہ تو جابرہ ہیں۔ میں ان جیسے لوگوں کو پسند نہیں کر سکتا۔"[۲] قتیبہ ابن مسلم خراسان کا گورنر ہوا جو باہلی ــــ یعنی مضری ــــ تھا تو قبائل کے امراء بگڑ گئے کیونکہ اس نے ان کو ذلیل کیا اور ان کے

---

[۱] ابن خلکان صفحہ ۳۹۵ ج ۲ [۲] ابن خلکان صفحہ ۴۰۴ جلد ۲

ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا اور بڑی دست درازیاں کی تھیں[1]۔ آخر میں نصر بن سیار گورنر ہوا۔ یہ بھی مضری تھا چار سال تک یہ گورنر رہا۔ خراسان میں کوئی حاکم غیر مضری مقرر نہیں کیا جاتا تھا[2]۔ ان جیسی باتوں کی وجہ سے غنبی اور مضری قبائل میں تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔

جب عربوں نے محسوس کیا کہ ایرانی ان کے خلاف مجتمع ہو گئے ہیں تو انھوں نے بھی سوچا کہ وہ بھی اپنی طاقت کو یکجا کریں اور اپنی صفوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کریں چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نصر بن سیار نے عربوں کو خبردار کر دیا تھا کہ ایرانی عربوں کو برباد کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ لہذا عربوں کو بھی ایرانیوں کی طرح متحد ہو جانا چاہیئے۔ بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ معاملات اس سے بھی آگے بڑھ چکے تھے ربیعہ، مضر اور یمن کے قبائل نے ایک حد تک اس امر پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ خراسانیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیں اور ابو مسلم خراسانی سے جنگ کرنے پر متحد ہو جائیں[3]۔ لیکن ابو مسلم خراسانی اور اس کی قوم نے از سر نو قبائل عرب کے مابین فتنہ کی آگ بھڑکا دی اور اپنی چالاکی سے وہ اس میں کامیاب رہے۔ ابو مسلم نے شیبان خارجی کے نام خطوط لکھنے شروع کئے۔ کبھی ان میں اہلِ یمن کی مذمت ہوتی اور کبھی مضر کی۔ اور جو قاصد مضر والا خط لے کر جاتا اس سے کہہ دیتا کہ وہ یمنیوں کے سامنے جائے

---

[1] شرح نہج البلاغت صفحہ ۳۰ ج ا [2] ابن خلدون صفحہ ۱۲۱ ج ۳ [3] ابن خلدون صفحہ ۱۲۱ ج ۳

تاکہ وہ مضر کی مذمت پڑھ لیں اور جو قاصد یمنیوں والا خط لے کر جاتا اسے ہدایت کر دیتا کہ وہ یہ خط لے کر مضر والوں میں جائے تاکہ وہ یمنیوں کی مذمت پڑھ لیں[1]۔ ابو مسلم، علی بن الکرمانی کے پاس آدمی بھیجتا — جو اہل یمن کا لیڈر تھا — جو اس سے جا کر کہتا تمہیں نصر بن سیار سے صلح کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ کل اس نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا اور اسے سولی دی تھی؛ مجھے تو کبھی یہ توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ تم نصر بن سیار کے ساتھ ایک مسجد میں اکٹھے نماز بھی پڑھ سکو گے[2]۔ آخر میں مختلف حادثات اور سازشوں کے بعد ابو مسلم کو کامیابی ہو گئی اور نصر بن سیار ابو مسلم کے پاس گیا اور خواہش کی کہ وہ مضر کے ساتھ معاہدہ کر لے۔ ربیعہ اور قحطان نے بھی ابو مسلم سے اسی قسم کی خواہش کی کہ وہ مضر کے ساتھ معاہدہ کر لے۔ ربیعہ اور قحطان نے بھی ابو مسلم سے اسی قسم کی خواہش کی۔ آپس میں کچھ روز تک اس بارہ میں خط وکتابت ہوتی رہی۔ آخر ابو مسلم نے کہا کہ دونوں فریقوں کے وفد آنے چاہئیں تاکہ وہ ان سے گفتگو کر کے یہ فیصلہ کر سکے کہ اسے کس فریق کا ساتھ دینا چاہیے۔ چنانچہ دونوں وفد آ گئے۔ ابو مسلم اور اس کے ہم نواؤں نے دونوں وفدوں کی تقریریں سنیں۔ اس کے بعد ابو مسلم نے اپنے فیصلہ کا اعلان کیا۔ اعلان یہ تھا۔ ہم علی بن الکرمانی اور اس کے ساتھیوں۔ یعنی قحطان اور ربیعہ کی دوستی کو اختیار کرتے

---

[1] ابن خلدون صفحہ ۱۱۹ جلد ۲ [2] طبری صفحہ ۹۷ ج ۹

ہیں..... مضر کا وفد اُٹھ کھڑا ہوا۔ انھیں اپنی اس ذلت اور رنج کا احساس تھا۔[1]

اموی سلطنت کے خلاف اہل یمن، قبیلہ ربیعہ اور ایرانی مجتمع ہوگئے۔ ان کے نقیبوں میں[2] ــــ یہی وہ کمانڈر اور لیڈر تھے جو اموی سلطنت کے خلاف نبرد آزما تھے ــــ بیشتر عرب تھے۔ ان میں سے ایک قحطبہ طائی بھی تھا جس کا اپنی قوم میں اتنا اثر اور نفوذ تھا کہ شاید ہی کسی دوسرے عربی شخص کا ہو۔ اس نے اہل خراسان میں جو تقریر کی تھی اس میں عربوں کی تحقیر و تذلیل اور ایرانیوں کی عظمت کا اعتراف عجیب زبان میں کیا گیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ایرانیوں سے زیادہ ایرانی تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ "اے اہل خراسان! یہ شہر تمھارے قدیم آباواجداد کے تھے۔ لوگ ان کے عدل وانصاف اور حسن سیرت کی وجہ سے دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے رویہ میں تبدیلی آگئی اور انھوں نے ظلم کرنا شروع کردیا۔ خدائے عزوجل ان پر ناراض ہوا اور اس نے سلطنت ان سے چھین کر ایسی ذلیل ترین قوم کو ان پر مسلط کردیا جو ان کے نزدیک روئے زمین کی تمام قوموں سے زیادہ ذلیل تھی۔ چنانچہ وہ ان کے شہروں پر غالب آگئے...... اور انھوں نے ان کے رہنے والوں کو اپنا غلام بنالیا۔ وہ لوگ ابتداءً عدل وانصاف کے

---

[1] یہ قصہ بالتفصیل طبری صفحہ ۹۷ جلد ۹ پر موجود ہے۔ [2] ان نقیبوں کے نام اور ان کے قبائل کے نام طبری صفحہ ۹۸ ج ۹ میں ملیں گے۔

ساتھ حکومت کرتے تھے۔ عہد کو پورا کرتے تھے، مظلوم کی مدد کرتے تھے. لیکن پھر ان کا رویہ بھی تبدیل ہو گیا اور انھوں نے بھی ظلم و ستم شروع کر دیا۔ اور رسول اللہ صلعم کے عترت اور آل کے نیک اور متقی لوگوں پر زندگی تنگ کر دی۔ چنانچہ اب خدا نے تمھیں ان پر مسلط کر دیا ہے تاکہ تمھارے ذریعہ سے خدا ان سے انتقام لے تاکہ انھیں اپنے اعمال کی سخت ترین سزا مل سکے کیونکہ تم اس انتقام میں اپنا بدلہ لینے کا خیال بھی رکھو گے[۱]۔ لیکن جب ان عربوں نے اپنا کام پورا کر دیا اور بنو امیہ کی سلطنت کا تختہ لوٹا جا چکا تو ابو مسلم نے ان عربوں کا کام تمام کیا اور چُن چُن کر ان کے لیڈروں کو ختم کر دیا۔

دولت امویہ ختم ہو گئی اور دولت عباسیہ قائم ہو گئی۔ ایرانیوں کی تمام آرزوئیں تو نہیں البتہ ان کی کچھ آرزوئیں ضرور پوری ہو گئیں۔ ان کی پوری آرزو تو یہ تھی کہ اپنے سلاطین اور اپنے گورنروں کے ساتھ ان کی اپنی حکومت قائم ہوتی لیکن اس انقلاب میں جو کچھ انھوں نے حاصل کر لیا وہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ عباسی خلفا اس پر قانع تھے کہ ایرانیوں کے کندھوں پر ان کی سلطنت قائم ہو گئی۔ علما اور مؤرخین بھی اس پر خوش تھے۔ داؤد بن علی[۲] خطبہ دیتے ہوئے کہتا ہے: "اے

---

[۱] طبری صفحہ ۱۰۶ جلد ۹ [۲] ابو جعفر منصور کا چچا۔

عہدِ عباسی میں دونوں عصبیتوں کی تاریخ

اہل کوفہ! ہم ہمیشہ مظلوم رہے اور ہمارا حق ہمیشہ دبایا جاتا رہا حتیٰ کہ خدا نے ہمارے مددگار یعنی اہل خراسان کو کھڑا کر دیا جن کے ذریعہ سے اس نے ہمارے حق کو زندہ کیا اور ہماری حجت کو واضح کیا۔ ان کے ذریعہ سے خدا نے ہماری حکومت کرائی اور تمھیں وہ کچھ دکھلا دیا جس کے تم منتظر تھے اور جس کا تمھیں زبردست اشتیاق تھا۔ خدا نے تم میں بنو ہاشم کا خلیفہ نمودار کر کے تمھارے چہروں کو سفید کر دیا اور تمھیں اہل شام کے خلاف فتح و نصرت بخشی[1] الخ" ابو جعفر منصور کہتا ہے۔ "اے اہل خراسان! تم ہماری جماعت، ہمارے مددگار اور ہمارے اہل دعوت ہو[2]" جاحظ کہتا ہے۔ "بنو عباس کی حکومت عجمی خراسانی تھی اور بنو مروان کی حکومت عربی اور بدویانہ تھی۔[3] بغداد میں باب دولت کو بابِ خراسان کے نام سے پکارا جاتا تھا کیونکہ دولتِ عباسیہ خراسان ہی سے آئی تھی[4]۔ منصور نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے کو یہ وصیت کی تھی کہ "میں تجھے اہلِ خراسان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ وہی تمھارے مددگار ہیں اور وہی تمھاری جماعت ہیں جنھوں نے تمھاری حکومت

---

[1] طبری صفحہ ۱۲۸ جلد ۹ [2] مسعودی صفحہ ۱۹۰ جلد ۲ [3] البیان والتبیین صفحہ ۲۰۶ جلد ۳ [4] مسعودی صفحہ ۱۸۳ جلد ۲

قائم کرنے کے لئے اپنے مالوں اور جانوں کو قربان کر دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں سے تمھاری محبت نکل نہیں سکتی۔ ان کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا، جو ان میں بدی پیشہ ہوں ان سے درگذر کرنا اور جو احسانات انھوں نے کئے ہیں ہمیشہ ان کا بدلہ کرتے رہنا۔ اگر کوئی ان میں سے مرجائے تو ان کے بال بچوں کی برابر خبر گیری کرتے رہنا۔[1]

اس کے بعد ایرانیوں کا غلبہ اور نفوذ بہت بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ مورخین نے اس عہد کی اہم خصوصیات میں سے ایرانی نفوذ کی قوت اور عربی نفوذ کی کمزوری کو گنایا ہے۔

لیکن عرب کس حد تک مغلوب ہو گئے تھے؟ کیا دولتِ عباسیہ میں ایرانیوں کا نفوذ اس نہج کا تھا جیسا کہ دولتِ امویہ میں عربوں کا نفوذ تھا؟ کیا اہلِ عرب اور موالی کا تصادم اس مقام پر ختم ہو گیا تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی واقع نہیں ہوئی۔ عباسی خلفار ہاشمی عرب تھے ــــ اگرچہ باپ کی طرف سے ہی عرب تھے ــــ وہ اس پر فخر کرتے اور اسے اپنے عظیم مناقب میں سے شمار کرتے تھے۔ انھوں نے اگرچہ ایرانیوں کی محنت اور کوشش کو ضرور یاد رکھا مگر وہ اپنی عربیت کو بھی نہیں بھول سکتے تھے۔ جس دن انھیں یہ احساس ہوا

---

[1] طبری صفحہ ۲۸۲ جلد ۹

کہ ایرانیوں نے سلطنت میں ان سے مزاحمت شروع کردی ہے۔ انھوں نے
ان کے خلاف فوراً کارروائی کی جیسا کہ منصور نے ابومسلم کے خلاف، رشید نے
برامکہ کے خلاف اور مامون نے فضل بن سہل کے خلاف۔ عباسی عہد کی ابتداء
میں ایرانیوں کو بڑا نفوذ حاصل ہوگیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب کبھی نہیں عربوں
کا اثر و نفوذ بالکل ختم ہوگیا تھا۔ بڑے سے بڑے مناصب مثلاً وزارت وغیرہ
ایرانیوں کے ہاتھ میں تھے لیکن خلیفہ عربی اور ہاشمی ہوتا تھا۔ ان کی فوجوں کے
کمانڈر جہاں ایرانی ہوتے تھے وہاں عرب بھی ہوتے تھے۔ ان کے گورنر جہاں
ایرانی تھے، عرب بھی تھے۔ منصور کی فوج چار حصوں میں منقسم تھی۔ یمنی، مضری
ربیعی اور خراسانی۔ جس دن مامون رشید نے پولیس کی امارت طاہر کے حوالہ
کی اسی دن بہت سے ہاشمیوں کو شام کے مختلف علاقوں کا حاکم بھی نامزد کیا۔[1]
منصور نے حرمین کی گورنری محمد بن خالد بن عبداللہ قسری کے حوالہ کی تھی۔[2] رشید
کے زمانہ میں مختلف شہروں کے جو امراء اور حکام تھے ان میں عرب بھی بہت سے
تھے۔ اس عہد میں جو عرب اُمراء اور کمانڈر زیادہ نامور ہوئے ان میں سے سعید
بن سلم باہلی، معن بن زائدہ شیبانی، ابودُلف عجلی، روح بن حاتم بن قبیصہ
مہلب ابن ابی صفرہ اور ثمامہ ابن اشرس اور دوسرے ان جیسے اور بھی بہت سے

---

[1] طیفور صفحہ ۶۲ [2] جہشیاری صفحہ ۱۳۶

قابلِ ذکر ہیں۔

ان امور کی موجودگی میں ہمیں یوں کہنا چاہیئے کہ عباسی انقلاب نے ایرانیوں کا پلڑا اتنا ضرور جھکا دیا تھا لیکن اس نے عربوں کے دوسرے پلڑے کو بالکل معدوم نہیں کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پورے عباسی دور میں عربوں اور ایرانیوں کی مزاحمت برابر قائم رہی۔ اب ہمیں اس مزاحمت کو مختصراً تلاش کرنا چاہیئے۔

اس عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ برابر عربی نسب اور عربی ولاء پر فخر کرنے کا رجحان رکھتے تھے حتیٰ کہ ہم خود ابومسلم خراسانی کو بھی دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے لیئے ایک عربی نسب گھڑ لیتا ہے۔ چنانچہ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سلیط بن عبداللہ بن عباس کی نسل سے ہے۔ کتاب الاغانی کا بیان ہے کہ اسحٰق موصلی — اس کو رشید کا کس قدر قرب حاصل تھا وہ سب جانتے ہیں ———— کی بحث رشید کی موجودگی میں ابن جامع کے ساتھ ہو گئی۔ دونوں کو تیزی آ گئی۔ ابن جامع نے اسحٰق کو گالی دیدی۔ اسحاق، خازم بن خزیمہ کے پاس گیا خازم عربی تھا ——— اور اسحاق نے خازم کا ولاء حاصل کیا اور اس کی طرف اپنی نسبت کی جسے خازم نے منظور کر لیا۔ تو اسحٰق نے یہ اشعار کہے۔ ؎

إِذَا كَانَتِ الْأَحْرَارُ أَصْلِيْ وَ مَنْصِبِيْ

وَ دَافِعُ ضَيْمِيْ خَازِمٌ وَ ابْنُ خَازِمٍ

عَطَسْتُ بِأَنْفٍ شَامِخٍ وَ تَنَاوَلَتْ

يَدَاىَ الثُّرَيَّا قَاعِدًا غَيْرَ قَائِمٍ

چونکہ شرفاء اور آزاد لوگ میری اصل اور میرا منصب ہیں اور مجھ سے مظالم کو دفع کرنے والے خازم اور خازم کے بیٹے ہیں تو میں اس احساس کے ساتھ) اونچی ناک کے ساتھ چھینکتا ہوں اور میرے ہاتھ بیٹھے بیٹھے بغیر کھڑے ہوئے ثریا کو پا لیتے ہیں۔

اس واقعہ سے وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ میں، —— ایرانی شرفاء کو بھی —— کسی عربی کی طرف وِلاء کے طور پر منسوب ہونے کی ضرورت پڑتی تھی۔ تاکہ وہ اس کی حمایت میں رہ سکے اور وہ اس کی طرف سے مدافعت کر سکے۔ اغانی ہی نے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے کہ علی بن الخلیل کا ایک ایرانی دوست تھا جو ایک مدت تک غائب رہا اور کافی دولت اور شان کے ساتھ واپس آیا۔ جب وہ کوفہ میں واپس آیا تو اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ بنو تمیم قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے تو علی بن الخلیل نے اس کی ہجو میں یہ اشعار کہے۔

يَرُوحُ بِنِسْبَةِ الْمَوْلَى

وَيُصْبِحُ يَدَّعِي الْعَرَبَا

فَلَا هٰذَا وَلَا هٰذَا

لَقَدْ يُدْرِي كُمْ إِذْ طَلَبَا

غلامی کی نسبت کے ساتھ جاتا ہے اور عرب ہونے کا مدعی بن جاتا
ہے۔ جب وہ طلب کرے گا تو اسے یہ ملے گی نہ وہ۔

حتّیٰ کہ یہاں تک کہدیتا ہے۔

يَشُمُّ الشِّيحَ وَ الْقَيْصُوْ
مَ كَيْ يَسْتَوْجِبَ النَّسَبَا
مُضَاهٍ تَشَبُّهًا بِالْقَوْ
مِ جِلْفًا جَانِبًا جَشِبًا
إِذَا ذُكِرَ الْبَرِيْرُ بَكَى
وَ أَبْدَى الشَّوْقَ وَالطَّرَبَا
وَ لَيْسَ ضَمِيْرُهٗ فِي الْقَوْ
مِ إِلَّا التِّيْنَ وَ الْعِنَبَا

شیح اور قیصوم (دو درختوں کے نام ہیں) کو سونگھتا پھرتا ہے تاکہ
نسب کو حاصل کرلے۔ ایک قوم کی مشابہت میں وہ کمینہ، ذلیل اور
جفاکار بن گیا ہے۔ جب (اراک کے (درخت) کے ابتدائی پھل کا تذکرہ کیا
جاتا ہے تو رونے لگتا ہے اور بڑا شوق اور بڑی خوشی ظاہر کرتا ہے حالانکہ
قوم میں اس کا دل سوائے ترنجبین اور انگور کے کسی اور پھل کو نہیں چاہتا[1]۔

---

[1] یہ پورا قصیدہ اغانی میں موجود ہے ایک دوسرا قصیدہ بھی موجود ہے جس کا مضمون بھی یہی ہے (۱۵/۱۱۳)

ایک دوسرے مقام پر نقل کرتے ہیں کہ والبہ بن الحباب عربی نسب کا مدعی تھا تو اس کے بارہ میں ابوالعتاہیہ نے کہا تھا۔

أَوَالِبُ أَنْتَ فِي الْعَرَبِ ۔۔۔ كَمِثْلِ الشِّيصِ فِي الرُّطَبِ
هَلُمَّ إِلَى الْمَوَالِي الصِّيدِ فِي سَعَةٍ وَفِي رُحَبِ
فَأَنْتَ بِنَا لَعَمْرُ اللهِ أَشْبَهُ مِنْكَ بِالْعَرَبِ

اے والبہ! تو عربوں میں ایسا ہی ہے جیسے عمدہ اور تازہ کھجوروں میں ایک ردی کھجور ہوتی ہے۔ غلاموں کو دیکھو، کس وسعت و فراخی میں شکار کھیلتے ہیں۔ خدا کی قسم تو ہمارے لئے عربوں سے زیادہ مشابہ ہے۔[1]

ایسے ہی کسی آدمی نے عربوں کی طرف اپنے کو منسوب کیا تو بشار نے کہا۔

اُرْفُقْ بِعَمْرٍو إِذَا حَرَّكْتَ نِسْبَتَهُ
فَإِنَّهُ عَرَبِيٌّ مِنْ قَوَارِيرِ

عمرو کے نسب کے متعلق جب الٹ پلٹ کرنے لگو تو ذرا نرمی کا برتاؤ کرنا کیونکہ وہ کانچ کا بنا ہوا عربی ہے۔

نیز اسی شخص کے بارہ میں کہتا ہے ؎

---

[1] یہ قصیدہ اغانی میں موجود ہے صفحہ ۱۴۹ جلد ۱۶

إِنَّ عَمْرًا فَاعْرِفُوهُ عَرَبِيٌّ مِنْ زُجَاجِ
مُظْلِمُ النِّسْبَةِ لَا يُعْرَفُ إِلَّا بِالسِّرَاجِ

عمرو کو اچھی طرح پہچان لو وہ کانچ کا بنا ہوا عربی ہے۔ جس کی نسبت تاریک ہو اسے چراغ کی مدد سے ہی پہچانا جا سکتا ہے۔

مخلد موصلی کہتا ہے۔

أَنْتَ عِنْدِي عَرَبِيٌّ لَيْسَ فِي ذَاكَ كَلَامُ
عَرَبِيٌّ عَرَبِيٌّ عَرَبِيٌّ، وَالسَّلَامُ!!
شَعْرُ أَجْفَانِكَ قَيْصُومٌ وَشِيحٌ وَثُمَامُ

تو میرے نزدیک عربی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ عربی ہے عربی ہے۔ عربی ہے۔ والسلام لیکن تیری پلکوں کے بال قیصوم، شیح اور جھاؤ کے پتے معلوم ہوتے ہیں[۵]۔

اگر اس عہد میں عرب اس قدر ذلیل ہو چکے تھے اور ان کی شان اتنی حقیر ہو چکی تھی جیسا کہ مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتی ہے تو کیا یہ ـــــ عربوں کی طرف منسوب ہونے اور اس طرح عزت حاصل کرنے کا ـــــ رجحان اس حد تک پہنچ سکتا تھا؟

۵۔ محاضرات الادباء صفحہ ۲۲۲ جلد ۱ و رابعہ

البتہ یہ ضرور ہے کہ اس دور میں اس عربیت کے رجحان کے ساتھ ساتھ ہی اس کے مقابلہ میں ایرانیت کا ایک دوسرا رجحان بھی موجود تھا اور جو اب تک نہایت ہی پست آواز میں اسماعیل بن یسار جیسے لوگوں کی زبان سے بنو امیہ کے عہد میں سنائی دیتی تھی اب وہ نہایت سخت، قوی اور آزادانہ سنائی دینے لگی تھی۔ چنانچہ بشار جو اس رجحان کا نمایندہ ہے ایک مرتبہ خراسان پر فخر کرتا ہوا کہتا ہے۔

وَ هَجَانِیْ مَعْشَرٌ کُلُّهُمْ

حُمُقٌ، دَامَ لَهُمْ ذَاكَ الْحُمُقُ

لَیْسَ مِنْ جُرْمٍ، وَلٰکِنْ غَاظَهُمْ

شَرَفِیْ الْعَارِضُ قَدْ سَدَّ الْاُفُقْ

مِنْ خُرَاسَانَ، وَبَیْتِیْ فِی الذُّرٰی

وَ لَدَی الْمَسْعَاةِ فَرْعِیْ قَدْ سَمَقْ

ایک جماعت نے میری مذمت کی ہے مگر وہ سب کے سب بیوقوف ہیں جن کی حماقت ہمیشہ بدستور رہتی ہے۔ میرا کوئی جرم نہیں مگر میرے چھا جانے والے شرف نے جس نے تمام اُفق کو پُر کر دیا ہے انھیں جلا دیا ہے۔ میرا وہ شرف خراسان سے متعلق ہے اور میرا گھرانا بہت بلند مرتبہ ہے۔ میرا خاندان ستاروں تک بلندی میں جا پہنچا ہے

نیز ایک مرتبہ وہ عجم پر فخر کرتا ہوا کہتا ہے۔

وَ نُبِّئْتُ قَوْمًا بِهِمْ جِنَّةٌ

يَقُوْلُوْنَ مَنْ ذَا؟ وَكُنْتُ الْعَلَمْ!

اَلَا اَيُّهَا السَّائِلِيْ جَاهِدًا

لِيَعْرِفَنِيْ، اَنَا اَنْفُ الْكَرَمْ!

نَمَتْ فِي الْكِرَامِ بَنِيْ عَامِرٍ

فُرُوْعِيْ وَ اَصْلِيْ قُرَيْشُ الْعَجَمْ!

مجھے کچھ لوگوں کے متعلق بتایا گیا ہے جنھیں جنون ہو گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں — یہ کون ہے؟ اور میں ہی ان کا نشانہ ہوتا ہوں۔ میرے متعلق کوشش کر کے پوچھنے والے کو مجھے پہچان لینا چاہیئے کہ میں شرافت کی ناک ہوں۔ میرے خاندان نے شرفا یعنی بنو عامر میں نشوونما پائی ہے اور میری اصل و بنیاد عجم کے قریش ہیں۔

وہ یہ سب کچھ خلیفہ مہدی کے سامنے کہتا ہے اور وہ اسے کوئی سرزنش نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہشام نے ابن یسار کو سرزنش کی تھی بلکہ اس سے مزید پوچھتا ہے کہ تم عجم کے کس خاندان سے ہو؟ تو وہ کہتا ہے کہ میں عجم کے اس خاندان سے ہوں جس میں سب سے زیادہ شہسوار ہیں اور جو بہادروں پر بڑا ہی بھاری ہے۔ میں اہل طخارستان میں سے ہوں بلکہ وہ تو ولاء کی نسبت سے بھی انکار کرتا تھا

اور کہتا تھا۔

أَصْبَحْتُ مَوْلَى ذِي الْجَلَالِ وَبَعْضُهُمْ
مَوْلَى الْعُرَيْبِ، فَخُذْ بِفَضْلِكَ فَافْخَرِ
مَوْلَاكَ أَكْرَمُ مِنْ تَمِيمٍ كُلِّهَا
أَهْلِ الْفَعَالِ وَمِنْ قُرَيْشِ الْمَشْعَرِ
فَارْجِعْ إِلَى مَوْلَاكَ غَيْرَ مُدَافَعٍ
سُبْحَانَ مَوْلَاكَ الْأَجَلِّ الْأَكْبَرِ

میں خدائے ذو الجلال کا مولی (آزاد کردہ غلام) ہوں جبکہ بعض لوگ عربچیوں کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ تو اپنی اس فضیلت کو لے اور اس پر فخر کر۔ تیرے آقا سارے بنو تمیم ــ اہل کردار ــ سے اور مشعر الحرام کے قریش سے زیادہ شریف ہے تو اپنے آقا کی طرف رجوع کر جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تیرا آقا پاک ہے جو سب سے بزرگ تر اور سب سے بڑا ہے۔

بلکہ وہ غلاموں کو دعوت دیتا تھا کہ عربوں کا وِلاء ان کو واپس کر دیں چنانچہ اغانی کا بیان ہے کہ بنو زید شریف میں سے کسی آدمی نے بشار سے کہا۔ "اے بشار! تو نے ہمارے غلاموں کو بھی بگاڑ دیا ہے تو انھیں اس کی دعوت دیتا ہے کہ وہ ہمارا ولاء چھوڑ دیں اور دوبارہ اپنے اصلی خاندانوں کی طرف اپنی نسبت کریں

اور عربی ولاء کو خیرباد کہہ دیں۔ حالانکہ نہ تیرا خاندان کچھ زیادہ صاف ہے اور نہ تو معروف الاصل ہے!" بشار نے جواب دیا۔ بخدا میرا خاندان سونے سے زیادہ خالص ہے اور میرا نسب ابرار کے اعمال سے زیادہ پاکیزہ تر ہے۔ زمین میں کونسا کتا ہوگا جو اپنا نسب چھوڑ کر تیرا نسب اختیار کرے گا! کسی عربی نے اس سے کہہ دیا کہ غلاموں کو شعر سے کیا نسبت؟ تو بشار نے عربوں کی ہجو میں کہا۔

أَحِيْنَ كُسِيْتَ بَعْدَ الْعُرْيِ خَزًّا

وَ نَادَمْتَ الْكِرَامَ عَلَى الْعُقَارِ

تُفَاخِرُ يَا ابْنَ رَاعِيَةٍ وَ رَاعٍ

بَنِي الْأَحْرَارِ، حَسْبُكَ مِنْ خَسَارِ

تُرِيْغُ بِخُطْبَةٍ كَسْرَ الْمَوَالِيْ

وَ يُنْسِيْكَ الْمَكَارِمَ صَيْدُ فَارِ

وَ كُنْتَ إِذَا ظَمِئْتَ إِلَى قُرَاحٍ

شَرِكْتَ الْكَلْبَ فِيْ وَلْغِ الْإِطَارِ

وَ تَغْدُوْ لِلْقَنَافِذِ تَدَّرِيْهَا

وَ لَمْ تَعْقِلْ بِدُرَّاجِ الدِّيَارِ

وَ تَتَّشِحُ الشِّمَالَ لِلَابِسِيْهَا

وَ تَرْعَى الضَّأْنَ بِالْبَلَدِ الْقِفَارِ

ـله الاغانی صفحہ ۱۵ جلد ۳

کیا اب جبکہ عریانی کے بعد تجھے خز کا لباس پہنا دیا گیا ہے اور شراب کی محفل میں تو شریف لوگوں کے ساتھ بیٹھنے لگا ہے۔ اے چرواہوں اور چرواہنیوں کی اولاد تو شرفار کی اولاد پر فخر کرتا ہے۔ کتنے بڑے خسارہ کی بات ہے۔ تو موالی کی طاقت کو ایک غلبہ سے توڑ دینا چاہتا ہے حالانکہ چوہوں کے شکار کا شغلہ تجھے شرافت کے کاموں کی کب مہلت دیتا تھا۔ جب تجھے پانی کی پیاس لگتی تھی تو گھر کے سامنے کے جوہڑ سے کتوں کے ساتھ ہی تو پانی پی لیتا تھا۔ تو عود بلاد کے شکار میں پنیترے بدلا کرتا تھا۔ تجھے شہری تیتروں کا شعور بھی نہیں تھا شمالی ہوائیں ہی اپنے پہننے والوں کا لباس بن جایا کرتی تھیں (کپڑوں کے بجائے) اور تو تو بنجر میدانوں میں بھیڑیں چرایا کرتا تھا۔

بشار کے اس طرح اور بھی بہت سے اشعار ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب دشمنی کے رجحان کا یہ نمائندہ تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے اور اس جیسے لوگوں کو ـــــ عربوں کی ہجو کرنے کی ـــــ کس قدر چھٹی مل گئی تھی۔ بنو امیہ کے عہد میں وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اس زمانہ میں لوگ بکثرت کسریٰ کی طرف بھی نسبتیں کرنے لگے تھے حتیٰ کہ جحظہ نے کہا تھا ؎

وَ اَهْلُ القُرَىٰ كُلُّهُمْ يَنْتَمُوْ

نَ لِكِسْرَىٰ ادِّعَاءً ! فَاَيْنَ النَّبِيْطُ؟

شہری باشندے سب کے سب دعوے کر کے کسرٰی کی طرف نسبت کرتے ہیں؛ ان نبطیوں کی کیا حیثیت ہے؟
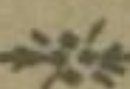
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عباسیوں کے ابتدائی دور میں ایرانیوں کا اثر و نفوذ بہت بڑھ گیا تھا اور دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

اموی عہد میں شاذ و نادر موالی کو کوئی بڑی خدمت سونپی جاتی تھی جس پر لوگ ناگواری محسوس کرتے تھے۔ امویوں نے مثلاً رجا بن حیوہ سے جو کندہ کے غلام تھے ـــــ کام لیا ہے۔ عمر بن عبد العزیز نے ایک غلام کو گورنر بنا دیا تھا۔ اسے وادی القریٰ کا گورنر بنایا گیا تھا۔ مگر لوگ اس پر ناراض ہو گئے تھے۔ لیکن جو چیز اموی عہد میں شاذ و نادر ہوا کرتی تھی وہ عباسی عہد میں روزانہ کی پریکٹس ہو گئی تھی۔ منصور نے بکثرت غلاموں کو بڑی بڑی خدمات پر مامور کیا۔ سیوطی کہتے ہیں کہ منصور پہلا خلیفہ ہے جس نے سب سے پہلے موالی کو بڑی خدمات پر مامور کیا اور عربوں پر انھیں ترجیح دی۔ منصور کے بعد یہ بات بہت بڑھ گئی حتیٰ کہ عربوں کی ریاست اور قیادت ہی ختم ہو گئی۔[1]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ منصور سے پہلے خلفائے بنو امیہ نے کسی غلام کو

---

[1] تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۰۵

کوئی ذمہ دارانہ خدمت کبھی سونپی ہی نہیں تھی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ منصور نے غلاموں کو ذمہ دارانہ خدمات حوالہ کرنا اپنی حکومت کی پالیسی ہی بنا لیا تھا اور انھیں عربوں کے سروں پر سوار کر دیا تھا۔ اس معنی میں یہ امر سب سے پہلے منصور ہی سے سرزد ہوا۔ جہشیاری نے اپنی کتاب تاریخ الوزراء میں بیان کیا ہے جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ منصور کے زیادہ تر امراء اور والی یہی غلام تھے[1]۔ مسعودی منصور کے بارہ میں کہتا ہے کہ

"وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے اپنے موالی اور غلاموں کو گورنر بنایا اور ان سے اپنی مہمات میں کام لیا اور عربوں پر انھیں ترجیح دی۔ منصور کے بعد دوسرے خلفاء نے — جو اس کی اولاد ہی میں سے تھے — یہی اپنا طریقہ بنا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کا تنزل شروع ہو گیا اور وہ برباد ہو گئے"[2]

طبری بیان کرتے ہیں کہ منصور کا ایک خادم تھا جو زرد رو مائل بہ گندمی رنگ تھا۔ بڑا ماہر تھا اور قابل اعتماد تھا۔ منصور نے ایک دن اس سے دریافت کیا۔ "تم کس جنس سے ہو؟" اس نے کہا "اے امیر المومنین میں عربی الاصل ہوں" منصور نے پوچھا کہ "عربوں کے کس خاندان سے ہو؟" اس نے بتایا کہ میں قبیلۂ خولان سے ہوں۔ مجھے یمن سے گرفتار کیا گیا۔ مجھے ہمارے ایک

---

[1] ملاحظہ ہو جہشیاری صفحہ ۱۳۹-۱۵۳-۱۵۵-۱۵۷ [2] مسعودی صفحہ ۱۴۱ جلد ۲-

دشمن نے لے لیا اور خصی کرا دیا پھر مجھے غلام بنا لیا گیا۔ کچھ دنوں تک میں بنو امیہ کے کچھ لوگوں کے پاس بھی رہا۔ اس کے بعد آپ کے پاس آ گیا۔" منصور نے کہا تم بہت ہی اچھے غلام ہو۔ لیکن میرے محل میں کوئی عربی شخص داخل نہیں ہو سکتا جو میرے حرم کی خدمت بھی کرے۔ جاؤ۔ خدا تمھیں عافیت کے ساتھ رکھے۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔[۱] اغانی کا بیان ہے کہ ابو نخیلہ ابو جعفر منصور کے دروازہ پر کھڑے تھے۔ اس نے ملاقات کی اجازت چاہی مگر وہ تو اندر نہیں پہنچ سکے۔ البتہ خراسانی لوگ برابر آتے جاتے اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک بوڑھا جاہل اعرابی کھڑا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ ٹھٹھا کرتے تھے۔ ایک آدمی نے انھیں پہچان لیا اور ان سے دریافت کیا۔ ابو نخیلہ آپ کیسے ہیں؟ تو ابو نخیلہ نے یہ شعر پڑھے۔

أَصْبَحْتُ لَا يَمْلِكُ بَعْضِي بَعْضَا

تَشْكُو الْعُرُوقُ الْأَبِضَاتُ أَبْضَا

كَمَا تَشَكَّى الْأَرْحَبِيُّ الْقَرْضَا

كَأَنَّمَا كَانَ شَبَابِي قَرْضَا

میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ میرے جسم کے بعض اعضاء دوسرے اعضاء کے قابو میں نہیں رہے خشک رگیں تھکن محسوس کرتی ہیں جیسا کہ

---

[۱] طبری ص ۳۱۶ جلد ۹

گویا کہ میری جوانی کوئی قرض تھی (جو قرضخواہ نے لے لی)

اسی آدمی نے اس سے پوچھا۔ "اس حکومت میں تم اپنی حالت کو کیسا پاتے ہو؟"

ابونخیلہ نے کہا

أَكْثَرُ خَلْقِ اللهِ مَنْ لَا يُدْرَىٰ

مِنْ أَيِّ خَلْقِ اللهِ حِيْنَ يُلْقَىٰ؟

وَحُلَّةٍ تُنْشَرُ ثُمَّ تُطْوَىٰ

وَطَيْلَسَانٌ يَشْتَرِىٰ فَيَغْلَىٰ؟

لِعَبْدٍ عَبْدٍ أَوْ لِمَوْلَىٰ مَوْلَىٰ

يَا وَيْحَ بَيْتِ الْمَالِ مَاذَا يَلْقَىٰ؟

خدا کی بہت سی مخلوق ایسی ہے کہ جب ان سے ملا جاتا ہے تو ان کے متعلق پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کی کونسی مخلوق سے ہیں۔ خلعت شاہی کے جوڑے پھیلائے جاتے ہیں، لپیٹے جاتے ہیں، چادریں خریدی جاتی ہیں اور گراں قیمت خریدی جاتی ہیں مگر کس کے لئے؟ — غلام کے غلام یا آزاد کردہ غلام کے لئے — ہائے افسوس اے بیت المال (خزانۂ حکومت) تجھے کیا دن دیکھنا پڑے ہیں[1]

---

[1] اغانی صفحہ ۱۴۸، جلد ۱۸

لیکن ان سب باتوں کے باوجود منصور نے بعض عربوں کو بھی ذمہ دارانہ خدمات پر مامور کیا۔ چنانچہ مسلم بن قتیبہ باہلی کو اس نے بصرہ کا گورنر مقرر کیا تھا اگرچہ اس کے ساتھ بصرہ کے علاقہ اور اُبلہ کا گورنر ایک غلام کو بنایا تھا[1]۔ اس سے پہلے آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ابوجعفر کی فوج عربوں اور عجمیوں دونوں پر مشتمل تھی۔

جب رشید کا زمانہ آیا تو برامکہ کی فضیلت کی وجہ سے ایرانیوں کا اثر و نفوذ اور بھی بڑھ گیا۔ برامکہ ہی حکومت اور حالات حکومت میں مختار مطلق بنے ہوئے تھے۔ ان کے اثر و نفوذ کے ساتھ ساتھ ان کی جنس کا اثر و نفوذ بھی بڑھتا چلا گیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے ایک مضبوط پالیسی بنائی تھی۔ چنانچہ اس پالیسی کا ایک جزو وہ تھا جو طبری نے بیان کیا ہے کہ "فضل بن یحیٰی برمکی نے خراسان میں ایرانیوں کی ایک فوج بنائی اور اس فوج کا نام "عباسیہ" رکھا۔ ان کا ولاء عباسیوں کے لئے تھا۔ ان کی تعداد پانچ لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔ اس فوج میں سے بیس ہزار جوان خود بغداد میں آگئے تھے۔ بغداد میں ان کو "کرنبیہ" کہتے تھے۔ باقی لوگ خراسان ہی میں رہے وہاں ان کا نام عباسیہ ہی تھا اور ان کے دفاتر بھی وہیں تھے[2]۔ اسی طرح ان کا اثر و نفوذ مامون کے عہد میں اور بھی بڑھتا گیا کیونکہ اس واقعہ میں ایرانیوں کو دوسری فتح حاصل ہوئی تھی۔ پہلی فتح وہ تھی جو عباسیوں اور امویوں کی جنگ میں انھیں پہلے

---

[1] عیون الاخبار صفحہ ۲۹۰ جلد ۱ [2] طبری صفحہ ۶۳ جلد ۱۰۔ اس اثر و نفوذ کے اضافہ میں ولاء کی ایک نئی قسم نے اور بھی مدد پہنچائی جو اسی عہد میں ملتا ہے۔ بنو امیہ کے عہد میں اس ولاء کا نام

(باقی صفحہ اگلا دیکھئے)

ہی حاصل ہو چکی تھی۔ کیونکہ ایرانی ہی زیادہ تر عباسیوں کے ہواخواہ تھے۔ اس دوسری جنگ میں جو مامون اور امین کے درمیان ہوئی تھی ایرانیوں کو دوسری فتح نصیب ہوئی۔ کیونکہ زیادہ تر ایرانیوں نے مامون الرشید کا ساتھ دیا تھا اور ان میں مامون کے لئے تعصب تھا جبکہ زیادہ تر عربوں نے امین کا ساتھ دیا تھا۔ لہذا مامون کی فتح دراصل ایرانیوں کی فتح و نصرت شمار ہوئی۔ طیفور اپنی تاریخ میں بیان کرتا ہے کہ ایرانی لوگ ترکش اور کمانیں لیئے ہوئے مامون کے سامنے سے ہو کر گذر جاتے تھے۔

(صفحہ سابقہ کا بقیہ فٹ نوٹ) نشان نہیں تھا ورنہ اس سے پہلے یہ ولاء کہیں نظر آتا ہے۔ ولاء کی یہ قسم ولاء کی ان تمام انواع سے الگ تھی جن کو ہم فجر الاسلام میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں اس نئے ولاء کا نام ابن خلدون نے "ولاء الاصطناع" رکھا ہے۔ (ابن خلدون صفحہ ۱۱۴ ج ۱) اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ خلیفہ ایرانیوں کی کسی قوم کو مخصوص کر لیتا تھا یا ترکوں کی کسی قوم کو اور انھیں یہ اجازت دیتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خود خلیفہ یا حکومت کی طرف منسوب کر لیں۔ ان سے وہ مہمات ملکی اور جنگ وغیرہ میں کام لیتا تھا۔ ان کو تنخواہیں دی جاتی تھیں اور یہ خلیفہ کے یا حکومت کے موالی کہلاتے تھے۔ جیسا کہ ابتدائی خلفائے عباسیہ نے بنو برمک اور بنو بخت (ایرانیوں) کے ساتھ کیا تھا۔ ان کو دولت عباسیہ کے مَوالی کہا جاتا تھا۔ یا جیسا کہ معتصم نے ترکوں کے ساتھ کیا تھا۔ یہ چیز ہمیں بنو امیہ کی سلطنت میں نہیں ملتی۔ اس معنی میں بنو امیہ کی حکومت کے موالی نہیں ہوتے تھے ___ جہاں تک مجھے معلوم ہے ___ اس قسم کے ولاء نے اوّلاً ایرانیوں کا اثر و نفوذ بڑھایا اور ان کے بعد ترکوں کا۔ کیونکہ ان کی تعداد اور قوت دن بدن

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

طبریؔ[1] کا بیان ہے کہ شام میں ایک آدمی بار بار مامون کے سامنے آیا اور کہا اے امیر المومنین خراسان کے ایرانی تو آپ نے دیکھے ہیں ذرا شام کے عربوں کو بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ مامون نے کہا۔ شامی بھائی! تو نے بڑے اصرار سے کام لیا ہے۔ خدا کی قسم میں نے قبیلہ قیس کے کسی آدمی کو گھوڑے کی پشت سے نہیں اتارا مگر محض اس وقت جب میں نے دیکھا کہ میرے خزانہ میں ایک درہم بھی باقی نہیں رہا۔ رہ گیا یمن تو نہ مجھے کبھی اس سے محبت ہوئی اور نہ یمن والوں کو مجھ سے۔ رہ گیا قضاعہ تو اس کے سردار تو سفیانی کے خروج کے منتظر ہیں۔ تو بھی اس کے مددگاروں ہی میں سے ہوگا۔ رہ گیا ربیعہ تو وہ تو اس وقت سے خدا سے ناراض ہے جب سے اس نے اپنا نبی مضر کے قبیلہ سے مبعوث کر دیا تھا۔ جب بھی دو آدمی نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک ناراض ہی نکلتا ہے۔ خدا تیرا ستیاناس کرے اب دور ہٹ جا۔[2]

جب معتصم کا زمانہ آیا تو اس نے ایرانیوں کی جگہ ترکوں کو دیدی اور ترکوں کے

(صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) بڑھتی جاتی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت انہی کی حکومت ہے اور رعیت پر انھیں ایک قسم کا تسلط حاصل ہے جو ان کے خلیفہ کے تسلط[3] سے ان کو حاصل ہوا ہے۔ طبری کے بیان میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس قسم کے موالی جو عباسیوں کے موالی کہلاتے تھے ایک زمانہ میں پانچ لاکھ تھے۔ یہ موالی ان غلاموں سے الگ تھے جو قید کر کے غلام کئے جاتے تھے۔ ملاحظہ کیجئے کہ عرب بیچارے کس طرح ان غلاموں کے بوجھ کے نیچے دب چکے تھے۔

[1] تاریخ بغداد طیفور صفحہ ۱۰ [2] طبری صفحہ ۲۹۶ جلد ۱۰

ذریعہ سے اسی نے عربوں اور ایرانیوں دونوں کا بندوبست کر دیا۔ یہ چیز عباسی حکومت کے دورِ ثانی پر گفتگو کرتے ہوئے واضح ہو جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔
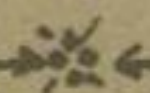
مَوالی اور خصوصًا ایرانیوں کے اثر و نفوذ کے چند مظاہر تھے۔

(۱) خلفاء کے محلات مَوالی اور غلاموں سے بھر گئے تھے۔ جن سے مختلف کاموں میں خدمت لی جاتی تھی۔ حرم خاص کے محلات خصی شدہ غلاموں سے بھرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے یہ رسم بیزنطینیوں سے لی۔ عربوں میں یہ طریقہ عام طور سے رائج نہیں تھا۔

(۲) بڑی بڑی خدمات مثلاً وزارت وغیرہ ایرانیوں سے مخصوص ہو گئی تھیں۔

(۳) ایرانی عادات و رسوم کا مسلمانوں میں نفوذ مثلاً نوروز کا دن منانا۔ او سر پر ٹوپی پہننا

(۴) ایرانی تہذیب کا پھیل جانا۔ اس موضوع پر ہم ایک الگ باب میں گفتگو کریں گے۔
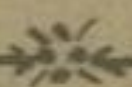
مقابلہ کی صورتیں غلاموں کی اس قوت اور اثر و نفوذ کے سامنے عربوں نے ہتھیار نہیں ڈال دیئے بلکہ انھوں نے

اس کا مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ کبھی شدت اختیار کر لیتا تھا اور کبھی خفیف ہو جاتا تھا۔
اس مقابلہ کی صورتیں مختلف تھیں۔ مثلاً بعض اوقات یہ مقابلہ خلیفہ کے کان بھرنے
کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ چنانچہ عرب غلاموں کے خلاف سازشیں کرتے اور
غلام عربوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وقتاً فوقتاً خلفا
اپنے وزیروں پر گرفت کرتے رہتے اور انھیں سزائیں دیتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ
کسی شاعر کو کہہ دینا پڑا ۔

اِنَّ الوَزیرَ وزیر ال محمد
اُودی ، فمن یشناک کان وزیرًا

بلاشبہ وزیر تو آل محمد کے وزیر ہیں جو ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔
لہٰذا جو تجھے عیب لگائے گا وزیر ہو جائے گا۔

وزیروں کی پوری تاریخ دراصل سزاؤں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ کوئی بعید
نہیں کہ ان سزاؤں کی وجہ زیادہ تر خلفاء کا ـــــ ان سازشوں کے ماتحت ـــ
ـــــ یہ احساس ہی ہوتا ہو کہ ایرانیوں کا نفوذ و اثر بڑھتا اور ان کا تسلط طاقت
پکڑتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اکثر معاملات میں خلیفہ سے استصواب کئے بغیر خود
ہی فیصلے صادر کر دیتے تھے۔ چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ " ہارون رشید
نے برامکہ پر اس لئے گرفت کی تھی کہ وہ حکومت پر بُری طرح چھا گئے تھے اور
بیت المال میں جو کچھ اموال وصول ہوتے تھے انھیں وہ خلیفہ سے چھپاتے

تھے۔ ہارون رشید اگر تھوڑا سا مال طلب کرتا تھا تو وہ بھی اسے نہیں ملتا تھا یہ لوگ اس کی حکومت پر غالب آ گئے اور حکومت میں اس کے شریک و سہیم بن گئے تھے۔ بلکہ امور سلطنت میں اس کا کوئی تصرف ہی باقی نہیں رہا تھا۔ خود ان کے آثار کی عظمت بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی شہرت دور دور تک پہنچتی جا رہی تھی۔ حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدے ان رؤساء سے پُر ہو چکے تھے جو خود ان برامکہ کی اولاد یا ان کے احسانمندوں میں سے تھے۔ کسی دوسرے شخص کو کوئی عہدہ آسانی سے میسر نہیں آتا تھا۔ وزارت، کتابت، قیادت، حجابت سیف اور قلم غرضکہ تمام ذمہ داریاں برامکہ اور ان کے وابستگان ہی میں بٹ گئی تھیں۔" ابن خلدون کہتا ہے کہ " برامکہ کی وہ مدحیں کی گئی ہیں جو خود ان کے خلفاء کی نہیں کی گئیں۔ وہ اپنے ہوا خواہوں کو بڑے بڑے انعامات اور بخششوں سے نوازتے رہتے تھے۔ تمام آبادیاں اور تمام زمینداریوں پر یہی لوگ چھائے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی اس روش نے خلیفہ کے خصوصی رازداروں تک کو آزردہ اور خواص کو حسد کا شکار کر دیا..... چنانچہ منافست اور حسد کی گرم بازاری ہوئی اور چغلیوں کے بچھوان کے بستروں کے نیچے پھیل گئے۔ حتیٰ کہ بنو قحطبہ ــــ خود جعفر کے ماموں ــــ ان کے خلاف سب سے بڑے چغلخور ثابت ہوئے[1]۔

---

[1] مقدمہ صفحہ

مامون رشید کے روبرو نعیم بن حازم عربی فضل بن سہل ایرانی سے دوبدو ہوتا ہے جبکہ فضل اس رائے کی خوبیاں بیان کرتا ہے کہ خلافت کو علویوں کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ تو نعیم فضل سے کہتا ہے۔ "تو چاہتا ہے کہ بنو عباس سے خلافت کو ختم کر کے علی کی اولاد میں پہنچا دے، پھر اُن کے خلاف سازش کر کے حکومت کو آخر الامر کسرا دی بنا ڈالے"[1]۔

ایرانیوں میں سے جو لوگ بڑے بڑے مناصب پا لیتے تھے وہ حتی الامکان عربوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے تھے۔ جیسا کہ افشین اور ابودُلف عجلی کے واقعہ میں صاف نظر آتا ہے۔ افشین "اشروسنہ" کا ایک عجمی تھا۔ اشروسنہ ایشیا ر کوچک کا ایک شہر ہے۔ وہ خلیفہ معتصم کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ اسے عربوں سے شدید نفرت تھی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ "مجھے جب بھی عربوں پر قابو حاصل ہو گا تو ان کے رئیسوں کے سروں کو گرزوں سے کچل ڈالوں گا"۔ اس کا تذکرہ آئندہ بھی آئے گا جہاں ہم زندقہ پر گفتگو کریں گے۔ ابودُلف عجلی قبیلۂ نزار سے ایک عربی النسل آدمی تھا۔ اس کی زندگی عربوں جیسی زندگی تھی۔ سخی، بہادر اور ممدوح تھا۔ اس کا دروازہ شعراء ادباء اور ضرورتمندوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اور اس کے اموال ان لوگوں پر

---

[1] جہشیاری صفحہ ۳۹۷

برابر تقسیم ہوتے رہتے تھے۔ یہ بھی معتصم کے کمانڈروں میں سے ایک کمانڈر تھا اپنے خاندان کا بزرگ اور اپنے قبیلۂ عجل اور ربیعہ وغیرہ کا رئیس تھا۔ خود نہایت عمدہ شاعر، بہادر، پہلوان، اور مغنی تھا۔[1]

تنوخی اپنی کتاب "الفرج بعد الشدۃ" میں بیان کرتا ہے کہ افشین نے ابودُلف کو قتل کر ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ اور اسے قتل کر دینے کے لئے افشین کے روبرو کھال پر بٹھا دیا گیا۔ افشین اسے برابر دھمکیاں دے رہا اور نہایت غصہ کے ساتھ خطاب کر رہا تھا۔ وہ قتل کا حکم دینے والا ہی تھا کہ احمد بن ابی داؤد (یہ عربی النسل تھا اور مامون معتصم کی طرف سے قاضی تھا) کو اس کی خبر لگی۔ وہ بھاگم بھاگ افشین کے پاس پہنچا اور اجازت لئے بغیر ہی اندر گھس گیا کیونکہ اُسے اندیشہ تھا کہ اتنے عرصہ میں ابودُلف کا کام تمام نہ ہو جائے۔ احمد بن ابی داؤد، افشین سے کہتا ہے۔ ابودُلف عرب کا شہسوار اور نہایت شریف آدمی ہے اس کو معاف کر دے اور اس پر احسان کر۔ اگر تو اسے قابل نہیں سمجھتا تو پورے عرب کی خاطر اسے معاف کر دے۔ تم جانتے ہو کہ ایران کے شہنشاہ ہمیشہ عرب بادشاہوں پر احسان کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ کسریٰ نے نعمان پر بھی احسان کیا تھا اور اسے بادشاہ بنا دیا تھا۔ تو آج انہی ایرانی شہنشاہوں کی یادگار

---

[1] مسعودی صفحہ ۷۷ ج ۲

یادگار ہے۔ لہذا عرب کے ایک شریف آدمی کو معاف کر کے اس پر احسان فرما۔ مگر افشین اس سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ آخر ابن ابی داؤد کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ معتصم کے نزدیک اس کا اپنا کیا مرتبہ ہے حتیٰ کہ وہ خود اس کی طرف سے بھی بات کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ افشین سے کہتا ہے کہ اچھا سنو۔ مجھے امیرالمومنین نے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ امیرالمومنین کا ارشاد ہے کہ قاسم بن عیسیٰ (ابو دلف) کے بارہ میں تم کوئی قدم نہ اٹھاؤ۔ اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو یاد رہے اس کے بدلہ میں خود تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔ یہ کہہ کر ابن ابی داؤد سیدھا معتصم کے پاس پہنچا اور اسے واقعہ کی اطلاع دی۔ معتصم نے ابن ابی داؤد کے پیغام کی تصدیق کی۔ اور اس طرح ابو دلف نے جو عربوں کا سردار تھا، عجمیوں کے سردار افشین سے نجات پائی۔[1] احمد بن ابی داؤد، دوسری طرف اپنے منصب سے پورا پورا کام لیتا تھا اور عربوں کی ضروریات پوری کراتا تھا۔ وہ معتصم کے سامنے بات کرتا تھا تو کہا کرتا تھا۔ فلاں ہاشمی، فلاں قریشی، فلاں انصاری، فلاں عربی کی بات ایسی ایسی ہے۔ اور برابر نرمی اور ملاطفت سے کام لے کر ان کی ضروریات پوری کراتا رہتا تھا۔[2]

---

[1] کتاب "الفرج بعد الشدۃ" میں آپ یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیں صفحہ ۲۰ جلد ۲

[2] اس واقعہ کو مسعودی میں دیکھئے۔ صفحہ ۲۹۲ جلد ۲

اس مقابلہ کی دوسری صورت ــــ ادبی مقابلہ کی شکل میں جو بنوامیہ کے عہد میں زیادہ معروف تھا ــ باپ کی طرف سے نسب پر فخر کرنے کی شکل میں ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر اس واقعہ کو لیجئے جو عبداللہ بن طاہر (ایرانی) کی طرف سے پیش آیا جبکہ وہ اپنے ایرانی نسب پر فخر کرتا ہے اور محمد بن یزید (عربی اموی) اس کا جواب دیتا ہے اور وہ عربوں پر فخر کرتا ہے۔ عبداللہ بن طاہر نے ایک قصیدہ کہا جس میں وہ اپنے والد اور اپنے خاندان کے تاثر بیان کرتا ہے اور محمد الامین کے قتل کر ڈالنے پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اقصری عما لججت بہ

فقرا عیٰ عنك مشغولٌ

انا من تعرٗف نسبی

سلفی الغرا لبھا لیلٌ

اپنی بکواس بند کر۔ مجھے فرصت میں بھی تیری یہ باتیں سننے کی فرصت نہیں ہے۔ میں وہی ہوں جس کا نسب تو جانتی ہے۔ میرے آبا واجداد سفید پیشانیوں والے بہادر ہیں۔

اسی قصیدہ میں وہ کہتا ہے۔

و ابی من لو کفاء لہٗ

من یساوی مجدہٗ ؟ فشوٗلوٗ

میرا باپ وہی تو ہے جس کے برابر کا کوئی نہیں۔ شرف میں کون
اس کی برابری کر سکتا ہے؟ ذرا کہو تو!!

اس کے بعد کہتا ہے

انظر المخلوع کلکلہ
وَ حوالیہ المقاویل
فثوی و الترب مضجعۂ
غال عنہ ملکۂ غول
تاد جیشا نحو نائلۃ
ضاق عنہ العرض والطول
من خراسان مصمصہم
کلیوث صنھا غیل
وَ ھبج اللہ انفسعم
لو معازیل واو میل

ذرا اسے دیکھو جس کا تاج چھین لیا گیا۔ اس کے گرد اس کی باتیں بکھری
ہوئی پڑی تھیں۔ گارا اور مٹی اس کی آرام گاہ تھی۔ اس کی سلطنت دیوؤں
نے چھین لی تھی۔ جو نائلہ کی طرف ایک ایسا لشکر لائے تھے جس سے
زمین کا عرض اور طول تنگ ہو گیا تھا۔ یہ لشکر خراسان سے آیا تھا جو دیوؤں

کی کچھار ہے۔ وہ شیروں کی طرح آئے جنھوں نے جنگی کچھاروں میں
پرورش پائی تھی۔ خدا کے لئے ان کے متعلق اور کچھ نہ کہو وہ تکلے یا سرمہ
کی سلائیاں نہیں تھے۔

محمد بن یزید کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ قصیدہ سنا تو عربوں کی وجہ سے
میرا چہرہ سکڑ گیا۔ مجھے اس سے بڑی ہی عار آئی کہ ایران کا ایک آدمی عربوں کے
خلاف یوں علانیہ فخر کرے کیونکہ اس نے ان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ
کو اپنی تلوار سے نہیں بلکہ خود اس کے بھائی کی تلوار سے قتل کر دیا تھا۔ وہ اس واقعہ
پر اس طرح فخر کرتا ہے اور یہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ میں نے اس کے قصیدہ کا
جواب دیا۔

رو بیر عك القتال و القيل
كل ما بلغت تضليل
يا ابن بيت النار موقدها
مالحاذ يه سراويل
من حسين، من ابوك ومن
مصعب غالتكو عنول
نسب في الفخر مؤتشب
و ابوات ارا ذيل

قاتل المخلوع مقتول

ودم المقتول مطلول

یہ قال وقیل تجھے اندیشہ میں نہ ڈال دے۔ جو باتیں تو نے پہنچائی ہیں سراپا گمراہ کن ہیں۔ آتش خانوں کی آگ روشن رکھنے والے کے بیٹے۔ آتش خانوں میں چلنے والے پاجامے بھی نہیں پہنتے۔ حسین کون تھا، تیرا باپ کون تھا، مصعب کون تھا۔ تمہیں غول بیابانی کھا جائیں۔ فخر کے میدان میں یہ تو بہت ہی کمزور نسب ہے۔ اور یہ آبا و اجداد تو رذیل اور کمینے ہیں۔ معزول بادشاہ کا قاتل قتل کر دیا جائے گا اور اس کے خون کا کوئی خون بہا بھی نہیں دیا جائے گا۔

اسی قصیدہ میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں

ما جری فی عود اثلتکم

ماء مجد نحو مدخول

قد حت فیہ اسافلہ

فاعالیہ مہازیل

تمہارے خاندان کی کڑی میں جو کچھ شرف کا پانی چل رہا ہے وہ کہیں باہر سے آیا ہوا ہے۔ نچلے لوگ اس میں کوچے مارتے ہیں تو اوپر کے لوگ لاغر اندام ہوئے جاتے ہیں۔

کسی ایرانی کا شعر ہے۔

بھا لیل غر من ذؤابة فارس

اذا انتسبوا لا من عرنیة او عکل

ھم ری اضنة الدنیا، وسادة اھلھا

اذا افتخروا، لا ری اضنة الشاء والابل

وہ بہادر اور سفید پیشانیوں والے ہیں۔ جب وہ نسب بیان کرتے ہیں تو ایرانی پیشانیوں سے اپنا نسب بیان کرتے ہیں، عرنیہ اور عکل سے نہیں۔ جب فخر کرتے ہیں تو وہ دنیا کے منتظم ہیں اور دنیا والوں کے سردار ہیں، بکریوں اور اونٹوں کے خدمتگار نہیں۔

کوئی عربی شاعر اس کے جواب میں کہتا ہے۔

لا تغترر انك من فارس

فی معدن الملك و دیوانه

لو حدثت کسری بذا نفسه

صفعته فی جوف ایوانه

اس پر دھوکہ نہ کھا کہ تو ایران سے تعلق رکھتا ہے اور تو حکومت کی کان اور حکومت کے دفتر میں پیدا ہوا ہے۔ اگر کسریٰ کے دل میں بھی اس قسم کا اندیشہ گزرے تو میں خود اس کے محل کے بیچ

میں اسے نتیجہ رسید کر سکتا ہوں

اس مقابلہ کی ایک تیسری شکل بھی تھی۔ اور یہ علمی مقابلہ تھا۔ اس موضوع پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

اس کا نتیجہ مگر اس مقابلہ کا نتیجہ عربوں کی شکست اور غلاموں کے غلبہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ لیکن ہمیں یہاں یہ اعتراف ضرور کرنا ہوگا کہ عربوں کو مکمل شکست سیاسی اور انتظامی شعبوں ہی میں حاصل ہوئی تھی۔ جہاں تک دینی اور زبانی شعبہ کا تعلق تھا تو اس شعبہ میں عرب ہی غالب رہے۔ مجوسیت اسلام کے ساتھ نہیں چل سکتی تھی۔ ایسے ہی غلاموں کی زبانیں عربی زبان کی شان کو کم نہیں کر سکتی تھیں۔ بلکہ ان تمام زبانوں نے عربی زبان کی خدمت کی اور مختلف جہات سے اس کی ترقی کے لئے کام کیا۔ غلاموں کی یہ قوم جو در اصل خود اپنی سیاسی اغراض کی خدمت کرتے تھے اور ان میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ساتھ ساتھ ہی دین اور زبان کی خدمت بھی برابر انجام دے رہے تھے۔ ان کے قواعد و ضوابط مقرر کر رہے تھے اور ان کو نظم و ترتیب دے رہے تھے ــــ زندقہ کی حرکت جو کبھی کبھی سر ابھارتی رہتی تھی قوت کے ساتھ دبا دی گئی۔ اگرچہ وہ اپنا تھوڑا سا اثر ضرور چھوڑ گئی ــــ جیسا کہ عباسی زمانہ میں کچھ لوگ ایسی کوششیں کر رہے تھے کہ وہ عربی زبان کی جگہ فارسی زبان کی عظمت کا پھریرا اڑائیں لیکن ان کی ان باتوں کو سننے والا بھی کوئی نہیں ملتا تھا۔ عربی زبان ہی

قانونی زبان قرار پائی۔ یہی دین کی زبان تھی اور یہی علم کی۔ غلاموں نے عربی زبان کو عمدگی کے ساتھ سیکھنے کی کوشش کی اوسان کی یہ کوشش اس حد تک بار آور ہوئی کہ وہ عربوں کے لگ بھگ پہنچ گئے۔ اس کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ ابو مسلم خراسانی جیسا آدمی بھی بے تکلف عربی زبان بولتا اور روبہ کے اشعار کو بخوبی سمجھ سکتا تھا[1]۔ عربی زبان کے زیادہ تر عمدہ میر منشی ان دنوں ایرانی ہوتے تھے۔ اصمعی اپنے زمانہ کی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی عربی شہر میں فارسی زبان میں بولنا شرافت و مروت کے خلاف سمجھا جاتا ہے[2]۔

---

[1] اغانی صفحہ ۱۲۳ جلد ۱۸

[2] عیون الاخبار صفحہ ۲۹۶ جلد ۱

تیسری فصل
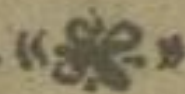
(شعوبیت)

اس عہد کے نمایاں رجحانات پچھلی فصل میں جو باتیں ہم بیان کر چکے ہیں ان کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس عہد میں جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں تین قسم کے رجحانات چھائے ہوئے تھے۔

عربی سیادت کا رجحان (پہلا رجحان) یہ تھا کہ تمام قوموں میں عرب قوم سب سے افضل اور بہتر ہے۔ ان لوگوں کے جو دلائل تھے وہ اجمالاً ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

(۱) عربوں نے اپنی زندگی ہمیشہ استقلال و حریت کے ساتھ گذاری۔ جاہلیت کے زمانہ میں بھی وہ دو حکومتوں ـــ ایران اور روم ـــ کے پڑوسی رہے۔ دونوں

حکومتوں نے بڑے بڑے شہروں کو فتح اور بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیاد رکھی دونوں کے پاس فوج، تعداد اور جنگی ساز و سامان کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن انھیں کبھی اس کی جرأت نہ ہو سکی کہ عربوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکیں اور ان کے شہروں پر لشکر کشی کر سکیں۔ بلکہ وہ ہمیشہ ان کی چاپلوسی کرتے رہے چنانچہ حیرہ میں لخمی عربوں کے ساتھ اور شام میں غسانی عربوں کے ساتھ ان کے اس قسم کے تعلقات تھے۔ یہ ان کو مال بھی دیتے تھے اور جزیرۂ عرب کے عربوں کے حملوں سے حفاظت کی خاطر اپنے شہروں میں ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ لہٰذا وہ عربوں کی بہ نسبت خود عربوں کے زیادہ محتاج تھے۔

اس رجحان کے ماننے والے اسے تسلیم نہیں کرتے کہ ایران اور روم کو سرزمین عرب کی طرف اس لئے توجہ نہیں ہوئی کہ جزیرۂ عرب کی سرزمین میں کوئی ایسی خیر و ثروت ہی نہیں تھی جس کی طرف لالچ کیا جاتا۔ بلکہ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں کو ان کی طرف اس لئے توجہ نہیں ہو سکی کہ وہ عربوں کی شجاعت صباحت اور ثابت قدمی سے واقف تھے۔ ان کی سرزمین پر قدرتی حفاظت کے سامان اس قسم کے موجود ہیں کہ وہ عرب کی جنگ کو چھوٹی چھوٹی فوجوں کی جنگ بنا دیتی ہیں جس کی وجہ سے کوئی منظم بڑی فوج ان کی جنگی صورتوں کا نہ مقابلہ کر سکتی ہے اور نہ ان کے سامنے قدم جما سکتی ہے۔

یہ تو زمانہ جاہلیت کی بات تھی۔ اب زمانۂ اسلام کی بات دیکھئے۔ تو عربوں نے

مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنی حریت و استقلال کی پوری پوری حفاظت کی بلکہ ایرانیوں کی حریت و استقلال کو ضائع کر کے انھیں اپنی حکومت کا تابع فرمان بنالیا۔ رومیوں کی فوجوں کو شکست دے کر اُن کے مملوکہ علاقوں سے انھیں نکال باہر کیا۔

(۲) ان میں کچھ خلقی صفات ایسی موجود تھیں جن سے وہ ممتاز تھے۔ وہ بڑے مہمان نواز اور فریاد رس ہوتے تھے۔ رات کو اگر کوئی مہمان آجاتا تو ایک عرب میزبان اپنی اکیلی اونٹنی کو اس کی مہمان نوازی کے لئے ذبح کر دیتا تھا جبکہ اس کی ساری کائنات محض یہی اونٹنی ہوتی تھی۔ اس کا ہاتھ ہر وقت گھوڑے کی لگام پر رہتا تھا۔ کہیں فریاد کی آواز بلند ہوئی تو اڑ کر وہاں پہنچتا تھا۔ ساری قوموں سے زیادہ انھیں اپنی بات کا پاس ہوتا تھا۔ کسی کی زبان سے ایک بات نکل جاتی تھی تو وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی تھی۔ کوئی پناہ گزین اس کے پاس پناہ لیتا تو وہ اس کی پناہ گزینی کا حق ادا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اس پناہ گزین کے ساتھ ان کے ہاں بالکل ویسے ہی معاملہ (Treatment) کیا جاتا تھا جیسا کہ خاندان میں اپنے بچہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان امتیازات کے ساتھ ساتھ قوت بیان اور حسن تعبیر میں وہ تمام قوموں کے پیشرو تھے۔ شعر و شاعری کا مخزن تھے۔ عمدگی کے ساتھ بدیہہ گوئی اور چلتی پھرتی ضرب الامثال بنانے اور نئی نئی باتیں پیدا کرنے میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ اپنے نسب کی وہ بڑی حفاظت کرتے

کرتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص اپنا نسب جانتا تھا اور ہر شخص سے اس کا شجرۂ نسب سنا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنے آباؤ اجداد کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف منسوب ہو جاتا تھا تو ساری قوم میں مشہور ہو جاتا تھا کہ وہ (دعیؔ) دوسروں کی طرف نسبتیں کرنے والا ہے۔ وہ اپنے نسب ناموں کی حفاظت کرتے اور اپنے حسب کی انہی پر بنیاد رکھتے تھے۔

(۳) اسلام نے ان کے درمیان نشو و نما پائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان ہی عربوں میں سے ایک تھے۔ دوسری قوموں میں اسلام کو پھیلانے والے۔ اسلام کی طرف دعوت دینے والے، اسلامی دعوت کی حفاظت کرنے والے یہی عرب تھے۔ اہلِ عجم میں سے جسے بھی اسلام نصیب ہوا اس کی گردن پر عربوں کا یہ اتنا بڑا احسان تھا جس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ عرب ہی تھے جنھوں نے اسے اس کے پرانے دین کی تاریکی سے نجات دی اور شرک سے توحید کی طرف لے آئے۔ عرب ہی تھے جنھوں نے اسلام کی ہدایت کو چار دانگ عالم میں پھیلانے کے لئے جنگ کی آگ کی تپش سہی۔ عرب ہی تو تھے جنھوں نے اسلام کو زندگی بخشنے کے لئے اپنی جانوں کی بھینٹ چڑھائی۔!!

یہ ہیں وہ اہم ترین دلائل و براہین جو اس رائے کی طرف جانے والے پیش کرتے ہیں۔

ایک روایت ہے کہ کچھ لوگ مقام مربد میں جمع تھے اور ابن المقفع بھی

ان کے ساتھ تھا ابن المقفع نے ان لوگوں سے پوچھا کہ دنیا کی قوموں میں سب سے زیادہ عقلمند قوم کونسی ہے؟ لوگ ایک دوسرے کے منہ کو دیکھنے لگے۔ لوگوں نے اپنے دل میں سوچا کہ ابن المقفع چونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایرانی ہے اس لئے ایران کی طرف ہی اس کا اشارہ ہوگا۔ چنانچہ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ایرانی قوم سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ ابن المقفع نے کہا کہ ایرانی قوم میں تو یہ بات نہیں ہے۔ وہ بڑے حصۂ زمین پر قابض رہے۔ بڑی سلطنت انھوں نے پائی۔ بے شمار مخلوق پر ان کو غلبہ واقتدار حاصل رہا مگر انھوں نے اپنی عقلوں کے سہارے کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی۔ لوگوں نے کہا کہ پھر رومی قوم سب سے زیادہ عقلمند ہوگی۔ ابن المقفع نے کہا کہ رومی تو صناع اور کاریگر ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ پھر چینی قوم عقلمند تر ہوگی ابن المقفع نے اسے بھی رد کرتے ہوئے کہا کہ وہ عجوبہ پسند قوم ہے۔ لوگوں نے ہندوستانی قوم کا نام لیا تو ابن المقفع نے اس سے بھی اتفاق نہیں کیا اور کہنے لگا کہ وہ تو نرے فلسفی ہوتے ہیں۔ لوگوں نے کہا پھر سوڈانی قوم ہوگی۔ ابن المقفع نے کہا کہ لاحول ولاقوۃ۔ وہ تو خدا کی مخلوق میں سب سے ہی بدتر ہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے کہا کہ اچھا پھر آپ خود ہی بتائیے۔ ابن المقفع نے کہا کہ دنیا میں سب سے زیادہ عقلمند قوم عرب کی قوم ہے۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔ ابن المقفع نے کہا کہ میں جانتا ہوں تم لوگ میری موافقت نہیں کروگے لیکن اگر مجھے عرب سے نسبی شرف حاصل نہیں تو میں اسے کس طرح پسند کرلوں کہ

مجھے عربوں کی معرفت سے بھی کچھ حصہ نہ ملے۔ عربوں نے حکومت کی جبکہ ان کے
سامنے کوئی پہلے سے قائم شدہ نمونہ نہیں تھا۔ ان کے ہاں کوئی ایسے آثار نہیں تھے
جو منتقل ہوتے آرہے ہوں وہ بھیڑوں بکریوں اور اونٹوں میں زندگی بسر کرتے
اون اور چمڑے کے خیموں میں رہتے تھے۔ ان میں ہر شخص اپنی قوت اور قوت
سے کمائی ہوئی دولت سے سخاوت کرتا تھا۔ اور تنگی ترشی ہر حالت میں اس کا
دیتا تھا۔ اپنی عقل کے زور پر کسی چیز کو بیان کرنے پر آتا تو لوگوں کا امام بن جاتا۔
کرنے پر آتا تو حجت بن جاتا۔ جس کی تعریف کرنے پر آتا اسے اچھا کر دکھاتا جس کی
مذمت کرنے پر آتا اُسے بُرا بنا ڈالتا۔ انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو ادب سکھا
ان کی ہمتوں نے انھیں بلند مراتب تک پہنچایا۔ ان کے دلوں اور زبانوں نے انھیں
عالی مرتبگی بخشی۔ خدا نے اپنے دین اور اپنی خلافت کی ابتدا حشر تک کے لئے
سے فرمائی۔ جو شخص ان کے حقوق میں ان سے کوتاہی کرتا ہے وہ خود ہی خسارے
رہتا ہے جو ان کی فضیلت سے انکار کرتا ہے اسے دلائل سے ساکت کیا جا
ہے۔

ابن المقفع سے ہی مروی ہے کہ ایک مرتبہ شعر و شاعری اور اس کی فضیلت
کا ذکر اس کے سامنے چھڑ گیا تو وہ کہنے لگا اس بدوی لڑکے کی حکمت سے کونسی حکمت
زیادہ بلیغ، زیادہ عجیب اور زیادہ غریب ہو سکتی ہے جس نے سبزہ زاروں کو کبھی
نہیں دیکھا۔ کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا، بات کرنے سے اسے وحشت

لوگوں کے پاس گھبرا گھبرا کر آتا ہو، اسے ریگستانوں، گوہوں اور ہرنوں کی طرف پناہ ملتی ہو، غول ہائے بیابانی کے ساتھ زندگی گذارتا ہو اور سانپوں کے ساتھ مانوس ہو۔ لیکن جب وہ شعر کہنے پر آتا ہو تو ایسی ایسی باتوں کو بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہو جو نہ اس نے کبھی دیکھی نہ سنی اور نہ جن سے وہ کبھی آشنا رہا۔ اس کے بعد وہ محاسن اخلاق اور مساوی اخلاق کو بھی بیان کرتا ہے، مدح بھی کرتا ہے اور ہجو و مذمت بھی۔ شکوے بھی کرتا ہے اور عاشقانہ تشبیبیں بھی، وہ ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ لوگ انھیں لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑکا مر جاتا ہے مگر لوگ اس کی باتیں نقل کرتے رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ جاتی ہیں[1]۔" اگرچہ ہمیں اس میں پورا شبہ ہے کہ ابن المقفع کی یہ روایت صحیح ہو لیکن اس کے باوجود ہم اسے نقل کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ یہ روایت ایک صحیح رجحان کی تصویر کشی کرتی ہے۔

جاحظ کہتے ہیں کہ فصیح اور عقلمند بدویوں کی لمبی چوڑی باتیں سننے سے زیادہ روئے زمین پر کوئی بات زیادہ سبق آموز، فائدہ مند، عمدہ کانوں کے لئے لذیذتر، عقول سلیمہ سے شدید ترین لگاؤ رکھنے والی، زبان کی گرہیں کھول دینے والی اور قوت گویائی کو عمدگی اور درستگی بخشنے والی نہیں ہوتی[2]۔

اس رجحان کا نمونہ اشراف عرب اور بدوی لوگ تھے جیساکہ اس رجحان کا

---

[1] زہر الآداب برحاشیہ العقد الفرید صفحہ ۲ ج ۲ [2] زہر الآداب صفحہ ۲ جلد ۲

نمونہ وہ عجمی لوگ بھی تھے جو دل کی گہرائیوں سے اسلام لائے تھے اور جن کے اعماق قلب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں تھی اور وہ عربوں سے بھی اس لئے محبت کرتے تھے کہ ایک تو رسول اللہ صلعم خود ان میں سے تھے اور دوسرے اس لئے بھی کہ یہ لوگ خود انہی عربوں کے ہاتھوں اسلام لائے تھے۔

مساوات کا رجحان

(دوسرا رجحان) یہ تھا کہ عرب دوسری قوموں سے افضل نہیں اور نہ ہی کوئی قوم کسی قوم سے افضل ہو سکتی ہے۔ سارے انسان ایک ہی مٹی سے بنے ہیں اور ایک ہی انسان کے نطفہ سے ان سب کی تخلیق ہوئی ہے۔ ایک دوسرے پر فضیلت افراد میں تو ہو سکتی ہے مگر اقوام میں نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کے درمیان فضیلت اپنے آباد اجداد اور حسب ونسب سے نہیں ہو سکتی بلکہ اپنے اخلاق اور اعمال سے ہوتی ہے۔ یا ان کی شرافت نفس اور بلند ہمتی سے ہو سکتی ہے۔ آدمی اگر پست ہمت اور بے مروت ہو تو اسے شریف نہیں کہا جا سکتا خواہ اس کے گیسو بنو ہاشم سے وابستہ ہوں اور اس کی ناک بنو امیہ کی ناک سے بندھی ہو اور بنو قیس کے شریف ترین قبیلہ سے اس کا شمار ہوتا ہو۔ بلکہ شریف اور کریم وہ ہے جس کے افعال و اعمال شریف ہوں اور جس کی ہمت اور جرأت شرف و کرم کی حامل ہو۔

یہ لوگ ایک موقف اختیار کرتے ہیں ـــــ تمام اقوام عالم کی مساوات کا موقف ـــــ کہ کوئی عربی کسی عجمی سے اس لئے افضل نہیں کہ وہ عربی ہے اور

کوئی عجمی کسی عرب سے اس لئے بالاتر نہیں ہے کہ وہ عجمی ہے۔ عربیت اور عجمیت تفاضل کے عوامل میں سے کوئی عامل ہی نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے نزدیک تفاضل کا عامل محض دینداری ہے اور دوسرے لوگوں کے نزدیک شرافت اور بلند اخلاقی۔ یہی مضمون ہمیں قرآن کریم میں بھی ملتا ہے۔ جہاں وہ کہتا ہے

"یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ"

اے لوگو! ہم نے تم سب کو نر اور مادہ سے پیدا کیا ہے اور شعوب وقبائل میں اس لئے تقسیم کر دیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً خدا کے نزدیک تم میں شریف تر وہ ہے جو خدا کے قوانین سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

حدیث میں ہے۔ "کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت ہے تو تقویٰ کے ساتھ ہے۔" ایک دوسری حدیث ہے۔ "مؤمنوں کے خون برابر ہیں ان میں سے ادنیٰ ترین شخص بڑی سے بڑی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے۔ وہ مخالفین کے مقابلہ میں ایک متحدہ قوت ہیں" مامون کا قول ہے کہ شرافت نسبی چیز ہے۔ عرب کا شریف آدمی عجم کے شریف آدمی کے ساتھ زیادہ قریب ہے بہ نسبت عجم کے کمینہ آدمیوں کے عرب کے شرفاء کے ساتھ۔ ایسے ہی عجم کا شریف آدمی عرب کے

شریف آدمیوں کے ساتھ زیادہ قریب ہے۔ بہ نسبت عرب کے کمینہ آدمیوں کے عجم کے شرفار کے ساتھ[1] ابن قتیبہ نے عربوں کی طرف سے مدافعت کرنے اور دوسری قوموں پر ان کی فضیلت واضح کرنے کے بعد اپنی کتاب کے آخر میں کہا ہے کہ "میرے نزدیک صحیح ترین قول یہی ہے کہ سارے آدمی ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے، ایک مٹی سے بنے اور ایک ہی زمین میں لوٹا دیئے جائیں گے سب کے نطفے پیشاب کی نال سے نکلے اور سب پر گندگیاں لپٹی رہیں۔ یہ ہے ان کا بلند ترین نسب نامہ جس سے ہر عقلمند آدمی کو تعظیم، تکبر اور فخر بالآبار سے باز آجانا چاہیئے اس کے بعد ان سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے جہاں تمام نسب اور حسب ختم ہو جائیں گے بجز ان لوگوں کے جن کا حسب تقویٰ ہوگا یا جن کی ساخت اللہ کی فرمانبرداری اور اطاعت کے ساتھ ہوئی ہوگی۔[2]

ان لوگوں کی دلیل یہ تھی کہ ہر قوم میں اچھے اور برے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر قوم میں کچھ خوبیاں اور برائیاں ہوتی ہیں۔ اعمال کا وزن کرنے کے لئے بہترین میزان دین اور اخلاق، ہی ہو سکتے ہیں۔ ہم قوموں کے اخلاق کا تو وزن نہیں کر سکتے البتہ افراد کے اعمال کا وزن کر سکتے ہیں۔ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اپنے دین اور اخلاق کے لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

---

[1] محاضرات الادبار صفحہ ۲۱۹ جلد ۱ [2] العقد الفرید صفحہ ۹۰ جلد ۲

اس قسم کے لوگوں کو " اھل التسویہ " کے لقب سے پکارا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ ہیں جو اقوام وملل میں مساوات کے قائل ہیں۔ اور کسی قوم کو دوسری قوم پر فضیلت دینے کے قائل نہیں ہیں۔ اکثر دیندار اور عرب وعجم کے علماء اسی خیال کے گذرے ہیں۔ کیونکہ اسلام کی روح اور اس کی بنیادی تعلیمات اس رجحان کی تائید کرتی ہیں۔

غیر عربی سیادت کا رجحان (تیسرا رجحان) عربوں کی شان کمتر دکھانے کی طرف مائل ہے اور وہ دوسری قوموں کو عربوں سے افضل قرار دیتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ

(۱) ہر قوم کا کوئی نہ کوئی امتیاز ہوا کرتا ہے جس پر وہ فخر کرتی ہے مگر عربوں کا ایسا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ رومیوں کو دیکھئے وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ اُن کی سلطنت بہت بڑی تھی۔ ان کے ہاں بڑے بڑے شہر تھے۔ ان کی تہذیب نہایت عالی شان تھی۔ ہندوستان والے اپنی حکمت و فلسفہ اور طب پر فخر کرتے تھے۔ اپنی کثرت تعداد، بہتی نہروں، سرسبز و شاداب زمینوں اور پھلوں پھلواریوں کی کثرت پر فخر کرتے تھے۔ چین کے لوگ اپنی صنعتوں اور فنون جمیلہ پر فخر کرتے تھے وغیر ذلک لیکن عربوں کے ہاں ہمیں کوئی ایسی امتیازی بات نظر نہیں آتی جس پر وہ فخر کر سکیں۔ ان کی زمین بنجر اور خشک، زندگی میں بدویت، زمانۂ جاہلیت میں فقر و فاقہ کے اندیشہ سے اپنی اولاد تک کو قتل

کر دیا کرتے تھے۔ ان کی ساری زندگی محض لوٹ مار، جنگ وجدل تھی جس کی وجہ سے ان کی کوئی حالت بھی مستقل اور استوار نہیں ہوتی تھی۔ ذرا سا کوئی اچھا کام کر دیتے مثلاً کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیا یا کسی مظلوم کی مدد کر دی تو نظم ونثر کے ذریعہ سے اس ایک واقعہ کا وہ شور مچاتے کہ ساری دنیا میں غلغلہ بلند کر دیتے اور اس پر فخر کر کے بری طرح اکڑتے تھے۔

(۳) فخر کن چیزوں پر ہوا کرتا ہے؟ حکومت وسلطنت پر؟ تو فراعنۂ مصر عمالقہ، اکاسرہ، اور قیاصرہ کے مقابلہ میں ان کی حکومت وسلطنت کچھ حیثیت بھی رکھتی تھی؟ کیا کسی ایسے سلیمان پر فخر کیا جا سکتا ہے جسے روئے زمین کی اتنی بڑی حکومت دی گئی ہو کہ اس کے بعد کسی کو نصیب نہ ہوئی ہو؟ کیا عربوں میں کوئی ایسا سلیمان گذرا تھا؟

یا کسی ایسے سکندر اعظم کی حکومت پر فخر کیا جا سکتا ہے جس کی فتوحات مشرق ومغرب تک جا پہنچی ہوں؟ تو کیا عرب کوئی ایسا سکندر اعظم پیش کر سکتے ہیں؟ یا نبوت پر فخر کیا جا سکتا ہے؟ اگر نبوت پر فخر ہو سکتا ہے تو سارے انبیاء غیر عرب تھے۔ بجز ان چار انبیاء کے۔ ہودؑ، صالحؑ، اسماعیلؑ اور محمد صلعم، یا صنعت وحرفت اور علم پر فخر کیا جا سکتا ہے؟ تو ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے عرب کے لوگ تمام اقوام کے مقابلہ میں کمزور تر تھے۔ ان کے ہاتھ اس خصوصیت میں سب سے زیادہ بانجھ تھے۔ ان کی عقلیں اس حیثیت سے سب سے زیادہ بنجر اور شور تھیں۔

یا شعر پر فخر کیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ کوئی خصوصیت نہیں ہے جس میں
عرب ہی منفرد ہوں۔ یونانیوں کے ہاں موزوں اور مقفیٰ اشعار ہوتے تھے۔ رومیوں
کے ہاں بھی اشعار ہوتے تھے۔ یا زور دار خطبوں اور لیکچروں پر فخر کیا جاسکتا ہے
اگر ایسا ہے تو یونانیوں اور رومیوں کے پر شوکت خطبے اور سحر آمیز تقریریں کچھ ان
سے کم نہیں تھیں۔ آخر وہ کونسی چیز ہے جس پر یہ لوگ فخر کر سکتے ہوں۔ عرب کے
لوگ سخاوت اور وفا پر بڑا فخر کرتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ جتنی لمبی چوڑی وہ
باتیں بناتے ہیں اتنا انھوں نے کبھی کر کے نہیں دکھایا۔ اس کے بعد وہ حسب و
نسب پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ حالانکہ زمانۂ جاہلیت میں ان کے ہاں نکاح اور شادی
کی بھی وہ پابندیاں نہیں تھیں جو اسلام نے ان پر عائد کر دی ہیں۔ بلکہ ان کی
شادیوں کی ایک قسم ایسی بھی تھی جس میں ایک عورت چند مردوں میں مشترک
ہوا کرتی تھی۔ وہ مختلف جنگوں میں ایک دوسرے کی عورتوں کو قید کر کے باندیاں
بنا لیا کرتے تھے اور بغیر شادی کئے ہوئے ان سے استمتاع کرتے رہتے تھے۔
اس طرح ظاہر ہے کہ کون یقین سے جان سکتا تھا کہ اس کا باپ کون ہے۔؟

(۳) اگر وہ اسلام پر فخر کرتے ہیں تو اسلام تنہا عربوں کا دین نہیں ہے۔
وہ تو پوری نوع انسانی کا دین ہے۔ خود اسلام نے بھی ان کے اس رجحان سے
جنگ کی ہے اور عصبیت جاہلیہ کو اس نے مٹا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے شرافت کا
سب سے بڑا معیار تقویٰ کو قرار دیا ہے۔ لہٰذا دین تو ہمارے اور عربوں کے درمیان

قدر مشترک ہے۔ رہ گئی دنیا تو اس میں ہم ان سے بہت آگے ہیں۔ ہمیں دنیا کے امور کا ان سے کہیں زیادہ علم ہے۔ ہمیں دنیوی احوال و ظروف سے استفادہ کے زیادہ مواقع مہیا ہیں۔

اس صنف کے نمائندے ـــــ جو عربوں کی تحقیر اور ان کی تذلیل شان کر کے ہر قوم کو ان سے افضل اور بہتر قرار دیتے تھے ـــــ وہ لوگ تھے جو ابھی تک اپنے پرانے دینوں پر قائم تھے یا اسلام تو لے آئے تھے مگر اسلام ابھی تک ان کے حلق کے نیچے نہیں اترا تھا۔ یا وہ لوگ تھے جن پر وطنی رجحانات کا غلبہ تھا اور وہ عربوں کو اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ انھوں نے ان کی حکومت کو ختم کر کے ان کی آزادی اور استقلال کو کھویا تھا۔

اس عہد میں یہ تین رجحانات پائے جاتے تھے۔ اور انہی رجحانات کے ماتحت لوگ آپس میں جھگڑتے رہتے تھے۔ آخری دونوں رجحان (یعنی دوسرا اور تیسرا رجحان) رکھنے والے گروہوں پر "شعوبیہ" کا لفظ بولا جانے لگا۔ حالانکہ دوسرے رجحان والے لوگ اس لقب کے زیادہ مستحق تھے۔ وہ اس کے قائل تھے کہ شرف اور ذلت کے اعتبار سے عربوں اور دیگر اقوام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے لئے موزوں تر ایک تو وہ نام ہو سکتا تھا جو لفظ "مساوات" سے مشتق اور ماخوذ ہوتا۔ یا وہ نام ہو سکتا تھا جو لفظ "شعوب" سے ماخوذ ہوتا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ یہ لوگ اس کے قائل ہیں کہ تمام قومیں برابر ہیں۔ لہذا ان لوگوں نے دوسرے

نام کو اختیار کیا اور اپنا نام "شعوبیہ" رکھ لیا۔ اس لئے صاحب عقد الفرید کہتے ہیں کہ "شعوبیہ" قوموں کے درمیان مساوات اور تسویہ کے قائل لوگوں

شعوبیت کا لفظ اور اس کا اصل سرچشمہ

کو کہتے ہیں۔ جوہری نے صحاح میں کہا ہے کہ "شعوبیہ" اس فرقہ کو کہتے ہیں جو عجمیوں پر عربوں کی فضیلت کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اس نام کا اطلاق تیسرے رجحان والوں پر بھی کرنے لگتے ہیں۔ اگر ہم جاحظ کی تحریرات اور صاحب عقد فرید کے بیانات کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ چیز مل جاتی ہے کہ یہ حضرات ان لوگوں کو بھی "شعوبیہ" کے نام سے پکارتے ہیں جو عربوں سے دشمنی رکھتے تھے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ابتداءً اس نام کے ساتھ انہی لوگوں کو موسوم کیا گیا تھا جو مساوات کے قائل تھے۔ لیکن آگے چل کر پھر بعد میں تیسرے رجحان والوں کو بھی اس نام سے پکارا جانے لگا۔ تیسرے رجحان والا گروہ تاریخی اعتبار سے بھی دوسرے رجحان والے گروہ سے بعد میں ہی پیدا ہوا تھا۔ اور یہ بات بالکل فطری ہے کہ بنو امیہ کے دورِ حکومت میں عرب کے لوگ متغلب تھے۔ اور پہلا رجحان اپنی پوری شدت، قوت اور غلبہ کے ساتھ چھایا ہوا تھا — موالی نے اس بات کو محسوس کیا ہوگا اور ابتداءً انھوں نے اسی پر اکتفاء کیا ہوگا کہ وہ مساوات کا رجحان پیدا کریں۔ اس وقت ان کی آخری خواہش یہی ہوگی کہ وہ اس رجحان کو کامیاب بنا سکیں۔ حتیٰ کہ جب اس مقابلہ نے

شدت اختیار کرلی اور ہارون رشید اور مامون کے زمانہ میں مؤالی نے اپنی قوت اور تسلط کو محسوس کرلیا تو پھر تیسرا رجحان پیدا ہوا ہوگا جس میں انھیں عربوں کی شان گھٹاکر غیر عربوں کی شان بلند کرنے کی سوجھی ہوگی۔ اس کے بعد شعوبیہ کا لفظ ان پر بھی بولا جانے لگا ہوگا۔ اور ایک ساتھ دونوں رجحان رکھنے والے گروہوں کو اس نام سے پکارا جانے لگا ہوگا۔ رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہوگئی کہ زیادہ تر یہ نام تیسرے رجحان والوں پر بولا جانے لگا ہوگا۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے کہ "شعوبی" اس شخص کو کہتے ہیں جو عربوں کی شان گھٹانے کا قائل ہو اور غیر عربوں پر ان کی کسی فضیلت اور برتری کو نہ مانتا ہو۔"

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ "شعوبیہ" کا لفظ "شُعُوبٌ" سے ماخوذ ہے جو شَعْبٌ کی جمع ہے۔ شَعْبٌ لوگوں کے گروہ کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ قبیلہ سے زیادہ وسیع اور عام مفہوم کا مالک ہے۔ زبیر بن بکار کا قول ہے کہ عربی میں قومیت و خاندان کے مفہوم میں ترتیب یہ ہوتی ہے۔ سب سے اوپر شَعْبٌ اس کے نیچے قَبِیْلَۃٌ، اس کے نیچے عِمَارَۃٌ، پھر بَطْنٌ پھر فَخِذٌ اور سب سے نیچے فَصِیْلَۃٌ بولتے ہیں۔ اس قول کی بنا پر قوم عرب ایک شعب ہے اور ایرانی قوم ایک شعب ہے اور رومی قوم ایک شعب۔ وقس علیٰ ذلک

کچھ حضرات اس طرف گئے ہیں کہ شعوبیہ کا لفظ قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ

جَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں شعوب سے مراد عجمی خاندان ہیں اور قبائل سے مراد عربی خاندان ہے۔ لیکن یہ تفسیر ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ اس کے غلط ہونے کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ عرب کے لوگ آیت کے نزول کے زمانہ میں اس کا یہ مفہوم نہیں سمجھتے تھے۔ طبری نے اپنی تفسیر میں بے شمار صحابہ اور تابعین کی آراء نقل کی ہیں جو سب اسی نقطہ کے گرد گھومتی ہیں کہ شعوب سے مراد اوپر کا دور کا نسب ہوتا ہے۔ یا بطون کو کہتے ہیں اور قبائل کا لفظ اس کے نیچے ہوتا ہے ـــــ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعوب کی تفسیر عجمی خاندانوں کے ساتھ اور قبائل کی تفسیر عربی خاندانوں کے ساتھ کسی شعوبی کی تفسیر ہے جو کسی عجمی نے گھڑی ہے جس سے اس کا مقصد عربوں پر عجمیوں کی برتری ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے شعوب کا ذکر پہلے کیا ہے اور قبائل کا بعد میں۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ "مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کسی عجمی نے قرآن کریم کی آیت یَا اَیُّھَا النَّاسُ الآیہ سے یہ استدلال کیا ہے کہ شعوب عجمی لوگوں کو کہتے ہیں اور قبائل عربی لوگوں کو اور جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہو وہ مؤخر الذکر سے افضل ہوتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی محسوس کیا ہے کہ مساوات کے قائل لوگ اس آیت سے استدلال کرتے رہے ہیں۔ مگر ان کا استدلال دو وجہوں سے غلط ہے۔ اول تو یہ ہے کہ

تذکرہ میں مقدم کرنا فضیلت اور برتری کی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کریم میں یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کہہ کر جنات کو انسانوں سے مقدم ذکر کیا گیا ہے حالانکہ انسان جنات سے برتر ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربوں کے مقابلہ میں عجمی لوگ لفظ شعب کا مصداق بننے کے کچھ زیادہ حق دار نہیں ہیں۔ معنی اور مفہوم کے لحاظ سے جو قوم کثیر التعداد اور شاخ در شاخ پھیلی ہوئی ہو اسے شعوب کہہ سکتے ہیں۔

شعوبیت کی ابتداء ہو سکتا ہے کہ شعوبیہ کا نام آیت کی یہ تفسیر کر لینے کے بعد ہی شعوب سے ماخوذ مانا گیا ہو۔ لیکن یہ استدلال بہر حال ایک غلط بنیاد پر قائم ہے — میرے نزدیک ایک راجح بات یہی ہے کہ شعوبیہ کا لفظ عباسی عہد کے شروع ہی میں استعمال ہوا ہے جس کی دو دلیلیں میرے پاس موجود ہیں جو اگرچہ قطعی دلیلیں تو نہیں ہیں تاہم اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

(اول) ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عربوں کے برابری یا ان کی تحقیر کا رجحان قوی اور واضح صورت میں کہ اس کے معتقدین پر کسی نام کا اطلاق کرنے کی ضرورت پیش آ جائے عباسی عہد ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اس سے پہلے یہ رجحان در پردہ اور مخفی سا تھا جس میں ظاہر ہونے کی قدرت ہی نہیں تھی۔ کبھی سر ابھارتا بھی تھا تو وہیں اُسے کچل دیا جاتا تھا۔ نام رکھنے کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے۔

جب کوئی رجحان ایک عام عقیدہ کی شکل یا ایک بڑی جماعت کی ہیئت اختیار
کرلے۔ (دوم) اموی دور حکومت میں ہمیں کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جس نے
اس رجحان پر اس نام کا اطلاق کیا ہو۔ البتہ اصفہانی نے اغانی میں کہا ہے
کہ "اسمٰعیل بن یسار شعوبی تھا" لیکن یہ بات تو ظاہر ہے کہ خود اصفہانی کا تعلق
عباسی دور حکومت سے ہے جس نے اسماعیل کو یہ نام دیا ہے جس کا وہ
مستحق تھا۔ کیونکہ اس نے عجمیوں کی شان بڑھانے کی کوشش کی تھی ــــــ
اور ہشام بن عبدالملک کے روبرو اس نے اپنے اشعار میں اسی کے گیت
گائے تھے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اسماعیل بن یسار خود اپنے زمانہ میں
بھی اسی نام سے مشہور تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے لوگ سلمان فارسیؓ کو صوفی
شمار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے عہد میں
صوفیہ کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں تھا۔ اسی طرح مسروق کی ایک روایت
میں ہے کہ "شعوب" میں سے ایک آدمی مسلمان ہوگیا۔ اس کے بعد بھی
اس سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس سے جزیہ نہ لیا
جائے۔" مسروق تابعی ہیں اور بنو امیہ کے عہد حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔
ابن الاثیر نے اس روایت میں شعوب کی تفسیر عجمی آدمی سے کی ہے۔ لسان
العرب میں ہے کہ "ہوسکتا ہے کہ یہاں شعوب، شعوبی کی جمع ہو۔ شعوبی
اس آدمی کو کہتے ہیں جو عربوں کی شان کو گھٹاتا ہو۔ جب کہ یہود اور مجوس

یہودی اور مجوسی کی جمعیں ہیں"۔

ہمارے نزدیک یہ دوسری تفسیر بہت مستبعد ہے۔ یہ تفسیر متاخرین نے کی ہے اور مسروق کے زمانہ کے بعد جو کچھ ان کے زمانہ میں معروف تھا اسی کے مطابق انھوں نے تفسیر کر دی۔ ہمارا خیال یہی ہے کہ مسروق کا مطلب اتنا ہی تھا کہ عرب قوم کے علاوہ دوسری اقوام میں سے کوئی آدمی مسلمان ہوگیا۔ الخ اس صورت میں اس قول سے کوئی استدلال کرنا صحیح نہیں رہتا۔

ہمارے اس قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اکثر ان مذاہب کے نام جو اموی دولت کے ابتدائی زمانہ میں پیدا ہوئے تھے سب کے سب یائے نسبتی سے خالی ہیں۔ مثلاً خوارج، شیعہ، مرجۂ، معتزلہ، وغیرہ یائے نسبتی کا اضافہ اموی عہد کے آخر یا عباسی عہد کے شروع میں ہونے لگا تھا مثلاً جہمیہ، قدریہ، راوندیہ، خرمیہ، شعوبیہ، وغیرہ ــــ سب سے قدیم ترین کتاب جس نے شعوبیہ کا لفظ استعمال کیا ہے جاحظ کی کتاب "البیان والتبیین" ہے۔

"شعوبیت" کے متعلق مذکورہ بالا تفصیلات سے مندرجہ ذیل نتائج نکالے جا سکتے ہیں:-

(۱) شعوبیت کے مبلغین نے اپنی دعوت کی بنیاد ابتداءً خود اسلام کی تعلیمات ہی پر رکھی تھی۔ اسلام ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری کا قائل

نہیں ہے - جزا اور سزا اس کے نزدیک اعمال کے مطابق ہوتی ہے اجناس واقوام کے مطابق نہیں - ہو سکتا ہے کہ ایک ذلیل غلام اور ایک حقیر نبطی اللہ کے ہاں اعلی علیین میں ہو اور اس کا آقا اور مالک جو بکثرت اہل و عیال اور مال و دولت رکھتا تھا اسفل سافلین میں ہو - اس کے آگے بڑھ کر آہستہ آہستہ انھوں نے عربوں کی تحقیر اور ان کے احوال کی تضحیک اور ان کے خلاف دوسری اقوام کے امتیازات گنانے شروع کر دیئے - دولت عباسیہ میں ایرانیوں کا اثر و نفوذ چونکہ کافی بڑھ چکا تھا اس بات نے ان کی اور بھی مدد کی -

شعوبیت کے اوصاف

(۲) شعوبیت کوئی ایسا عقیدہ نہیں تھا کہ اس کی تعلیمات مشہور و محدود اور شعائر و رسوم ظاہر اور متعین ہوں - جیسا کہ دینی مذاہب کے بارہ میں ہم دیکھتے ہیں - ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں آدمی شافعی ہے اور فلاں حنفی ہے کیونکہ ہم ان کے اختلافات کی حدبندی اور رسوم و شعائر وغیرہ میں ان کے امتیازات کو واضح کر سکتے ہیں - ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں آدمی اہل سنت والجماعت میں سے ہے اور فلاں آدمی معتزلی ہے اور اس کا پتہ چلا سکتے ہیں لیکن ہم شعوبیت کے بارہ میں یہ کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں عقیدہ کی بہ نسبت رجحان کا زیادہ تعلق ہے - یہ رجحان دراصل ارستقراطیت (Aristocracy) اور دیمقراطیت (Democracy)

سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ بلکہ درحقیقت دیمقراطیت (Democracy)
ہی کی ایک شکل تھی جو عربوں کی ارستقراطیت (Aristocracy) سے
برسرپیکار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے ہمنواؤں کا احصاء نہیں کر سکتے۔ وہ ہر شہر
ہر ملک اور ہر جنس میں پائے جاتے تھے۔ جیسا کہ آج ہم ان لوگوں کو شمار نہیں
کر سکتے جو دیمقراطیت (Democracy) یا اشتراکیت Communism
کا رجحان رکھتے ہیں۔

(۳) جس چیز نے شعوبیت کے اس رجحان کو مدد پہنچائی یہ بھی تھی کہ یہ رجحان
دراصل وطنی رجحان اور دینی عصبیت سے ہم آہنگی رکھتا تھا۔ عربوں نے ایران کی
آزادی کو ختم کر دیا تھا۔ وہ مصر، شام اور بلاد مغرب کے مالک بن گئے تھے۔ ان
ملکوں کے باشندے عرب نہیں تھے اس کے بعد اکثر ایرانیوں کے دل میں اپنی
آزادی اور استقلال کی تمنائیں کروٹ لیتی تھیں۔ شام اور مصر کے اکثر نصاریٰ
ان عرب مسلمانوں کو ناپسند کرتے تھے جنھوں نے رومی نصاریٰ کو ان کے شہروں
سے نکال دیا تھا۔ ان کی آرزو تھی کہ وہ اپنے ملک میں خود اپنی حکومت قائم
کریں اور اگر محکوم بن کر ہی رہنا ہو تو کم از کم اپنے ہم مذہبوں کے محکوم
بن کر رہیں۔

اتنی بات واضح ہے کہ ایرانیوں میں سے، ایسے ہی مصر، شام اور
اندلس کے باشندوں میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان میں یہ وطنی رجحان

اتنا شدید نہیں تھا۔ لیکن ان میں بھی کتنے تھے جن کے دلوں کی گہرائیوں میں اسلام اُتر گیا ہو اور ان کے حواس پر اس حد تک چھا گیا ہو کہ وہ ان دینی اور وطنی رجحانات پر غلبہ پا سکے۔

(۴) مذکورہ بالا تصریحات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شعوبی لوگ مختلف اصناف سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ ان میں سے ایرانی تھے، کچھ نبطی اور کچھ قبطی اور کچھ اندلسی تھے۔ ان میں سے ہر صنف کی شعوبیت ایک خاص رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ایرانیوں کی شعوبیت وطنی رنگ میں رنگی ہوئی تھی جو آزادی کی داعی تھی اور بعض اوقات زندقہ اور الحاد کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ نبطیوں کی شعوبیت، زمین اور زراعت کی عصبیت کی شکل میں رنگی ہوئی تھی اور وہ کھیتی باڑی کی زندگی کو صحرا اور صحرائی معیشت پر برتری دیتے تھے۔ قبطیوں نے کئی مرتبہ عربوں کے خلاف بغاوتیں کیں اور اُنھیں اپنے ملک سے نکال دینے کا ارادہ کیا۔ ان کی طرف سے آخری بڑی بغاوت مامون کے عہد حکومت میں ہوئی۔ جب انھیں ہر مرتبہ شکست کھانی پڑی تو آخر انھوں نے مکر و فریب کی پناہ لی اور حیلہ اور تدبیروں سے کام نکالنا چاہا۔ بالآخر دفتر خراج پر قابض ہو کر انھوں نے اپنے انتقام کی آگ بجھائی[1]۔ اندلس میں ظہر ابن غرسیہ نے شعوبیت کے موضوع پر اپنا ایک رسالہ تصنیف کیا جس کا

---

[1] ملاحظہ ہو مقریزی صفحہ ۷۹-۸۰ جلد ۱

اکثر علمار وقت نے جواب لکھا۔

(۵) اس شعوبیت کے مختلف درجات تھے۔ ابتداءً وہ نہایت معتدل اور پُرسکون رہتی تھی اور آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتی جاتی تھی۔ ہم ایسے لوگوں کو پہلے دیکھ چکے ہیں جو عربوں اور غیر عربوں میں محض مساوات اور برابری کے قائل تھے۔ ان کے بعد ایسے لوگوں کو بھی ہم نے دیکھا ہے جو عربوں کی تحقیر و تذلیل کر کے ان سے ہر فضیلت کو سلب کر لینا چاہتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہم نے دیکھے ہیں جو عربوں میں اور اسلام میں فرق کرتے ہیں وہ عربوں کا اس حیثیت سے مقابلہ کرتے ہیں کہ وہ بھی ایک قوم ہیں اور اس مقابلہ میں وہ اسلام کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہتے بلکہ واضح طور پر یہ کہتے ہیں کہ اسلام تو پوری نوع انسانی کا مذہب ہے۔ تنہا عربوں کا مذہب تھوڑے ہی ہے۔ اکثر وہ لوگ جنھوں نے عربوں کی مذمت کی ہے زیادہ تر اسی صنف سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ غالبًا بیجا نہ ہوگا اگر ہم ابن خلدون کو بھی اس معنی میں شعوبی شمار کر لیں۔ ابن خلدون کی رائے کا خلاصہ عربوں کے بارہ میں ہم "فجر الاسلام" کے جزو اول میں نقل کر چکے ہیں[۱]۔ ابن خلدون کی وہ رائے عربوں اور ان کی خصوصیات کے خلاف نہایت ہی سخت اور شدید ہے۔ ہم نے بہت کم کسی شعوبی کو دیکھا ہوگا جس نے اشاروں کنایوں میں وہ

---

[۱] فجر الاسلام صفحہ ۳۶

باتیں کہی ہوں جو ابن خلدون کھلم کھلا اور صراحتہً کہہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم
سمجھتے ہیں کہ ابن خلدون سچے مسلمان تھے اور حدود دین میں رہتے ہوئے آزادیٔ
فکر کے قائل تھے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے لوگ بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں
جو اس ضمن میں عربوں اور اسلام کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ چنانچہ عربوں
کی ناپسندیدگی ان میں اتنی شدت سے پائی جاتی ہے کہ وہ ہر اس چیز کو ناپسندیدگی
کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں جس کا کچھ بھی عربوں سے تعلق ہو۔ انہی چیزوں میں سے،
دین بھی ہے۔ جاحظ نے اس قسم کے لوگوں کے متعلق بیان کرتے ہوئے کہا ہے
کہ "بسا اوقات عداوت تعصب کی بنا پر ہوتی ہے۔ عموماً وہ لوگ جنھیں اسلام
میں شبہات پیدا ہوئے ان کے یہ شبہات عموماً شعوبیت کی راہ ہی سے آئے
تھے۔ جب کوئی آدمی کسی چیز کو ناپسند کرتا ہے تو اس کی ہر بات ہی اسے ناپسند
ہونے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس زبان کو ناپسند کرتا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ
وہ اس جزیرہ نما کو پسند کرے جس کی یہ زبان ہے۔ حالات ایسے آدمیوں کو ایک
کیفیت سے دوسری کیفیت تک پہنچاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اسلام سے بالکل
ہی نکل جاتا ہے۔ کیونکہ عرب ہی تو وہ لوگ تھے جو اسلام کو لے کر آئے تھے اور
وہی اسلام کے پیشرو تھے"[۵] اس بات نے کچھ لوگوں کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ شعوبیت

---

[۵] الحیوان صفحہ ۰، ۶ جلد، عبارت میں ذرا سقم ہے ہم نے اسے مختصر کر دیا ہے۔

سے بیزاری ظاہر کریں کیونکہ یہ تو دراصل الحاد کا ایک دروازہ بن جاتا ہے۔

(۶) خوارج، شیعہ، اور معتزلہ کی بعض تعلیمات ہیں ہمیں توافق اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ چنانچہ خوارج ـــ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ـــ کی رائے میں خلیفہ کا قریشی ہونا بلکہ عربی ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کے اس رجحان کا مقصد عربوں کی تحقیر اور غیر عربوں کی برتری ثابت کرنا نہیں تھا۔ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ اکثر خارجی خالص عرب کے لوگ تھے۔ یہ رائے انھوں نے اس وقت قائم کی تھی جب حضرت علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما میں اختلاف پیدا ہوا۔ شعوبیت کا ان دنوں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ خالص اجتہاد سے انھوں نے یہ رائے قائم کی تھی جس کا داعی محض مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کا شوق تھا اور بس! رہ گئے معتزلہ تو مسعودی نے بیان کیا ہے کہ "متکلمین کی ایک جماعت، جن میں ضرار بن عمرو، ثمامہ بن اشرس، اور عمرو بن عثمان جاحظ بھی شامل ہیں، کا خیال ہے کہ نبطی لوگ عربوں سے بہتر ہیں" یہ تینوں کے تینوں معتزلہ کے سرداروں میں سے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسعودی کی یہ رائے جس میں گولڈزیہر بھی ان کے ہمنوا ہیں[۱] ـــ غلط ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو گولڈزیہر کی کتاب (Muhammedanische Studien) اس کتاب میں گولڈزیہر نے شعوبیت کے مسئلہ پر ایک فصل میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ہم نے اپنی تحقیقات میں اس سے بڑا استفادہ کیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کو اس بات سے مغالطہ ہوا ہے کہ ضرار اور اس کے ساتھی خلافت کے مسئلہ میں خوارج سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر صرف اتنا کہنے پر اکتفا نہیں کرتے کہ خلافت کے لئے خلیفہ کا قریشی بلکہ عربی ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ انھوں نے اس پر اضافہ کر کے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "غیر عربی اگرچہ وہ نبطی ہی کیوں نہ ہو ایک قریشی خلیفہ سے زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ اگر وہ ظلم و جور کرنے لگے تو اسے معزول کر دینا زیادہ سہل ہوگا"۔ ہمارے اس خیال کی دلیل امام نووی کا وہ بیان ہے جو انھوں نے صحیح مسلم کی شرح میں نقل کیا ہے کہ ضرار بن عمرو کے اس قول کی جو وہی ناقابلِ التفات ہے کہ قوم نبط وغیرہ سے ایک غیر قریشی آدمی خلافت کے لئے قریشی پر مقدم ہوگا۔ کیونکہ اگر اس سے کسی ناپسندیدہ امر کا ظہور ہو تو اسے معزول کر دینا زیادہ آسان ہے[1]۔ سمجھنے والوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ ضرار اور اس کے ساتھیوں نے نبطیوں کو عربوں پر برتری دی ہے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا غلط ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس سے تو وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی آدمی افضل اور اشرف ہوتا ہے۔ لیکن مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایسے آدمی کو خلیفہ بنائیں جس کی زیادہ عزت نہ ہو تاکہ اسے معزول کرنا آسان ہو سکے۔ خصوصیت کے ساتھ نبطی کا تذکرہ انھوں نے اس لئے کیا ہے کہ نبطی آدمی کمینگی میں ضرب المثل

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۵ ج ۴

مانے جاتے ہیں۔ اور جاحظ کو تو ـــــ خاص طور پر شعوبی شمار کرنا ہی بہت مشکل ہے۔ جاحظ نے تو شمشیر برہنہ ہو کر اپنی کتاب "البیان والتبیین" میں شعوبیت کے مطاعن کا رد کیا ہے۔ اور ان لوگوں کی رائے کی بیہودگی اس انداز سے ثابت کی ہے جس سے ان کا خلوص ٹپکتا ہے ـــــ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے موالی کی فضیلت اور ان کے مناقب کے بیان میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے۔ لیکن اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ خود مُوالی ہی کی زبان سے کہلوایا ہے۔ امام جاحظ نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے یہ رسالہ معتصم کے زمانہ میں تصنیف کیا تھا جس نے ترکوں کو جمع کر لیا تھا۔ جاحظ نے کہا ہے کہ انھوں نے یہ رسالہ اس لئے نہیں لکھا کہ فوج کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ پر برتری دیں ـــــ افواج خلافت ان دنوں پانچ اصناف پر مشتمل تھیں۔ خراسانی، ترکی، غلام، عربی، دولتِ عباسیہ کے داعیوں کی اولاد ـــــ بلکہ اس لئے تصنیف کیا ہے کہ اگر ان کے دلوں میں اختلافات موجود ہوں تو ان میں یک جہتی اور دل جمعی پیدا کی جائے۔ اور اگر ان کے دلوں میں اتحاد و اتفاق ہو تو اس یگانگت میں مزید اضافہ کیا جا سکے[1]۔ اس رسالہ کی تصنیف کا دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ منافقین کی دسیسہ کاریوں سے انھیں آگاہ کر دیا جائے جو وہ فوج کے

---

[1] رسائل جاحظ صفحہ ۱۰

سینوں میں اختلافات کی آگ بھڑکانے اور دلوں میں نفرت ڈالنے کے لئے کرتے رہتے ہیں۔" امام جاحظ کہتے ہیں کہ" اگر ترکوں کے مناقب کا تذکرہ اس کے بغیر ممکن نہ ہو کہ باقی فوجوں کی برائیاں بیان کی جائیں تو پھر ان باتوں کا تذکرہ چھوڑ دینا ہی بہتر اور اس کتاب کی تصنیف سے احتراز کرنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔"[1]

بہرحال جاحظ نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ" بغیر اس کے کہ کسی غیر ترکی کی مذمت کی جائے وہ ترکوں کے مناقب بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔" اگرچہ وہ اپنے قلم پر پورا قابو نہیں رکھ سکے اور بعض اوقات ایک منہ زور گھوڑے کی طرح ان کا قلم بعض معاملات میں ترکوں کو دوسری فوجوں پر برتری دے گیا ہے لیکن اتنی سی بات کو شعوبیت میں شمار کر لینا بھی تو بڑا ہی دشوار ہے۔

علاوہ ازیں ہماری نظر میں امام جاحظ جب کسی چیز کی تعریف یا مذمت کرتے ہیں تو وہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ کسی بڑے آدمی کے دعوے کا جواب دینے کے لئے بھی چیزوں کی تعریف یا مذمت کر دیتے ہیں۔ یا بعض مرتبہ وہ کسی چیز کی دو مختلف اور متضاد صورتوں میں تصویر کشی کر کے اپنی قدرت بیان کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان قرائن پر ہم اعتماد کر سکیں تو کتاب البیان والتبیین میں کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ جاتی جسے خود امام جاحظ کی

---

[1] رسائل جاحظ صفحہ ۲۲

رلئے قرار دیا جا سکے۔ اس لئے ہمارے نزدیک یہی رائے راجح ہے کہ امام جاحظ شعوبی نہیں تھے۔

(۷) ابن قتیبہ اس طرف گئے ہیں کہ جن لوگوں نے شعوبیت کو اختیار کیا تھا وہ کمینے اور نچلے طبقہ کے لوگ تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "اس شعوبیت میں، میں نے کمینوں، کھو کھلے لوگوں، نبطی اوباشوں اور دیہاتی مزدور پیشہ لوگوں سے زیادہ کسی کو اتنا زیادہ راسخ العداوۃ اور عربوں کا شدید دشمن نہیں پایا۔ رہ گئے عجمی اشراف اور بلند مرتبہ لوگ نیز ان کے متدین طبقہ کے آدمی تو وہ عربوں کی فضیلت کو مانتے اور ان کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ شرافت کا بڑی حد تک نسب سے بھی تعلق ہوتا ہے۔" لیکن ظاہر ہے کہ ابن قتیبہ صرف ان لوگوں کو بیان کر رہے ہیں جو علی الاعلان شعوبیت کا اظہار کرتے تھے۔ یہ لوگ واقعی ابن قتیبہ کے بیان کے مطابق نچلے طبقہ کے لوگ ہی ہوا کرتے تھے۔ رہ گئے ان کے اشراف تو ان کی حرکات زیادہ تر در پردہ اور مخفی ہوا کرتی تھیں۔ اپنے بلند مرتبہ مناصب کی وجہ سے ان میں اظہار کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ انھیں ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ خلیفہ کی بارگاہ میں ان کی وفاداری مشکوک نہ سمجھی جائے۔ لہذا یہ لوگ ـــــ پردہ کے پیچھے سے ـــــ اس قسم کی تحریکات کی تائید کیا کرتے تھے۔ جو ابن قتیبہ جیسے لوگوں کو نظر نہیں آسکتی تھیں۔ ابن قتیبہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ شعوبیت کا مسلک اختیار

کرنے والوں میں سے " ایسے لوگ بھی تھے جو ادب کے زیور سے آراستہ ہو کر اشراف کی مجلسوں میں بیٹھنے لگے تھے اور دفتری ذمہ داریوں کو سنبھال کر سلطان کے مقرب بن گئے تھے۔ اس کے بعد ان کے دماغوں میں اپنے آداب و رسوم کی عصبیت اور اپنی قدر و منزلت کی برتری سما گئی۔ کیونکہ یہ لوگ بد اصل اور خبیث باطن تھے۔ ان میں سے ایسے لوگ بھی نکلے جنھوں نے اپنی نسبت اشراف عجم کے ساتھ کی اور اپنے نسب عجمی بادشاہوں اور نوابوں سے ملائے۔ اس طرح وہ ایک ایسے فراخ دروازہ میں داخل ہو گئے جس پر کوئی پردہ ہی نہیں تھا اور ایک ایسے وسیع خلاء میں گھس گئے جس سے انھیں نکالنے والا اب کوئی نہیں تھا۔ ان میں سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی خست اور کمینگی ہی پر قائم رہے اور اپنی کمینگی کا یوں مظاہرہ کرنے لگے کہ سارے عجمیوں کی شرافت اور برتری کے دعویدار بن بیٹھے تاکہ وہ خود بھی شریف کہے جاسکیں۔ عربوں کی تنقیص کر کے ان کے ساتھ اپنے بغض کا اظہار کرنے، انھیں گالیاں دینے میں اپنی تمام کوششیں صرف کرنے، اُن کی برائیاں گنانے، ان کے مناقب میں تحریف کرنے ہی میں سکون محسوس کرتے تھے۔ عربوں کی زبان میں بولتے تھے مگر ان کی بلند حوصلگیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے آداب سے مسلح ہو کر ان کے خلاف ہی حملے کرتے تھے۔ اگر عربوں کی کوئی بھلائی انھیں نظر بھی آتی تھی تو اسے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر وہ ظاہر بھی ہو جاتی تھی تو اسے حقیر بنانے کی سعی کرتے تھے۔ اور اگر تاویلوں سے

کام بن سکتا ہو تو توڑ مروڑ کر بدترین صورت میں اسے پیش کرتے تھے۔ اگر عربوں کی کوئی برائی اُن کے کانوں میں پڑ جاتی تھی تو اسے چار دانگ عالم میں پھیلاتے تھے۔ اگر کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی تو خود اپنی طرف سے گھڑنے کی کوشش کرتے تھے۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ شعوبیت تنہا نچلے طبقہ کے لوگوں ہی میں نہیں تھی۔ کمینہ لوگوں کے ہاتھ میں ہی اس کی باگیں نہیں تھیں۔ بلکہ ان کے ساتھ بعث سے تعلیم یافتہ اور اونچے طبقہ کے لوگ بھی شامل تھے۔ اگرچہ نسبی اعتبار سے ان کے خاندان بادشاہوں اور اشراف تک نہ بھی پہنچتے ہوں یہی وہ لوگ تھے جن کے ادب اور علم میں شعوبیت کے اثرات نمایاں تھے ـــــ جیسا کہ آپ آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے ـــــ ان کے اور اُن کے پیچھے پس پردہ وہ لوگ تھے جو حکومت میں بلند تر منصبوں پر فائز تھے۔ وہ اپنے مرتبہ اور مال سے درپردہ ان کی مدد کرتے تھے۔ علّان شعوبی نے عربوں کی برائیوں پر ایک کتاب تصنیف کی تو طاہر ابن الحسین نے اسے تیس ہزار درہم انعام میں دیئے۔

چونکہ یہ عقلاء اور مکار ہی در اصل اس تحریک کے علمبردار تھے اس لئے ان کی جنگ ظاہری بغاوتوں سے زیادہ علمی، ادبی اور دینی رنگوں میں لڑی

---

[1] کتاب العرب من رسائل البلغاء صفحہ ۳۷۰

جاتی رہی۔
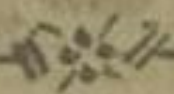
تیسری صدی ہجری میں یہ تحریک اپنے اوج کمال پر پہنچ چکی تھی۔ اس بات نے ان کی اور بھی مدد کی کہ خلفائے بنو عباس میں اسلام کے لئے تو تعصب تھا۔ مگر عربیت کے لئے کچھ زیادہ تعصب نہیں تھا ۔۔۔ انھوں نے زندقہ کا تو مقابلہ کیا مگر ۔۔۔ سختی کے ساتھ ۔۔۔ اس عجمی رجحان کا مقابلہ نہیں کیا۔۔ اور یہ بات ایک حد تک طبعی بھی تھی۔ کیونکہ زیادہ تر خلفائے عباسی ۔۔۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ۔۔۔ عجمی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ عربوں کو ان کے عہد میں بڑی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وزراء زیادہ تر عجمی لوگ ہوتے تھے۔ محلات شاہی میں عربی اثرات کو کم کرنے کے لئے برابر سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ عرب کے لوگ جب جزیرہ نمائے عرب یا اس کے اطراف میں کوئی شورش کرتے تھے تو عجمی کمانڈر اور عجمی افواج انھیں سخت ترین سزائیں دیتی تھیں۔ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں یہ شعور کروٹیں لیتا تھا کہ وہ آج ان سے قادسیہ کی جنگ کا انتقام لے رہے ہیں۔ ترکی افواج کا شعور بھی جنھیں معتصم نے جمع کیا تھا ایرانی افواج کے شعور سے کچھ بہتر نہیں تھا۔ اس صدی ہجری اور اس کے بعد کی صدی میں بکثرت اشعار ان عجمیوں کے ملیں گے جنھوں نے عربی زبان سیکھ لی تھی۔ اور وہ اپنے نسب پر فخر اور اپنی قوم پر ناز کرتے تھے۔ اس کی

لٹریچر پر اہل شعوبیت کے اثرات

ابتدار ـــــ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں ـــــ بشار ابن برد نے کی اور مشہور شاعر دیک الجن نے اس کی پیروی کی۔ اغانی میں ہے کہ "دیک الجن عربوں کے خلاف عصبیت اور جوانمردی کے اظہار میں نہایت ہی سخت تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عربوں کو ہم پر کونسی فوقیت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد وہ بھی ہیں اور ہم بھی ہیں جیسے وہ اسلام لائے۔ ہم بھی اسلام لائے۔ ان میں سے اگر کوئی ہمارے کسی آدمی کو قتل کر دیتا ہے تو اس کے بدلہ میں اسے بھی قتل ہونا پڑتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہیں بھی انھیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں دی۔ کیونکہ دین میں ہم اور وہ دونوں یکساں شریک ہیں۔"

ان کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

فَلَسْتُ بِتَارِكٍ اِيْوَانَ كِسْرٰى
لِتُوْضِحَ اَوْ لِحَوْمَلَ فَالدَّخُوْلِ
وَضَبٍّ فِي الْفَلَاةِ سَاعٍ، وَذِئْبٍ
بِهَا يَعْوِيْ وَلَيْثٍ وَسْطَ غِيْلٍ

میں توضح، حومل یا دخول مقامات کی خاطر، اور جنگل میدان میں دوڑنے والی گوہ، وہاں بھونکنے والے بھیڑیے اور غولان بیابانی کے درمیان رہنے والے شیر کی وجہ سے ایوانِ کسریٰ کو چھوڑنے والا

نہیں ہوں۔

مشہور شاعر "خریمی" بکثرت اپنے اشعار میں اپنے ایرانی نسب پر فخر کرتا اور عربوں کی تنقیص و تحقیر کرتا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

إِنِّي امْرُؤٌ مِنْ سَرَاةِ الصُّغْدِ أَلْبَسَنِي

عِرْقُ الْأَعَاجِمِ، جِلْدًا طَيِّبَ الْخَبَرِ

میں صغد کے سرداروں میں سے ایک سردار ہوں، عجمیوں کے خون نے مجھے ایسی چمڑی عطا کی ہے جس سے معطر خوشبو نکلتی ہے۔

خریمی کہتا ہے

أَبِالصُّغْدِ بَأْسٌ إِذْ تُعَيِّرُنِي جُمْلٌ

سِفَاهًا وَمِنْ أَخْلَاقِ جَارَتِيَ الْجَهْلُ

فَإِنْ تَفْخَرِي يَا جُمْلُ أَوْ تَتَجَمَّلِي

فَلَا فَخْرَ إِلَّا فَوْقَهُ الدِّينُ وَالْعَقْلُ

أَرَى النَّاسَ شَرْعًا فِي الْحَيٰوةِ وَلَا أَرَى

لِقَبْرٍ عَلٰى قَبْرٍ عَلَاءً وَلَا فَضْلًا

وَمَا ضَرَّنِي أَنْ لَمْ تَلِدْنِي يُحَابِرٌ

وَلَمْ تَشْتَمِلْ جَرْمٌ عَلَيَّ وَلَا عُكْلُ

اِذَا اَنْتَ لَمْ تَحْمِ الْقَدِيْمَ بِحَادِثٍ
مِنَ الْمَجْدِ لَمْ يَنْفَعْكَ مَا كَانَ مِنْ قَبْلُ

خاندانِ صُغد پر کیا مضائقہ ہے جبکہ اونٹ (یعنی عرب کے لوگ) مجھے اپنی حماقت سے عار دلائیں اور میری پڑوسن کی تو عادت ہی جہالت ہے۔ اے اونٹنی! اگر تو فخر کرے یا بناؤ سنگار کرے تو فخر کی ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کے اوپر دین اور عقل کے تقاضے موجود نہ ہوں۔ زندگی میں تو میں سب لوگوں کو برابر سرابر دیکھتا ہوں اور مرنے کے بعد ایک قبر کو دوسری قبر پر کوئی بلندی اور فضیلت نہیں ہوتی۔ مجھے اس سے کیا نقصان ہے اگر مجھے قبیلۂ یحابر نے نہیں جنا اور قبیلۂ جرم اور عکل مجھ پر مشتمل نہیں ہوا اگر تو نئے شرف کے ساتھ پرانے شرف کی حفاظت نہ کر سکے تو جو کچھ شرف تجھے پہلے حاصل رہا ہے وہ تجھے کوئی نفع نہیں دے سکتا۔

خریمی ہی کہتا ہے:-

وَ نَادَيْتُ مِنْ مَرْوٍ وَ بَلْخٍ فَوَارِسًا
لَهُمْ حَسَبٌ فِي الْاَكْرَمِيْنَ حَسِيْبُ
فَيَا حَسْرَتَا اِذْ دَارُهُمْ فَوْقَ قَرِيْبَةٍ
فَيَكْثُرُ مِنْهُمْ نَاصِرِىْ وَ يَطِيْبُ

وَ اِنَّ اَبِیْ سَاسَانُ کِسْرٰی بْنُ ھُرْمُزٍ
وَ خَاقَانُ لِیْ لَوْ تَعْلَمِیْنَ نَسِیْبٌ
مَلَکْنَا رِقَابَ النَّاسِ فِی الشِّرْکِ کُلِّھِمْ
لَنَا تَابِعٌ طَوْعَ الْقِیَادِ جَنِیْبٌ
نَسُوْمُھُمْ خَسْفًا، وَ نَقْضِیْ عَلَیْھِمْ
بِمَا شَاءَ مِنَّا مُخْطِئٌ وَ مُصِیْبٌ
فَلَمَّا اَتَی الْاِسْلَامُ وَ انْشَرَحَتْ لَہٗ
صُدُوْرٌ بِہٖ نَحْوَ الْاَنَامِ تُنِیْبُ
تَبِعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ حَتّٰی کَاَنَّمَا
سَمَاءٌ عَلَیْنَا بِالرِّجَالِ تَصُوْبُ

میں نے مرد اور بلخ کے ان شہسواروں کو پکارا جن کا اپنا حسب و نسب ہے اور جو شریف لوگوں میں صاحب حسب شمار کیے جاتے ہیں۔ ہائے افسوس! میری قوم کا وطن قریب نہیں ہے کہ ان میں سے میرے مددگار بکثرت اور بخوشی نکل آتے۔ میرا باپ ساسان کسریٰ ابن ہرمز ہے اور خاقان بھی میرا ہی ہے اگر تمھیں معلوم ہو تو وہ بڑا صاحب نسب بزرگ تھا۔ زمانۂ شرک میں ہم لوگوں کی گردنوں کے مالک تھے۔ لوگ مطیع و فرمانبردار ہو کر ہمارے دائیں

بائیں اور پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ ہم تمھیں زمین میں گاڑ دیا کرتے تھے اور تمھارے خلاف ہم میں سے خطاکار اور راست کار جو چاہتے تھے فیصلے کر دیا کرتے تھے۔ جب اسلام آگیا اور سینے اس کے لئے کھل گئے اور وہ لوگوں کی طرف مُڑنے لگے۔ تو ہم نے رسول اللہ کی پیروی اختیار کر لی حتیٰ کہ حالت یہ ہو گئی کہ گویا آسمان سے ہم پر لوگ اُتر رہے تھے۔

نیز متوکلی شاعر کہتا ہے۔ یہ خلیفہ متوکل کے ندیموں میں سے تھا۔

أَنَا ابْنُ الْأَكَارِمِ مِنْ نَسْلِ جَمّ
وَحَائِزُ إِرْثِ مُلُوكِ الْعَجَمْ

وَفَخْرِي الَّذِي بَادَ مِنْ عِزِّهِمْ
وَعَفَّى عَلَيْهِ طِوَالُ الْقِدَمْ

وَطَالِبُ أَوْتَارِهِمْ جَهْرَةً
فَمَنْ نَامَ عَنْ حَقِّهِمْ لَمْ أَنَمْ

مَعِي عَلَمُ الْكَابِيَانِ الَّذِي
بِهِ أَرْتَجِي أَنْ أَسُودَ الْأُمَمْ

فَقُلْ لِبَنِي هَاشِمٍ أَجْمَعِينَ
هَلُمُّوا إِلَى الْخَلْعِ قَبْلَ النَّدَمْ

مَلَکْنَاکُمْ عَمْنْوَۃً بِالرِّ مَا
حِ طَعْنًا وَ ضَرْبًا بِسَیْفٍ خَذِمْ
وَ اَوْلَاکُمُ الْمُلْکَ اٰبَاءُ نَا
فَمَا اِنْ وَفَیْتُمْ بِشُکْرِ النِّعَمْ
نَعُوْ دُوْا اِلٰی اَرْضِکُمْ بِالْحِجَازِ
لِاَ کْلِ الضِّبَابِ وَ رَعْیِ الْغَنَمْ
فَاِنِّیْ سَاَعْلُوْ سَرِیْرَ الْمُلُوْکِ
بِحَدِّ الْحُسَامِ، وَحَرْفِ الْقَلَمْ

میں جمشید کی نسل سے شرفار کی اولاد ہوں اور شاہانِ عجم کی وراثت کو حاصل کرنے والا ہوں۔ اور جو لوگ ختم ہو چکے ہیں اور جن کو طویں قدامت نے مٹا دیا ہے ان کی عزت کو دوبارہ زندگی بخشنے والا ہوں میں علی الاعلان ان کی قوت کا طلبگار رہوں۔ جو کوئی اُن کے حق سے سو گیا ہو وہ سو گیا ہو، میں تو کبھی بھی نہیں سویا۔ میرے پاس عَلَمِ کاویانی ہے جس سے مجھے توقع ہے کہ میں قوموں کی سیادت کر سکوں گا۔ تمام بنو ہاشم سے کہدو کہ اس سے پہلے کہ تم نہیں ندامت کا سامنا کرنا پڑے رضا کارانہ طور پر وہ خود ہی معزول ہو جائیں ہم طاقت کے بل پر تمھارے حاکم رہ چکے ہیں۔ نیزوں کی مار اور تیز

کاٹنے والی تلواروں کے ذریعہ ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد حکومت کے زیادہ حقدار تھے۔ تم نے نعمتوں کا شکریہ پورا پورا ادا نہیں کیا۔ تم جنگل میں اپنی سرزمین کی طرف جاؤ تاکہ وہاں جا کر گوہیں کھاسکو اور بکریاں چرا سکو۔ کیونکہ میں تلوار کی دھار اور نوک قلم کے ذریعہ سے شہنشاہوں کے تخت پر اب عنقریب چڑھنے والا ہوں۔

عربوں نے ان لوگوں کے مؤقف کی خطرناکی کو محسوس کر لیا تھا۔ مگر ان میں یہ طاقت نہیں تھی کہ وہ اس آنے والے شر کو اپنے سے دور کر سکیں۔ اس زمانہ اور اس کے بعد کے زمانہ کے اکثر اشعار میں حسرت اور الم کی پرچھائیاں ہیں نظر آتی ہیں۔ ان میں سے کچھ اشعار ہم پچھلی فصل میں نقل کر چکے ہیں۔ آگے چل کر یہی رجحان واضح طور پر ہمیں متنبی کے ہاں ملتا ہے۔ ایران میں ــــ درّہ بوّان کو دیکھ کر ــــ وہ نہایت رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے کہ وہاں عربی زبان کس قدر کمزور ہے۔

مَلَاعِبُ جِنَّةٍ لَوْ سَارَ فِیْهَا
سُلَیْمَانٌ لَسَارَ بِتَرْجُمَانٍ

جنات کے ساتھ کھیلنے والا سلیمانؑ بھی اگر وہاں جائے تو یقیناً ترجمان کو ساتھ لے کر جائے گا۔

اور کہتا ہے۔

وَلٰکِنَّ الْفَتَی الْعَرَبِیَّ فِیْهَا
غَرِیْبُ الْوَجْهِ وَالْیَدِ وَاللِّسَانِ

لیکن وہاں عربی نوجوان کس قدر چہرہ، ہاتھ اور زبان کے اعتبار سے اجنبی اور غریب ہے۔

متنبیؔ ہی اپنے ایک دوسرے قصیدہ میں کہتا ہے ؎

وَاِنَّمَا النَّاسُ بِالْمُلُوْكِ، وَمَا
تُفْلِحُ عُرْبٌ مُلُوْکُهَا عَجَمُ
لَا اَدَبٌ عِنْدَهُمْ وَلَا حَسَبٌ
وَلَا عُهُوْدٌ لَهُمْ وَلَا ذِمَمُ
بِکُلِّ اَرْضٍ وَطِئْتُهَا اُمَمٌ
تُرْعٰی بِعَبْدٍ کَاَنَّهَا غَنَمُ
یَسْتَخْشِنُ الْخَزَّ حِیْنَ یَلْمِسُهٗ
وَکَانَ یُبْرٰی بِظُفْرِهِ الْقَلَمُ

لوگ اپنے بادشاہوں کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔ وہ عربی لوگ کب فلاح پا سکتے ہیں جن کے بادشاہ عجمی ہوں۔ نہ ان کے پاس ادب ہے نہ حسب ہے۔ نہ عہدوں اور معاہدوں کی ذمہ داری کا کچھ پاس ہے۔

ہر زمین میں جہاں بھی تم جاؤ ایسی قومیں ملیں گی جن پر غلام حکومت کر رہے ہوں گے گویا کہ وہ قومیں محض بکریاں ہیں۔ یہ ان کی حالت یہ ہے کہ ریشم کو بھی چھوتے ہیں تو وہ انھیں سخت اور کھردرا نظر آتا ہے۔ حالانکہ کبھی ان کے ناخنوں سے قلم بنائے جایا کرتے تھے۔

شعوبیت کی مختلف صورتیں جن کے ساتھ اس نے عربوں سے جنگ کی

اب ہم وہ مختلف صورتیں بیان کرتے ہیں جن کے ساتھ اس شعوبیت نے عربوں کے خلاف جنگ کی:-

انھوں نے سب سے پہلے عربوں کی اس برتری کو لیا جس پر انھیں بڑا فخر اور بڑا ناز تھا۔ یہ چیز عربوں کی بلاغت، قوت خطابت اور بدیہہ گوئی کی خصوصیات تھیں۔ اس ضمن میں انھوں نے مختلف جہات سے ان کی تنقیص کرنا شروع کی۔

عرب کے لوگ جب خطبہ دیتے تھے تو اکثر ہاتھوں سے اشارے کرتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے مقاصد کی تصویر کشی کرتے اور مضمون کی توضیح میں ان

اشارات سے مدد لیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سننے والوں پر اس طرح اثر اندازی میں قوت آجاتی ہے۔ زیادہ تر اپنے اشارات میں وہ اس چیز سے کام لیتے تھے جو ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ (عصا، ہتھوڑا، گرز یا درخت کی کوئی شاخ) صلح کے خطبوں میں وہ زیادہ تر ان چیزوں سے اشارہ کرتے تھے اور جنگ کے خطبوں میں وہ عموماً کمانیں استعمال کرتے تھے۔ اکثر خطبوں کے دوران وہ اپنی کمانوں پر ٹیک لگا لیا کرتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ خطبہ دینے کے لیئے وہ کوئی خاص قسم کا لباس پہن لیتے تھے۔ چنانچہ ایک خاص ہیئت کے ساتھ عمامہ سر پر رکھ لیتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خطبہ دینے کے لیئے تیاری کر رہے ہیں۔ شعوبیت پیدا ہوئی تو اس نے ان باتوں کا استہزا اور مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ کہتے تھے۔ "بات اور لاٹھی میں کیا جوڑ اور خطبہ اور کمان میں کیا تُک ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو عقل کو کسی اور طرف لگا دیتیں، دلوں کو کسی اور بات کی طرف موڑ دیتی اور ذہن کو پراگندہ کر دیتی ہیں۔ لاٹھی یا کمان اٹھانے سے ذہن میں کچھ جلا تھوڑے ہی ہو جاتی ہے۔ ان کے ساتھ اشارہ کرنے سے الفاظ تو کھنچے چلے نہیں آتے۔ گوئیوں کا بیان ہے کہ جب کوئی مغنی خود ہی ساز بجاتا ہے تو اس کے گانے میں وہ زور نہیں رہتا جو اس مغنی کے گانے میں ہوتا ہے جو اپنے ہاتھ سے ساز نہ بجا رہا ہو۔ لاٹھیاں لے کر چلنا تو کسانوں کا کام ہوتا ہے۔ یہ چیزیں سخت دل

اعرابیوں اور سنگدل بدوؤں کو ہی زیادہ زیب دیتی ہیں جو راستوں پر اپنے اونٹوں کو اِدھر اُدھر منتشر ہونے سے روکنے میں ہر وقت لگے رہتے ہیں"[1]۔

جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں ان لوگوں کا جواب دیا ہے اور اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک مستقل باب الگ لکھا ہے جس کا نام "کتاب العصا" ہے۔ ان لوگوں نے خطابت وغیرہ کے طریقوں ہی پر نکتہ چینی نہیں کی بلکہ خود نفس خطابت وغیرہ پر بھی عیب چینیاں کی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے تھے:
خطابت کوئی ایسا امتیاز تو نہیں ہے جس میں صرف تم ہی امتیازی درجہ رکھتے ہو۔ یہ چیز تو ساری قوموں میں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ حبشی لوگ بھی باوجود اپنی غباوت اور فساد مزاج کے طویل سے طویل خطبے دے لیتے ہیں۔ بہترین خطیب ایرانی ہوتے ہیں نہ کہ عرب۔ خطبوں سے زیادہ ایرانیوں کے ہاں صنعت بلاغت اور غریب الفاظ سے متعلق تصنیفات تک موجود ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب "کاروند" ملاحظہ ہو۔ جس کسی کو عقل، ادب، مراتب کا علم، عبرتوں، تمثیلوں، نرم ونازک الفاظ اور لطیف معانی درکار ہوں تو اسے بادشاہوں کی سیرتوں (ملوک الفرس) کا مطالعہ کرنا چاہیئے[2]۔ تمھارے مضامین، حکمتیں خطبے اور طرز فکر اس کا پاسنگ بھی نہیں جو ایرانیوں، یونانیوں اور ہندوستانیوں کے ہاں مل سکتا ہے۔ تمھاری درشت

---

[1] البیان والتبیین صفحہ جلد ۳ [2] البیان والتبیین

اور تلخ باتوں، بھدی اور موٹی آوازوں میں (کیونکہ تمھیں زیادہ تر اونٹوں کے ساتھ مخاطبت کی عادت رہی ہے) وہ دقیق مضامین، نرم و نازک الفاظ، باریک اور سریلی آوازیں کہاں جو ان اقوام میں ہمیں ملتی ہیں۔" جاحظ نے ایرانیوں اور رومیوں کی بلاغت اور عربوں کی بلاغت میں مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں کی بلاغت فکر و تدبر کا نتیجہ ہوتی ہے اور عربوں کی بلاغت بدیہہ گوئی اور تیزیٔ ذہن کا شاہکار ہوتی ہے۔

اسی طرح انھوں نے عربوں کے آلاتِ جنگ پر بھی نکتہ چینیاں کیں اور ان کے نیزوں، ان کے ننگی پیٹھ والے گھوڑوں اور ان کے ٹھوس گرزوں کا مذاق اڑایا حالانکہ کھوکھلے گرزوں کو اٹھانا بھی آسان ہوتا ہے اور اُن کی مار بھی سخت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ان کی فوجی تنظیم سے ناواقفیت کا بھی مذاق اڑایا کہ انھیں اس کا بھی پتہ نہیں تھا کہ میمنہ، میسرہ، قلب اور جناح کسے کہتے ہیں۔ آلاتِ جنگ میں سے انھیں عرادہ اور منجنیق تک کی خبر نہیں تھی۔ انھوں نے عربی افواج اور ایرانی افواج کا تنظیمی معاملات اور آلاتِ جنگ میں موازنہ کر کے بتایا کہ عربی افواج نہایت ہی حقیر اور ایرانی افواج نہایت ہی شاندار ہوتی تھیں۔ مگر شعوبیت کو شاید اس کا احساس نہیں رہا کہ اس موازنہ اور مقابلہ سے خود ان کی ذلت اور کمینگی ہی کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ اِن عربوں نے اپنے اُن سادہ اور حقیر ہتھیاروں کے ساتھ ہی ایرانیوں کو ان کے شاندار اور بڑے بڑے آلاتِ جنگ اور منظم

اور کثیر افواج کے باوجود پیس کر رکھ دیا تھا۔[1]

شعوبیت کی ان راہوں میں سے ایک دوسری قسم بھی تھی۔ اور وہ قسم یہ تھی کہ اس عہد میں انھوں نے اہل عجم کے مناقب میں بکثرت کتابیں تصنیف کیں۔ چنانچہ سعید بن حمید بختکان ـــــ جو ہیر منشی ہونے کے علاوہ شیریں الفاظ اور پُر گوشاعر بھی تھا۔ اس کا دعوٰے تھا کہ وہ ایرانی بادشاہوں کی اولاد میں سے ہے۔ اسے عربوں کے خلاف شدید قسم کا تعصب تھا ـــــ نے "انتصاف العجم من العرب" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ نیز ایک دوسری کتاب "فضل العجم علی العرب وافتخارھا" کے نام سے تصنیف کی تھی۔[2] ابن الندیم نے اس کی ایک تیسری کتاب کا تذکرہ بھی کیا ہے جس کا نام انھوں نے "مفاخر العجم" بتایا ہے۔[3] اس کے بالمقابل عربوں کی برائیوں میں بھی کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں۔ مثلاً ہیثم ابن عدی ـــــ جو تاریخ اور روایات کے مشہور ترین علماء میں سے ہے، منصور، مہدی، ہادی اور رشید کا ہم نشین رہا ہے ـــــ عربوں کی برائیوں کے بیان میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔ ان میں سے "کتاب المثالب الصغیر"، کتاب المثالب الکبیر" اور کتاب مثالب ربیعہ" اور "اسماء بغایا قریش فی الجاھلیۃ واسماء

---

[1] اس سلسلہ میں کتاب البیان والتبیین کی تیسری جلد ملاحظ فرمائیے۔ [2] فہرست ابن الندیم صفحہ ۱۲۳ [3] الفہرست صفحہ ۲۴

من ولدان" اور اسی سلسلہ کی پانچویں کتاب "کتاب من تزوج من الموالی فی العرب" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں[1]۔ ایسے ہی "بیت الحکمۃ" والے سہل بن ہارون کے متعلق بھی ابن ندیم نے بیان کیا ہے کہ وہ صاحب حکمت، اور نہایت فصیح شاعر تھے۔ ایرانی الاصل اور مسلک کے اعتبار سے شعوبی تھے۔ عربوں کے خلاف انھیں شدید تعصب تھا اس موضوع پر انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں[2]۔ انھوں نے بخل کے بارہ میں اپنا ایک مشہور رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ بھی وہی شعوبیت کا رجحان تھا۔ کیونکہ عرب کے لوگ کرم اور سخاوت کی بڑی تعریفیں کرتے اور اسے اپنے بہترین فضائل میں شمار کرتے تھے جیسا کہ ایرانی لوگ بخل میں بہت زیادہ مشہور تھے۔ سہل نے یہ رسالہ تصنیف کر کے سخاوت اور بخل کی قیمت میں تبدیلی کرنی چاہی ہے۔ چنانچہ اس نے کرم اور سخاوت کو ایک برائی ثابت کیا ہے اور بخل کو ایک بڑی فضیلت۔ "زہر الاداب"[3] کے مصنف نے ان صاحب کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں جن سے ان کی شعوبیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان اشعار میں وہ اپنی ایرانیت پر فخر کرتا اور عربیت کی مذمت کرتا ہے۔ اور وہ میدان میں اپنے ایک گھر کا مقابلہ ایک دوسرے عربی گھر سے کرتا ہے اور کہتا ہے۔

---

[1] الفہرست صفحہ ۱۰۰-۹۹ [2] الفہرست صفحہ ۱۲۰

أَجَعَلْتَ بَيْتَنَا فَوْقَ رَابِيَةٍ

فَرَعَ النُّجُومَ كَأَنَّهُ نَجْمُ

كَبُيَيْتِ شَعْرٍ وَسْطَ مَجْهَلَةٍ

بِفِنَائِهِ الْجِعْلَانُ وَالْبُهْمُ

کیا تو نے اس گھر کو جو ایک اونچے ٹیلہ پر ہو۔جس کے کنگرے ستاروں سے سرگوشیاں کر رہے ہوں اور وہ خود بھی ایک ستارہ معلوم ہوتا ہے اس ادنی خیمہ کے برابر کر دیا ہے جو کسی جہالت کدہ کے وسط میں کھڑا ہو اور جس کے صحن میں بکریوں کے چھوٹے چھوٹے کالے کبرے بچے دوڑ رہے ہوں۔

علان شعوبی نے بھی —— یہ بھی اصل کے اعتبار سے ایرانی ہے —— ایک کتاب "المیدان فی المثالب" کے نام سے تصنیف کی تھی۔ابن الندیم نے کہا ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں عربوں کی بڑی توہین کی ہے اور ان کی برائیاں گنائی ہیں۔تیم ابن مرہ کی بھی۔ اسد بن عبد العزٰی کی بھی اور بنو مخزوم کی بھی۔ اس میں عرب کے سارے ہی قبیلے گنا دیئے گئے ہیں اور سب کی برائیاں بیان کر دی گئی ہیں[۵۱]۔

---

[۵۱] الفہرست صفحہ ۱۰۵—۱۰۶

اور ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ نے ـــــ یہ نحو اور اخبار عرب کے مشہور ترین علماء میں سے تھے اور ان کی اصل ایران کے یہودیوں میں سے تھی ـــــ بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں عربوں پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں کتاب لصوص العرب (عرب کے چوروں سے متعلق کتاب) "کتاب ادعیاء العرب" "کتاب فضائل الفرس"[۱] ابن خلکان نے ان کے بارہ میں کہا ہے کہ وہ عربوں کو ناپسند کرتے تھے اور ان کی برائیوں میں انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں[۲]۔ ابن قتیبہ نے اس طعن و تشنیع کی نوعیت کی صورت بیان کی ہے جسے ابو عبیدہ کام میں لاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابو عبیدہ نے مفاخر عرب کا بیان کیا اور ان کا مذاق اڑایا۔ انھوں نے بتایا کہ عرب کے لوگ حاجب کی کمان پر بڑا فخر کرتے اور اس کی وفاداری پر بڑا ہی ناز کرتے تھے۔ اس کے بعد اس کی خود بھی ہنسی اڑائی اور لوگوں کو بھی ہنسایا۔ اور حاجب کے کردار کا مذاق اڑایا۔ بتایا کہ اس کی کمان کی لکڑی نہایت ہی ذلیل قسم کی تھی جس کی قیمت بہت ہی معمولی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا۔

أَيَا ابْنَةَ عَبْدِ اللهِ، وَ ابْنَةَ مَالِكٍ

وَ يَا ابْنَةَ ذِى الْبُرْدَيْنِ وَالْفَرَسِ الْوَرْدِ

---

[۱] الفہرست صفحہ ۵۴ [۲] ایضاً صفحہ ۱۵۵ جلد ۲

اے اللہ کے ایک بندہ کی بیٹی! اور مالک کی بیٹی۔ اے اس شخص کی بیٹی جس کے پاس دو چادریں تھیں اور جس کے پاس ورد نامی گھوڑا تھا۔

چنانچہ وہ شعر کا مذاق اڑاتا ہے اور مذاق اڑاتے ہوئے تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ یہ بھی کوئی تعریف کی بات ہو سکتی ہے کہ اس لڑکی کے باپ کے پاس دو چادریں تھیں اور ورد نامی ایک گھوڑا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کا مقابلہ ایران کے بادشاہوں اور ان کے تاجوں کے ساتھ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ پرویز کے اصطبل میں نوسو پچاس ہاتھی بندھے ہوئے ہوا کرتے تھے۔ اس کی خدمت کے لیئے ہر وقت ایک ہزار باندیاں پرے باندھے رہتی تھیں۔ اس کے کمرہ میں جس سے ہو کر اندر محل میں جاتے تھے ایک ہزار برتن سونے کے سجے ہوئے تھے۔[1]

برائیوں کی ان کتابوں میں — بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ — کسی قبیلہ کے کسی ایک گھرانے کی کوئی بات لے لی گئی جو قابلِ عار تھی۔ یا کسی ایک فرد کا کوئی ایسا قابلِ مؤاخذہ عمل یا کوئی جرم لے لیا گیا اور اسے لے کر پورے قبیلہ کو بدنام کرنے کے لیئے سارے عرب میں اس کی اچھی طرح تشہیر کر دی گئی اور ثابت کیا گیا کہ عرب کے لوگ ایسے ہوتے ہیں جبکہ ان کتابوں میں جو ایرانیوں کے مناقب

---

[1] رسائل البلغا صفحہ ۲۷۱ و مابعدہا

وفضائل میں لکھی گئی تھیں ایرانیوں کی کوئی اچھی عادت لے لی گئی یا ان کے بادشاہوں کی عظمت، فوجی نظام، ملکی سیاست کی قسم سے کوئی چیز لے لی گئی اور اس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ سارے ایرانی ایسے ہوتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم تک ان کتابوں میں سے —— جہاں تک مجھے معلوم ہے —— کوئی کتاب نہیں پہنچ سکی۔ جیسا کہ ہم تک کوئی ایسی کتاب بھی نہیں پہنچ سکی جو خود شعوبیت کے دعوے کے بیان میں لکھی گئی ہو۔ ہم تک ان کے چیدہ چیدہ اقوال اور خالی خالی آرا ہی پہنچ سکی ہیں۔ ان میں سے زیادہ اہم وہ باتیں ہیں جو امام جاحظ کی کتاب "البیان والتبیین" میں اور ابن عبد ربہ کی کتاب "العقد الفرید" میں یا ابن قتیبہ کی کتاب "العرب" میں نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں۔

ظاہر یہ ہے کہ ان کتابوں کے ضائع ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے شعوبیت کے اس رجحان کو اسلام کے خلاف رجحان شمار کیا۔ لہذا انھوں نے اس موضوع پر تصنیف شدہ کتابوں کو نقل کرنے سے احتراز برتا بلکہ ان کتابوں کو ضائع اور معدوم کر دینے ہی میں خدا کا تقرب سمجھا۔ جو لوگ مخلص تھے انھوں نے اس رجحان سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا۔ جیسا کہ زمخشری نے اپنی کتاب "المفصل" کے شروع ہی میں خدا کا اس پر شکر ادا کیا ہے کہ اس نے ان کے دل میں عربوں کے لئے عصبیت پیدا کر دی اور شعوبیت کے رجحان کی طرف میلان سے محفوظ رکھا۔

لٹریچر پر اہل شعوبیت کے اثرات

ان علمائے شعوبیت نے جن کا تذکرہ ہم نے کیا ہے عربوں کی برائیوں پر مشتمل کتابیں تصنیف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے لٹریچر میں گھڑ گھڑ کر ایسے گھٹیے کہانیاں بھی شامل کر دیں جو ان کے مقصد کو پورا کرنے والی تھیں۔ یہ قصے کہانیاں سرتاپا ان کی من گھڑت ہوتی تھیں۔ یہ بات ظاہری جنگ سے زیادہ عربوں کے لئے نقصان دہ تھی کیونکہ اس کا توڑ بہت ہی دشوار تھا اور ان کے غلط ہونے پر واقف ہونا اور اس کا ثبوت بہم پہنچانا اور بھی مشکل تھا۔ اس بات کو معلوم کر لینا ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں دو قسم کے طریقے اختیار کئے تھے۔ (پہلا طریقہ) تو یہ تھا کہ وہ شعرائے کے اشعار اور ضرب الامثال کی شرح اور تفسیر میں نہایت ہی شنیع قسم کے قصے گھڑ دیتے تھے۔ مثلاً ابو عبیدہ نے اس ضرب المثل

جَبَانٌ مَا يَلْوِي عَلَى الصَّفِيرِ

(بزدل آدمی سیٹی کی طرف مڑتا بھی نہیں)

کی شرح میں یہی کچھ کہا ہے۔ بکری نے اپنی کتاب "التنبیہ علی اوھام ابی علی القالی فی امالیہ" میں ابو عبیدہ سے ایک شرمناک حکایت نقل کی ہے جسے ہم اس کی شرمناکی کی وجہ سے بیان تک نہیں کر سکتے۔[1]

---

[1] التنبیہ صفحہ ۷۷

ہیثم ابن عدی نے ایک لمبا قصہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبیلۂ تنوخ کا ایک آدمی بنو عامر کے کسی قبیلہ میں آکر اُترا۔ ایک لڑکی باہر آئی اور اس نے اس سے پوچھا کہ تم کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہو؟ اس نے کہا کہ قبیلۂ تمیم سے۔ اس لڑکی نے کہا کہ اچھا تم اسی تمیم سے ہو جس کی شان میں شعراء نے یہ کہہ چھوڑا ہے اور بنو تمیم کی مذمت میں کچھ اشعار پڑھ سنائے۔ اس پر اس آدمی نے کہا کہ نہیں میں قبیلۂ تمیم کا آدمی نہیں ہوں، میں تو قبیلۂ عجل سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لڑکی نے قبیلۂ عجل کی مذمت میں کچھ اشعار سنا دیئے۔ وہ آدمی اسی طرح برابر ایک ایک قبیلہ کا نام لیتا رہا اور وہ لڑکی اس قبیلہ کی مذمت میں کچھ اشعار سناتی رہی حتّٰی کہ عرب کے سارے قبیلوں کے نام وہ لے چکا۔ اور آخر میں جب اس نے اپنے آپ کو بنو ہاشم کے ساتھ منسوب کیا تو وہ لڑکی بولی، تم اس آدمی کو جانتے ہو جس نے یہ اشعار کہے ہیں ؎

بَنِیْ هَاشِمٍ عُوْدُوْا اِلٰی نَخَلَاتِكُمْ

فَقَدْ صَارَ هٰذَا التَّمْرُ صَاعًا بِدِرْهَمٍ

فَاِنْ قُلْتُمُوْا رَهْطُ النَّبِیِّ مُحَمَّدٍ

فَاِنَّ النَّصَارٰی رَهْطُ عِیْسَی ابْنِ مَرْيَمٍ

اے بنو ہاشم! تم اپنے کھجوروں کے درختوں کی طرف لوٹ جاؤ۔ اس کھجور کا بھاؤ ایک درہم میں ساڑھے تین سیر کا ہو گیا ہے۔ اگر تم کہو

کہ ہم نبی صلعم یعنی محمد کا قبیلہ ہیں تو نصاریٰ بھی تو عیسیٰ ابن مریم کا قبیلہ ہیں۔[۱]

یہ حکایت اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ شعوبیت کے من گھڑت قصوں میں سے ایک ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اسے خود ہیثم ابن عدی نے ہی گھڑا ہو اور اس کا مقصد عرب کے تمام قبیلوں کی برائیاں بیان کرنا ہو۔

(دوسرا طریقہ) یہ تھا کہ چیزوں کو ان لوگوں کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا جنھوں نے وہ نہیں کہی تھیں اس راستہ کو انھوں نے اس لیے اختیار کیا کہ عربی لٹریچر کو خراب کر کے اس کے نشانات کو مٹا دیں حتیٰ کہ عربوں کے پاس اپنا کوئی قابلِ اعتماد لٹریچر باقی نہ رہے۔ اور یہی ان کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ اس کی مثال میں ابو عبیدہ کا یہ قول پیش کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے مندرجہ ذیل دو شعروں کے بارہ میں کہا ہے۔ ؎

هَيْنُوْنَ لَيْنُوْنَ أَيْسَارٌ ذَوُوْ كَرَمٍ
سُوَّاسُ مَكْرُمَةٍ أَبْنَاءُ أَيْسَارِ

إِنْ يُسْأَلُوْا الْخَيْرَ يُعْطُوْهُ وَإِنْ خُبِرُوْا
فِي الْجَهْدِ أُدْرِكَ مِنْهُمْ طِيْبُ أَخْبَارِ

---

[۱] یہ حکایت تفصیل کے ساتھ مسعودی کی "مروج الذہب" میں صفحہ ۷۵ جلد ۲ سے لیکر صفحہ ۸۰ جلد ۲ تک پھیلی ہوئی ہے۔

نرم، نازک، فارغ البال، سخی، عزت کے مالک وحاکم، فارغ البالوں
کی اولاد ہیں۔ اگر ان سے مال مانگا جائے تو وہ مال عطا کر دیں اور اگر
کسی مشقت میں ان کی آزمائش کی جائے تو ان سے اچھی اطلاعات حاصل
ہو جائیں۔

ابو عبیدہ نے کہا کہ یہ دونوں شعر عندس کلابی کے ہیں جن سے وہ بنو عمرو غنویین کی تعریف
کر رہا ہے۔ اصمعی اس کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسا ممکن ہی نہیں کہ کوئی کلابی
کسی غنوی کی مدح کرے کیونکہ دونوں قبیلوں میں سخت عداوت تھی[۱]۔ اگر ہم اس
زاویہ نگاہ سے عربی لٹریچر کی تحقیق کریں تو بہت سی باتیں ہمیں اس میں من گھڑت
ملیں گی جس کا مقصد عربوں کا رتبہ کم کرنا اور ان کے لٹریچر کو خراب کرنا ہی تھا۔
اور یہ چیزیں اس کثرت سے ملیں گی کہ ہمارے لئے ان سب کا پتہ لگانا بھی ممکن
نہیں ہوگا۔

اس عہد میں تین آدمی لغت، شعر، اور علوم عرب کے امام مانے جاتے تھے
کہ نہ ان سے پہلے ان جیسے مرتبہ کا کوئی آدمی گذرا ہے نہ ان کے بعد۔ اس علم کا
بڑا حصہ بلکہ کل فی کل جو آج لوگوں کے ہاتھ میں ہے تین آدمیوں ہی سے
لیا گیا ہے۔ یہ تین آدمی۔ ابو زید انصاری، ابو عبیدہ اور اصمعی ہیں[۲]۔ ابو زید

---

[۱] التنبیہ صفحہ ۷۱-۷۲ [۲] المزہر صفحہ ۲۰۲ جلد ۲

انصاری کی شہرت غریب الفاظ اور غریب اصول گرمیر کی یادداشت سے تعلق رکھتی تھی۔ باقی دونوں میں برابر مقابلہ رہا کہ کس کی علمی ریاست کو تسلیم کیا جائے۔ ظاہر ہی ہے کہ اصمعی اپنے عربی ہونے کی وجہ سے عربوں کے لئے تعصب رکھتے تھے اور روایات میں بڑے ہی متشدد تھے۔ صحیح ترین لغات کے علاوہ واہی تباہی باتوں کو نقل کرنا جائز ہی نہیں سمجھتے تھے۔ قرآن اور حدیث کے بارہ میں ان سے کچھ پوچھا جاتا تو وہ اس اندیشہ کے ماتحت جواب نہیں دیا کرتے تھے کہ کہیں ان سے کوئی غلطی نہ ہو جائے[1]۔ کسی مسئلہ میں اپنی رائے سے وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ ان اشعار کی شرح بھی نہیں کرتے تھے جن میں کسی کی ہجو کی گئی ہو۔ وہ ایسے اشعار کی شرح کرنے کو اپنی دینداری کے خلاف سمجھتے تھے[2]۔ کیونکہ ہجو گوئی میں اس آدمی یا اس آدمی کے قبیلہ کا رتبہ گرایا جاتا ہے جس کی ہجو کی جارہی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات عربیت کے بھی خلاف ہے۔ حسن گفتگو اور حسن آواز میں وہ ابو عبیدہ سے امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں ابو عبیدہ کا علم زیادہ وسیع تھا اور تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے وہ اصمعی سے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ ایرانی ہونے کی وجہ سے ایران کی تاریخ سے بھی واقف تھے۔ ان کے آباء و اجداد کیونکہ یہودی تھے اس لئے یہودی تہذیب

---

[1] المزہر للسیوطی [2] المزہر صفحہ ۲۰۸ جلد ۲

ثقافت سے بھی بہرہ یاب تھے۔ اسلامی ثقافت سے تو واقف تھے ہی کیونکہ اسی میں انھوں نے نشو ونما پائی تھی۔ لیکن حسن تعبیر میں اصمعی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ آزاد رائے تھے۔ قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کر دیتے تھے اور اس امر پر اصمعی ان سے مؤاخذہ کیا کرتے تھے[1] ان کے دل میں عربوں کی کوئی عزت نہیں تھی کیونکہ وہ خود عربی نہیں تھے بلکہ ان کے دل میں عربوں کی ناپسندیدگی کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ عربوں کی ہجو اور ان کی برائیاں بیان کرنے میں ان کی زبان بڑی آزادی سے چلتی تھی۔ ان کی وسعت معلومات کی وجہ سے لوگ مرعوب ہو جاتے اور گمراہ ہوتے تھے جیسا کہ اصمعی کی فصاحت اور حسن بیان سے لوگ مرعوب ہو جایا کرتے تھے۔

جاحظ کا بیان ہے کہ "روئے زمین پر کوئی خارجی اور اجماعی ابو عبیدہ سے بڑھ کر تمام علوم کا سب سے زیادہ جاننے والا نہیں تھا۔"[2] لوگ کہا کرتے تھے کہ طالبان علم جب اصمعی کے حلقۂ درس میں جاتے ہیں تو وہ موتیوں کے بازار میں سے مینگنیاں خرید کر لاتے ہیں اور جب وہ ابو عبیدہ کے حلقۂ درس میں جاتے ہیں تو وہ مینگنیوں کے بازار میں سے موتی خرید کر لاتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ اصمعی خوش الحان اور پُر مذاق آدمی تھے، معمولی قسم کے اشعار اور واقعات بھی بیان کرتے تھے تو اُن کی زبان سے معمولی باتیں بھی اچھی اور خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ مگر

---

[1] ابن خلکان صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ [2] ابن خلکان صفحہ ۱۵۴ جلد ۲

علمی اعتبار سے طلبہ کو فائدہ کم ہوتا تھا۔ ابو عبیدہ کے ہاں طلبہ کو سوءِ تعبیر کے باوجود بے شمار فوائد اور بے انتہا علمی نادر معلومات حاصل ہوتی تھیں[1]

ظاہر ہے کہ اصمعی اور ابو عبیدہ اپنے عہد میں ایک الگ فکر کے نمایندہ تھے اصمعی تو عربیت کی نمایندگی کرتے اور عربوں کے لئے تعصب رکھتے تھے۔ انھیں عربوں سے بڑی محبت تھی۔ ان کا مشغلہ عربوں کی جلالتِ شان کا اظہار اور ان کے تذکروں کو پھیلانا تھا۔ اور ابو عبیدہ شعوبیت کی نمایندگی کرتے تھے۔ انھیں عربوں کے عیوب کی تلاش اور ان کا ڈھنڈورہ پیٹنے ہی سے کام تھا دونوں امام تھے اور دونوں کے گرد ایسے لوگ جمع رہتے تھے جو ان کی فکر کی تائید اور مدد کرتے اور اس کے لئے تعصب رکھتے تھے۔ عرب کے لوگ اصمعی کے گرد جمع تھے اور ایران کے لوگ ابو عبیدہ کے گرد۔ اسحٰق بن ابراہیم موصلی کو دیکھئے ـــــ یہ ایرانی ہیں ـــــ فضل بن الربیع سے کہتے ہیں۔

عَلَيْكَ اَبَا عُبَيْدَةَ فَاصْطَنِعْهُ

فَاِنَّ الْعِلْمَ اَتِیْ عُبَيْدَهْ

وَ قَدِّمْهُ ، وَ اٰثِرْهُ عَلَيْهِ

وَدَعْ عَنْكَ الْقُرَيْدَ ابْنَ الْقُرَيْدَهْ

---

[1] ابن خلکان صفحہ ۱۵۶ جلد ۲

ابو عبیدہ کو نہ چھوڑنا۔ اس پر احسانات کرتے رہنا کیونکہ علم ابو عبیدہ کے پاس ہی ہے اسے ہمیشہ مقدم رکھنا اور اصمعی پر اسے ترجیح دینا۔ چھیری کے بیٹے چھیڑی کا خیال چھوڑو۔ یعنی اصمعی کو لے کر کیا کرو گے۔

ابو الفرج اصفہانی کا بیان ہے کہ اسحٰق موصلی برابر رشید کے سامنے اصمعی کے عیوب گنتا رہتا اور بتاتا رہتا کہ اس میں ممنونیت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ وہ بڑا ہی بخیل اور کمینہ خصلت انسان ہے۔ اس پر احسانات کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس ابو عبیدہ میں ثقاہت، سچائی، سخاوت اور علم ہے۔ یہی کچھ وہ فضل بن الربیع وزیر سلطنت کے سامنے کہتا رہتا تھا۔ اس کی برابر یہی کوشش رہی حتیٰ کہ دربار میں اصمعی کی وہ عزت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی اور لوگوں کی نگاہوں میں اصمعی بہت ہی گر گئے۔ ان لوگوں نے مل کر ابو عبیدہ کو بڑھا دیا اور اس کی شان کو اونچا کر دیا۔[۱]

ابو نواس کو دیکھئے ـــــ ابو نواس کا ایرانی رجحان تو مسلم ہے ـــــ وہ بھی اصمعی پر ابو عبیدہ کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "ابو عبیدہ کی کیا بات ہے اگر لوگ اسے موقع دیں تو وہ اولین و آخرین کی تاریخ ان کے سامنے پڑھ کر سنا سکتا ہے۔ رہ گیا اصمعی تو وہ تو ایک بلبل ہے جو اپنے چہچہوں سے لوگوں کا دل ہی

---

[۱] اغانی صفحہ ۱۰۷ جلد ۵

خوش کر سکتا ہے" دوسری طرف اصمعی کو دیکھئے وہ برامکہ کی مذمت کرتا ہوا کہتا ہے ؎

إِذَا ذُكِرَ الشِّرْكُ فِي مَجْلِسٍ
أَضَاءَتْ وُجُوهُ بَنِي بَرْمَكٍ
وَإِنْ تُلِيَتْ عِنْدَهُمْ آيَةٌ
أَتَوْا بِالْأَحَادِيثِ عَنْ مَزْدَكٍ

جب کسی محفل میں شرک کا تذکرہ ہوتا ہے تو بنو برمک کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے قرآن کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو وہ مزدک کی باتیں بیان کرنے لگتے ہیں۔

ابو عبیدہ ایران کو شہرت دوام بخشنا چاہتا ہے چنانچہ "فضائل الفرس" کے نام سے ایرانیوں کے فضائل میں ایک کتاب تصنیف کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایران کی تاریخ پر بھی ایک کتاب لکھتا ہے جس میں گذشتہ اور موجودہ بادشاہوں کے مختلف طبقات بیان کرتا ہے۔ ان کے واقعات کو پیش کرتا ہے۔ ان کے خطبے نقل کرتا ہے۔ ان کے مختلف شاخ در شاخ نسب نامے بیان کرتا ہے۔ جو شہر اور قصبے انھوں نے آباد کئے تھے ان کو گناتا ہے۔ جو نہریں انھوں نے کھودی تھیں ان کا ذکر کرتا ہے۔ ان کے مختلف گھرانوں کا تذکرہ کرتا ہے اور سرداروں کے ہر فرقے کے خصوصی امتیازات کو ایک ایک کرکے

گنتا ہے۔[1]

شعوبیت کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ ان لوگوں نے ایران کی جو تاریخ نقل کی ہے اسے نہایت ہی خوشنما اور خوشگوار رنگ دیا ہے۔ ایرانی بادشاہوں کی طرف نہایت شاندار پُر حکمت اقوال اور سیاسی استحکامات وغیرہ منسوب کئے ہیں، ایران کو ان لوگوں نے نہایت ہی شان و شکوہ کا لباس پہنایا ہے اور اس میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ایرانی لوگ حضرت اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں جبکہ عرب لوگ اسماعیل ابن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اسحاق علیہ السلام حضرت سارہ کے بیٹے ہیں جو حضرت ابراہیم کی بیوی تھیں اور آزاد تھیں اور اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے بیٹے ہیں جو حضرت ابراہیم کی حرم یعنی باندی تھیں۔ لہٰذا وہ عربوں سے افضل ہیں کیونکہ آزادوں کی اولاد ہیں۔ جبکہ عرب کے لوگ باندیوں کی اولاد ہیں۔[2] یہ ایسا دعویٰ تھا جو علمی اعتبار سے قطعاً غلط ہے۔ یہ بات محض اس لئے گھڑی گئی تاکہ ایرانیوں کی شان بلند کی جا سکے اور اس طرح وہ عربوں پر فخر کر سکیں۔ ساتھ ہی وہ اس کے بھی مدعی تھے کہ ذوالاکتاف شاپور کا لقب تھا جس نے عراق میں عربوں کو شکست دے کر ان کے مونڈھے نکلوا دیئے تھے۔[3]

---

[1] مسعودی صفحہ ۳۱۱ جلد ۱ [2] ملاحظہ ہو رسائل البلغا صفحہ ۲۶۵ [3] مسعودی صفحہ ۱۲۳ ج ۱

سب سے بڑھ کر عجیب وغریب وہ روایت ہے جو نبط کے شعوبیوں نے گھڑ کر حضرت علی ابن ابی طالب کی طرف منسوب کر رکھی تھی کہ کسی آدمی نے حضرت علی سے پوچھا۔ "اے امیر المؤمنین! ہمیں اپنی اصل یعنی خاندان قریش کی اصل کے متعلق بتائیے تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہم کوثیٰ کے نبطیوں کی ایک قوم ہیں نیز ان لوگوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ ہم یعنی خاندان قریش نبطیوں میں سے ہیں اور کوثیٰ کے باشندے ہیں۔ حضرت علی ہی سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو کوئی ہمارے نسب کے متعلق پوچھنا چاہے تو اسے بتا دو کہ ہم نبطی ہیں اور کوثیٰ کے رہنے والے ہیں[1]۔ بیچارے علماء نے بڑی مشکل سے ان احادیث کے مطلب بتائے چنانچہ کچھ حضرات نے فرمایا کہ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کا مطلب یہ تھا کہ ان کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم نبط سے تھے اور کوثیٰ میں رہتے تھے۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ ان دونوں حضرات کا مطلب ایسا کہنے سے یہ تھا کہ وہ نسبوں پر فخر کرنے سے اپنی بیزاری ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ کچھ اور علماء نے یہ فرمایا کہ کوثیٰ مکہ مکرمہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ لیکن اگر یہ حضرات

---

[1] یہ تمام حدیثیں لسان العرب صفحہ ۸۰۷ جلد ۲ اور معجم یاقوت میں کوثیٰ کے بیان میں ملاحظہ فرمائیے۔ کوثیٰ سواد عراق کا ایک شہر ہے۔

تحقیق اور انصاف سے کام لیتے تو اس طرح کی بجا اس کی تاویل کرنے کی انھیں ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کو بہت زیادہ آسمان پر چڑھایا۔ زہد، حکمت اور علم کی وہ وہ باتیں ان کی طرف منسوب کی ہیں جو کسی دوسرے صحابی کی طرف منسوب نہیں کی گئیں۔ حتیٰ کہ ان کی عمر بھی عام لوگوں کی عمر سے زیادہ ہی گھڑ لی۔ ان کے متعلق کہا گیا کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا تھا۔ ابوالشیخ نے طبقات الاصفہانیین میں نقل کیا ہے کہ اہل علم کہتے ہیں کہ سلمان فارسی تین سو پچاس سال زندہ رہے۔ بہر حال دو سو پچاس سال میں تو علماء کو کوئی شک و شبہ ہی نہیں[1]۔ انھوں نے رسول اللہ صلعم سے ایک روایت نقل کی کہ آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (اگر تم لوگ اسلام سے پھر گئے تو وہ تمھاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا) لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ ہماری جگہ کونسی دوسری قوم لے آئے گا؟ تو رسول اللہ صلعم نے سلمانؓ کے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر ایمان ثریا سے بندھا ہوا بھی ہوگا تو ایران کے کچھ لوگ اسے وہاں سے بھی پالیں گے۔ یہی سلمان وہ ہیں جن کے بارہ میں یہ روایت بھی نقل کی جاتی ہے کہ سلمان، ہم میں سے

---

[1] اصابہ الابن حجر صفحہ ۱۱۳ جلد ۳

ہیں یعنی اہل بیت میں سے۔ یہی وہ بزرگوار ہیں جنہوں نے نبی اکرم صلعم کو خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور اس وقت سے عربوں کو معلوم ہوا کہ خندقوں سے جنگوں میں کس طرح کام لیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس بارہ میں بھی عرب کے لوگ ایرانیوں کے ممنونِ احسان ہیں۔ غرضکہ ایرانیوں نے سلمان فارسی کی شخصیت کو اپنی عظمت کے اظہار کا ایک وسیلہ بنا لیا ہے اور گویا کہ مسلمانوں پر ان کا بہت ہی بڑا احسان ہے۔[۱]

حدیث کی دنیا میں تو ایرانیوں کو ایک بڑا وسیع میدان مل گیا۔ بے شمار حدیثیں ایرانیوں کی فضیلت میں گھڑ گھڑ کر انھوں نے معتمد صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب کر دیں۔ مثلاً یہ روایت کہ عجمیوں کا تذکرہ رسول اللہ صلعم کے سامنے کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے ان عجمیوں پر تم سے کہیں زیادہ اعتماد ہے۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ان کے کچھ لوگوں پر مجھے تمھارے کچھ لوگوں سے زیادہ

---

[۱] ان لوگوں نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلعم نے حضرت علیؓ کو ایک یادداشت لکھوائی تھی۔ اس یادداشت میں یہ بات بھی لکھوائی تھی کہ رسول اللہ صلعم نے سلمان کا فدیہ ادا فرمایا تھا اور ان کا ولاء حضرت علیؓ کو عطا فرما دیا تھا۔ یہ یادداشت جمادی سنہ ایک ہجری میں لکھوائی گئی تھی۔ خطیب بغدادی نے اس یادداشت کی علمی حیثیت کے نہایت دقیقہ سنجی کے ساتھ پرخچے اڑا دیے ہیں۔ تاریخ خطیب صفحہ ۲۰ جلد ۱ میں اس بحث کو ملاحظہ فرمائیے۔

اعتماد ہے[1]۔ ایک تیسری روایت میں ہے کہ "عنقریب عجم کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ جو دمشق کے علاوہ تمام شہروں پر قابض ہو جائے گا"[2]

ایک حدیث میں ہے کہ ایران کو برا نہ کہو، کسی نے آج تک ایران کو برا نہیں کہا مگر اس سے جلد یا بدیر انتقام ضرور لیا گیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے پیچھے پیچھے کالی بکریاں چل رہی ہیں۔ پھر کچھ سفید بکریاں بھی آپ کے پیچھے ہولیں اور وہ اتنی زیادہ ہیں کہ کالی بکریاں ان میں گم ہو کر رہ گئیں۔ نبی اکرم صلعم نے یہ خواب حضرت ابوبکر صدیق کو سنایا اور فرمایا کہ کالی بکریاں عرب کے لوگ ہیں جو اسلام لے آئیں گے اور سفید بکریاں عجم کے لوگ ہیں جو ان کے بعد اسلام لائیں گے اور وہ اتنے زیادہ ہوں گے کہ عرب کے لوگ ان میں گم ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے آج صبح ہی ایک خاص فرشتہ نے اس کی خبر دی ہے[3]۔ اسی قبیل سے وہ بے شمار حدیثیں ہیں جو امام ابو حنیفہ —— آپ ایرانی الاصل ہیں —— کے سلسلہ میں گھڑی گئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلعم نے ان احادیث میں آپ ہی کی طرف اشارہ فرمایا تھا یا تصریح فرما دی تھی۔ مثلاً یہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر علم ثریا سے لٹکا ہوا بھی ہوگا تو اسے ایران کا ایک آدمی ضرور پالے گا"۔ یا مثلاً روایت ہے کہ "آدم نے

---

[1] تیسیر الوصول صفحہ ۱۱۱ جلد ۳ [2] ایضاً صفحہ ۱۲۷ جلد ۳ [3] محاضرۃ الادبار للاصفہانی صفحہ ۲۱۹ جلد ۱

مجھ پر فخر کیا تھا اور میں اپنی امت کے ایک آدمی پر فخر کرتا ہوں جس کا نام نعمان ہوگا اور کنیت ابو حنیفہ ہوگی وہ میری امت کا ایک چراغ ہوگا۔" اور یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلعم نے فرمایا کہ تمام انبیاء مجھ پر فخر کرتے رہے ہیں اور میں ابو حنیفہ پر فخر کرتا ہوں۔ جس نے اس سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ اور جس نے اس سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔[۱]

سچ بات یہ ہے کہ عربوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جن میں عربوں کے لیے تعصب تھا ان چیزوں کا مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کیا۔ انھوں نے بھی عربوں کی فضیلت میں حدیثیں گھڑ گھڑ کر ڈھیر لگا دیئے۔ مثلاً یہ حدیث ملاحظہ ہو کہ "جس نے عربوں سے فریب کیا وہ میری شفاعت میں داخل نہیں ہوگا اور نہ اسے میری محبت مل سکے گی۔" اور مثلاً "جب لوگوں میں اختلاف ہو تو حق وہ ہے جس پر مُضر ہوں۔" اور مثلاً "عربوں کے ساتھ تین وجہوں سے محبت کرو۔ اس لیے کہ میں عربی ہوں اور اس لیے کہ قرآن عربی ہے اور اس لیے کہ جنت میں جنت والوں کی زبان عربی ہوگی۔" ان میں سے سب سے زیادہ پُر لطف وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلعم خود سلمان فارسی کے ساتھ گفتگو فرماتے ہیں۔ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "اے سلمانؓ! مجھ سے عداوت نہ رکھنا ورنہ تم دین سے خارج ہو جاؤ گے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو ابن عابدین اور اس کا حاشیہ صفحہ ۵۴-۵۵ جلد ۱

سلمان کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے رسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ سے عداوت رکھوں حالانکہ خدا نے آپ کے ذریعہ سے مجھے ہدایت دی ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ بس عربوں سے عداوت نہ رکھنا کہ اس طرح تم مجھ سے عداوت رکھنے کے مرتکب ہو گے[1] الخ۔ اسلامی تعلیمات جو مساوات کی دعوت دیتی ہیں اور یہ سکھاتی ہیں کہ فضیلت کا مدار محض تقویٰ پر ہے، ایرانیوں یا عربوں یا کسی تیسری قوم کی محض ان کی جنسیت کی بنا پر کسی قسم کی تعریف کرنے سے انکار کرتی ہیں۔

ہمیں ہر علم میں اس شعوبیت کی ٹانگ اڑی ہوئی ملتی ہے حتیٰ کہ فقہ میں بھی۔ مثال کے طور پر ذرا کتاب النکاح میں کفارت کا باب پڑھ جائیے۔ آپ

علم پر اہل شعوبیت کے اثرات

ملاحظہ فرمائیں گے کہ خود ائمۂ فقہ پر تو اس عصبیت نے کچھ اثر نہیں کیا تھا۔ چنانچہ امام مالک کو دیکھئے وہ عربی ہیں مگر انھوں نے نکاح میں کفارت کا اعتبار نہیں کیا۔ ان کے نزدیک ایک ایک عجمی آدمی عربی عورت سے شادی کر سکتا ہے اور عورت کے ولی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ کا مذہب ـــــ امام صاحب ایرانی الاصل ہیں ـــــ اس بارہ میں یہ ہے کہ کفارت کا اعتبار کیا جائے گا۔ چنانچہ قریش کے سب خاندان، آپس میں ایک دوسرے

---

[1] ابن قتیبہ فی رسائل البلغاء صفحہ ۲۹۳

کے کفو ہیں۔ لیکن غیر قریشی آدمی ایک قریشی کا کفو نہیں ہے۔ عجمی آدمی ایک عربی عورت کے لئے کفو نہیں ہے۔ لیکن بہت جلد ہمارے سامنے ایک دوسرا نظریہ آجاتا ہے جو بحث کی بساط پر آجانے کے بعد عربی عصبیت کے بڑے حصہ کو منہدم اور کالعدم کر دیتا ہے۔ اور وہ نظریہ یہ ہے کہ علمی شرافت نسبی شرافت سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ قاضی خاں میں ہے۔ صاحب حسب آدمی، صاحب نسب کا کفو ہو سکتا ہے۔ لہذا عجمی عالم ایک عربی جاہل مرد اور عورت بلکہ علوی خاندان کی عورت کا بھی کفو ہو سکتا ہے کیونکہ علم کی شرافت نسبی شرافت پر مقدم ہے[1]۔ ان لوگوں نے کہا کہ یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ امام ابوحنیفہ یا امام حسن بصری جیسے آدمی بھی جو عربی النسل نہیں تھے ایک جاہل قریشی لڑکی کے کفو نہیں ہو سکتے یا ایک ایسی عربی لڑکی کے کفو نہیں بن سکتے جو اپنی ایڑیوں پر پیشاب کر لیتی ہو[2]۔ اگر ہم ہر علم میں شعوبیت کے اثرات گنانا شروع کریں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ شعوبیت اس عہد میں پروان چڑھی جو علوم کی

---

[1] سرخسی کی مبسوط میں ہے کہ سفیان ثوری عرب تھے مگر ان میں تواضع تھی چنانچہ ان کے نزدیک موالی عربوں کے کفو ہو سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ موالی میں سے تھے ان میں بھی تواضع تھی۔ انھوں نے خود کو عربوں کے برابر کا نہیں سمجھا۔ صفحہ ۲۲ جلد ۵

[2] ابن عابدین صفحہ ۴۰۹ جلد ۲

تدوین کا زمانہ تھا۔ چنانچہ ہر علمی حرکت جو بعد میں پیدا ہوئی اس کی بنیاد انہی علوم پر استوار ہوئی جن کی تدوین بنو عباس کے اس شعوبیت آشنا دور میں ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کوئی علم مدوّن صورت میں موجود نہیں تھا۔ اس بناء پر شعوبیت کے اثرات کی تحقیق کرنا اور ان کی نشاندہی کرنا اور بھی مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اگر ہمارے پاس اموی عہد حکومت کی مدوّن کی ہوئی کوئی تاریخ ہوتی تو ہم سمجھ سکتے کہ عباسی عہد خلافت میں شعوبیوں نے کیا کیا کھیل کھیلے۔ اسی طرح اگر ہمارے پاس ایران کی کوئی معتمد تاریخ ایرانی دورِ حکومت کی مدوّن شدہ ہوتی تو ہم وضاحت کے ساتھ اس امر کا پتہ لگا سکتے کہ ان شعوبیوں نے اس دور کو کس طرح مصنوعی طور پر خوشنما بنایا تھا۔ اسی طرح اگر عربوں نے اپنے ابتدائی زمانۂ اسلام میں کچھ کتابیں، انسابِ عرب، مناقبِ عرب، اور مثالبِ عرب میں تصنیف کی ہوتیں اور وہ ہم تک پہنچ جاتیں تو ہم یہ معلوم کر سکتے کہ ان شعوبیوں نے عربوں کے انساب کو خراب کرنے اور ان کی شان کو گرانے کے لئے کیا کیا چیزیں گھڑی تھیں۔ یہی حال تمام علوم کا ہے۔ لیکن تقدیر نے تدوینِ علوم کے زمانہ کا جوڑ شعوبیت کے دبدبہ سے ملا دیا اور یہ علم کے لئے بڑی ہی بدقسمتی کی بات ہوئی علماء نے بڑی کوششیں کیں کہ شعوبیت کے اسرار و خفایا کا پتہ لگائیں اور علم میں اس کے آثار کی نشاندہی کر سکیں لیکن اس کے لئے میدان ان کے سامنے ہمیشہ وسیع رہے گا اور تحقیق و تفتیش ہمیشہ اپنے گہوارہ ہی میں رہے گی۔

اس کے ساتھ ساتھ شعوبیت کا ایک اچھا پہلو بھی تھا۔ شعوبیت اس وقت پیدا ہوئی جبکہ ہر اس چیز کی عظمت و عزت کی جاتی تھی جس پر عربی چھاپ ہوتی تھی۔ عربی نسب۔ عربی زبان۔ عربی رائے۔ عربی عادات و رسوم غرض ہر چیز تقدس کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ شعوبی حضرات نے تمام چیزوں کو تنقید و تحلیل کی کسوٹی پر رکھ دیا۔ انساب عرب پر انھوں نے تنقید کی جیسا کہ ابو عبیدہ نے بڑے غلو کے ساتھ کہا۔ وہ ان لوگوں کی تردید کرتے تھے جو اپنے آپ کو غلط طور پر عربوں سے منسوب کرتے تھے اور ثابت کرتے تھے کہ یہ نسبت جھوٹی اور گھڑی ہوئی ہے۔ کتاب الاغانی میں ابو عبیدہ کی بہت سی ایسی چیزیں ہمیں ملتی ہیں۔ انھوں نے عربی زبان پر تنقید کی چنانچہ سیبویہ کو دیکھئے وہ علم نحو پر اپنی کتاب میں خود عربوں کی بعض غلطیاں نکالتے ہیں۔ عرب کے لوگ مدعی تھے کہ بلاغت صرف انہی کا حصہ ہے۔ شعوبیت نے اس کا جواب دیا کہ دنیا میں اور بھی بہت سی قومیں ہیں ان کے ہاں بھی بلاغت ہے۔ ان کے بھی خطبے ہیں۔ ان کی بھی ضرب الامثال ہیں جو کسی طرح عربوں کی ضرب الامثال سے فروتر نہیں ہیں وہ متنبہ کرتے تھے کہ عربوں کی عادات و رسوم ہی عادات و رسوم کا اعلیٰ معیار نہیں ہیں۔ جہاں ان کی عمدہ اور محمود عادتیں ہیں وہاں ساتھ ہی کچھ رذیل اور مذموم عادتیں بھی ہیں۔ اس تنقید و جرح نے بعض وجوہ سے ایک بہت ہی عمدہ نتیجہ پیدا کیا۔ اور وہ یہ تھا کہ تمام دوسری اقوام کی یہ ساری باتیں بھی سامنے آجائیں تاکہ مکمل طور سے مقابلہ کیا جا سکے۔ عربی کلمات

کے سامنے فارسی کلمات رکھے گئے۔ عربی بلاغت اور بصائر و حکم کے مقابلہ میں اجنبی حکم اور اجنبی بلاغت رکھی گئی۔ عربی لٹریچر اور عربی نظام کے مقابلہ میں ایرانی نظام اور اجنبی لٹریچر کو لایا گیا۔ وغیر ذلک ـــــ یہ بات ـــــ بلاشبہ ـــــ علم و عقل کے لئے بڑی ہی مفید ہوئی۔

البتہ! اگر شعوبیت اس حد تک ہی محدود رہتی اور وہ عربوں کے خلاف ان کے محاسن کو برائیوں میں تبدیل کرنے کا بیڑا نہ اُٹھاتی، کبھی سچ اور کبھی جھوٹ ان کی تضحیک و تشہیر نہ کرتی، دین کو زندقہ کے ساتھ خراب کرنے کی کوشش نہ کرتی، علم کو جھوٹی اور من گھڑت باتوں کے ساتھ خراب نہ کرتی ـــــ اگر وہ صرف اسی حد تک اکتفا کرتے تو ان کا یہ فعل بہت ہی اچھا ہوتا۔ لیکن انھوں نے اس سلسلہ میں افراط سے کام لیا۔ لہذا وہ خود بھی بڑے گھاٹے میں رہے اور علمی دنیا میں ناپسندیدہ اور معتوب بھی قرار پائے۔
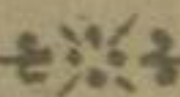
فصل چہارم

غلام اور تہذیب پر انکے اثرات

اسلام میں غلامی کا قانونی موقف

اس سے پہلے کہ ہم غلاموں اور ان کے اثرات سے گفتگو کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسلامی مملکت میں غلامی کے قانونی موقف کی مختصر سی وضاحت کر دیں۔ یعنی بالفاظِ دیگر یہ بتا دیں کہ اس پر کیا اسلامی احکام منطبق ہوتے تھے۔

اسلامی تعلیمات کا یہ فیصلہ ہے ——— یا کم از کم ——— ان مبادی کا یہ فیصلہ ہے جن سے ائمہ نے اصول احکام مستنبط کئے ہیں[1] اور اسی پر

---

[1] اسلامی تعلیمات یا اسلامی مبادی کا نام لینا غلط ہے۔ قرآن نے غلامی کے رواج کو قطعاً

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

آج تک ـــــ یعنی اس عہد تک جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں ـــــ اسی پر عمل ہوتا تھا کہ غلامی کا سبب کسی کافر کا جنگ میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آجانا ہے۔ چنانچہ مسلمان جب کفار سے جنگ کریں تو محاربین میں سے جو لوگ گرفتار ہو جائیں امام کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کو غلام بنالے جیسا کہ اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس شہر کے تمام باشندوں کو جسے اس نے جنگ کر کے فتح کر لیا ہے غلام بنالے۔ مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی[۱] یہ کفر اور قید ہو جانا، یہی دونوں باتیں غلامی کا سبب ہوتے ہیں۔ غلامی باقی رہنے کے لئے اس کے سبب کا باقی رہنا ضروری نہیں ہے۔ اگر کوئی کافر گرفتار ہو کر غلام بنالیا جائے اور اس کے بعد وہ مسلمان ہو جائے تو غلامی اس سے دور نہیں ہوگی[۲] یہ غلام مال شمار ہوتے ہیں۔ ان کا حال بعینہ وہی ہے جو دوسرے سامان کا ہوتا ہے۔ جنگ میں جو لوگ غلام بنالئے جائیں وہ مال غنیمت کا اسی طرح ایک حصہ شمار ہوتے ہیں جیسے آلات جنگ، نقود اور گھوڑے وغیرہ۔ بہرحال ان کی مثال بعینہٖ ان قابل قیمت چیزوں کی طرح ہوتی ہے جو فاتحین کے قبضہ میں

(صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) بند کر دیا ہے اور اس کی ایک اسلامی معاشرہ میں کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ ملاحظہ ہوں سورہ محمد کی متعلقہ آیات۔ [۱] اس سلسلہ میں فجر الاسلام کے ترجموں میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ [۲] تحریر صفحہ ۱۸۰ جلد ۲

آجائیں۔ ان چیزوں کا حال یہی ہوتا ہے کہ امام ان کو دارالاسلام کی طرف منتقل کر لیتا ہے۔ پھر ان کا پانچواں حصہ امام لے لیتا ہے تاکہ اسے عام مصالح میں خرچ کر سکے یعنی فقرار اور مساکین کو دیدے اور دوسرے نیکی کے مختلف مصارف میں خرچ کر دے۔ رہ گئے باقی چار خمس تو وہ ان لوگوں پر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں جو جنگ میں شریک رہے ہوں۔ غلاموں کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا جاتا ہے۔ ان کا پانچواں حصہ مصالح عامہ کے لئے ہوتا ہے اور باقی جنگ کرنے والوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ جنگ کرنے والوں پر تقسیم کرتے ہوئے سوار اور پیادہ کے درمیان امتیاز رکھا جاتا ہے۔ یعنی بعض فقہار کے قول میں سوار کو دو حصے ملتے ہیں اور پیادہ کو صرف ایک حصہ ملتا ہے۔ اس طریقہ سے جو ہم نے بیان کیا ہے غلاموں کو تقسیم کیا جاتا تھا۔

ابتدار اسلام میں جنگیں چونکہ مسلسل ہوتی ہی رہتی تھیں جن میں فتح عموماً مسلمانوں کی ہوتی تھی اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ مفتوحہ ممالک اور مغلوب اقوام کا کوئی شمار نہیں تھا۔ اس سے ہم اس بات کا تصور کر سکتے ہیں کہ غلاموں کی تعداد کتنی بے شمار ہوتی ہوگی۔ اور وہ کس قدر مختلف اور متنوع ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ جن قوموں سے مسلمان برسر جنگ رہتے تھے وہ خود مختلف انواع واجناس سے تعلق رکھتی تھیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ غلام کس طرح تقسیم کئے جاتے تھے اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح جنگ

کرنے والے مسلمانوں میں پھیل گئے ہوں گے اور ان کے ایک ایک گھر میں داخل ہو گئے ہوں گے۔ پھر چونکہ ان غلاموں کو قطعاً مال کی طرح سمجھا جاتا تھا اور ان پر خرید و فروخت، اجارہ اور رہن کے تمام مالی معاملات جاری ہوتے تھے اس لئے ہم آسانی کے ساتھ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ غلام صرف جنگ کرنے والے سپاہیوں تک ہی محدود نہیں رہتے تھے بلکہ تمام لوگوں کو ان پر دسترس حاصل تھی۔ ان کے بازار ہوا کرتے تھے جہاں سے جو چاہتا ان کو خرید لیتا اور جس طرح چاہتا ان سے خدمت لیتا۔[1]

یہ گفتگو محض مالی جہت سے تھی۔ رہ گیا جنبی جہت سے مردوں کا تعلق باندیوں کے ساتھ۔ تو اسے ہم مختصراً اب بیان کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں دو ذریعے ہیں جو ایک عورت کو مرد کے لئے حلال کر دیتے ہیں۔

---

[1] جہاں تک اس عہد کا تعلق ہے جس کی تاریخ بیان کی جا رہی ہے۔ مصنف نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ تاریخی حیثیت سے صحیح ہو مگر تاریخ کے اس المیہ کو قرآن اور اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ قرآن کریم نے غلامی کی رسم کو قطعاً بند کر دیا تھا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کتاب "تین اہم مسائل"۔

ان میں سے ایک ذریعہ تو عقد نکاح کا ہے اور دوسرے ملک یمین کا۔ جہانتک
عقد نکاح کا تعلق ہے تو ایک آزاد آدمی کے لیئے چار عورتوں سے زیادہ سے
شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ یعنی اس کے لیئے یہ جائز نہیں ہے کہ ایک وقت
میں اس کے نکاح کے اندر چار بیویوں سے زیادہ ہوں۔ لیکن اس کے لیئے
یہ جائز ہے کہ وہ ان چار میں سے کچھ کو طلاق دیدے اور ان کی عدت گذر جانے
کے بعد ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے شادی کرلے۔ اکثر فقہار کا یہی مسلک
ہے۔ کچھ فقہار کے دوسرے اقوال بھی ہیں جن کو بیان کرنے کا یہ موقع نہیں
ہے ــــ یہ حکم عام ہے۔ یہ چاروں بیویاں آزاد بھی ہو سکتی ہیں اور باندیاں
بھی ــــ اس موضوع میں فقہار نے زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا ہے کہ کسی آدمی
کے لیئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی باندی سے نیا عقد نکاح کرے جبکہ اس سے پہلے
اس کے گھر میں ایک آزاد عورت اس کی بیوی کی حیثیت سے موجود ہو۔ البتہ اس
کے برعکس کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یعنی ایک منکوحہ باندی کے ہوتے ہوئے
وہ ایک آزاد عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ اس میں فقہار نے اس امر کا لحاظ رکھا
ہے کہ ایک آزاد بیوی سے شادی کر لینے کے بعد باندی سے نکاح کر لینے میں
اس آزاد بیوی کی توہین اور اس کے شرف اور عزت پر حملہ سمجھا جائے گا۔

دوسرا ذریعہ جو ایک عورت کو ایک مرد کے لیئے حلال کر دیتا ہے "ملک
یمین" ہے یعنی کسی مرد کے لیئے باندی کا مالک ہو جانا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ چند بیویوں میں عدل نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی شادی کرو یا ملک یمین پر اکتفا کرو) اور وَ الَّذِيْنَ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے یا ملک یمین کے کہ ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔)[1] چنانچہ جس کی ملکیت میں کوئی باندی آجاتی اس کے لیے جائز ہوتا کہ وہ اس سے استمتاع کرے وہ اس کے لیے حلال ہوتی تھی خواہ اس سے شادی کرلے یا شادی نہ کرے۔ خواہ اس کے ایک بیوی پہلے سے موجود ہو یا چار بیویاں پہلے سے موجود ہوں۔ مرد پر اس سلسلہ میں کسی تعداد کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے لیے جائز تھا کہ وہ چار تک شادیاں کرلے اور جتنی چاہے باندیاں اپنی ملکیت میں رکھے اور جتنی باندیوں سے چاہے استمتاع کرتا رہے۔

---

[1] یہ حکم آیندہ کے لیے نہیں تھا بلکہ ان باندیوں کے متعلق تھا جو عربوں کے معاشرہ میں پہلے سے چلی آتی تھیں یہی وجہ ہے کہ مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ میں مَلَكَتْ بصیغہ ماضی استعمال ہوا ہے۔ قرآن نے غلامی کے دروازہ کو آیندہ کے لیے بند کردیا تھا۔ جس کی تصریح سورۂ محمد میں ہے۔

خواہ وہ کتنی ہی کثیر التعداد کیوں نہ ہوں۔[۱]

اس وجہ سے ایک اسلامی گھرانے میں ـــــ عموماً ـــــ ایک یا کئی بیویاں ہوتی تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ متعدد باندیاں ہوتی تھیں جن سے گھر کا مالک استمتاع کرتا رہتا تھا۔

آزاد بیویوں اور ان ممتوعہ باندیوں کے درمیان اکثر جھگڑے بھی ہوتے تھے۔ اور ایسا ہونا طبیعی تھا ـــــ حتیٰ کہ بعض اہل لغت نے تو یہ بھی کہا ہے کہ ان باندیوں کو سراری اسی لئے کہا جاتا تھا کہ باندیاں رکھنا عموماً بیویوں میں غیرت کے جذبات کو بھڑکانے کا موجب ہوتا تھا۔ لسان العرب کے مصنف نے بعض علمائے لغت سے نقل کیا ہے کہ سُرِّیَة اس باندی کو کہتے تھے جس سے اس کا مالک استمتاع کرنا چاہتا تھا ـــــ خلافِ قیاس طریقہ پر یہ سِرٌّ کی طرف نسبت ہوتی تھی جس کے معنی اخفار کے ہوتے ہیں۔ لوگ عموماً اس بات کو کہ وہ اپنی باندی سے استمتاع کر رہے ہیں اپنی آزاد بیویوں سے چھپاتے تھے۔ عموماً جب ایک آدمی کی نسل آزاد عورتوں اور باندیوں دونوں سے چلتی تھی تو آزاد بیویوں کی اولاد، باندیوں کی اولاد پر فخر کرتی تھی اور وہ اس بات پر عزت محسوس کرتی تھی کہ اس کی رگوں میں غلامی کا خون نہیں ہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو بدائع صفحہ ۲۶۶ جلد ۳

مثال کے طور پر اس اختلاف کو دیکھئے جو محمد امین اور مامون الرشید کے درمیان تھا۔ دونوں کے دونوں ہارون الرشید کے بیٹے تھے لیکن امین کی ماں آزاد بیوی تھی اور مامون کی ممتوعہ باندی تھی۔ ہم اس قسم کی کئی مثالیں پہلے بھی بیان کر چکے ہیں جن کا تعلق خلفاء کے گھرانوں اور ان کی متنوع اولاد سے تھا۔ رعایا کے گھروں کا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہیں تھا۔ اس ضمن میں ان کے گھر بھی خلفاء کے گھرانوں کا نمونہ ہی تھے۔

یہ غلام جن کا حال ہم نے بیان کیا ہے، مرد ہوں یا عورتیں، انھیں اس وقت تک ان کی آزادی واپس نہیں ملتی تھی جب تک ان کا مالک انھیں آزاد نہ کر دے۔ فقہاء نے غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے اپنی کتابوں میں لمبے لمبے باب بیان کئے ہیں۔ جن میں انھوں نے ان الفاظ کا حکم بتایا ہے جن سے آزادی واقع ہو جاتی تھی اور جو مختلف صورتیں اس ضمن میں پیش آتی تھیں۔ یہاں ہمیں ام الولد کے متعلق کچھ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ام الولد اس باندی کو کہتے تھے جس کے شکم سے اس کے مالک کا کوئی بچہ پیدا ہو جاتا تھا۔ فقہاء نے ایسی باندی کا رتبہ اس باندی سے بلند رکھا ہے جس سے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا ہو۔ اسے بعض وہ حقوق حاصل ہوتے تھے جو دوسری باندیوں کو حاصل نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے اہم ترین حق یہ تھا کہ اس کا مالک (جبکہ وہ اس سے بچے پیدا کر رہا ہو) اسے فروخت یا ہبہ نہیں کر سکتا تھا ــــ جمہور فقہاء کا مذہب یہی ہے ــــ

لیکن جب تک مالک زندہ رہتا وہ اپنے مالک کے لئے حلال رہتی تھی۔ اگر مالک مرجاتا تھا تو وہ آزاد ہو جاتی تھی اور اس پر آزاد عورتوں کے تمام احکام جاری ہوتے تھے۔ جو اولاد اس کے بطن سے پیدا ہوتی تھی وہ بہر حال آزاد ہی ہوتی تھی۔

غلامی کے مسئلہ کی قانونی پوزیشن اس نظام میں جو اس زمانہ میں رائج تھا جس کی تاریخ ہم لکھ رہے ہیں یہی کچھ تھی۔ بہر حال اتنی بات کو جان لینا ان ادبی، علمی اور اجتماعی نتائج کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے جو اس سے پیدا ہوئے۔

مسلمانوں، نصرانیوں اور یہودیوں سب ہی کے ہاں یکساں طور پر غلامی کا رواج تھا۔ لیکن یہود و نصاریٰ کے ہاں ان سے استمتاع کرنے کی شرعًا اجازت نہیں تھی اگرچہ قانون کے خلاف ان میں بھی کچھ لوگ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ابو جعفر منصور نے اپنے طبیب جورجیس ابن بختیشوع نصرانی کو تین حسین وجمیل رومی باندیاں تین ہزار دینار کے ساتھ تحفہ میں بھیجیں تو جورجیس نے باندیاں واپس کردیں۔ منصور نے اس سے پوچھا کہ باندیاں کیوں واپس کردیں۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ ہم نصرانی لوگ ایک بیوی سے زیادہ شادی نہیں کرتے جب تک بیوی زندہ رہے اور اس کے علاوہ کوئی عورت نہیں رکھ سکتے[1]

---

[1] اخبار الحکماء صفحہ ۱۵۹

لیکن دوسری طرف جاحظ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ "طیمانو" جاثلیق کے رئیس نے ارادہ کیا کہ عون عبادی کے اس فعل کو ناجائز قرار دیدے (عون عبادی نصرانی تھا) جبکہ اسے یہ اطلاع ملی کہ عون عبادی نے استمتاع کے لئے باندیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ تو عون نے جاثلیق کو دھمکی دی تھی اور قسم کھالی تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔[۱]

قفطی نے بیان کیا ہے کہ نصاریٰ نے یوحنا بن ماسویہ کے اس فعل پر ناگواری ظاہر کی کہ اس نے باندیاں رکھ چھوڑی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اس سے کہا کہ تم نے ہمارے دین کی خلاف ورزی کی ہے حالانکہ تم ہمارے مذہبی پیشوا ہو۔ یا تو ہمارے طریقہ پر قائم رہو اور ایک بیوی پر اکتفا کرو، اس طرح تم ہمارے مذہبی پیشوا رہ سکتے ہو۔ ورنہ مذہبی پیشوائیت سے الگ ہو جاؤ اور جتنی چاہے باندیاں رکھ چھوڑو۔ یوحنا نے کہا کہ ہمیں انجیل مقدس میں ایک مقام پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم نہ تو عورتیں رکھیں اور نہ دو کپڑے رکھیں۔ وہ کونسا قانون ہے جو جاثلیق کو تو حق دیدیتا ہے کہ وہ ایک کے بجائے بیس کپڑے رکھے اور یوحنا شقی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ چار باندیاں رکھ سکے۔ اپنے جاثلیق سے جاکر کہو کہ وہ اپنے دین کے قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرے تاکہ ہم بھی اس کے ساتھ دین کے قوانین کا لحاظ رکھ سکیں۔

---

[۱] الحیوان للجاحظ صفحہ ۹ جلد ۴

اگر وہ دین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ہم بھی دین کی خلاف ورزی کریں گے۔[1]

بیزنطینی مملکت میں غیر نصرانی رعایا کے لیے اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ نصرانی غلام رکھ سکیں لیکن مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کو اس کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ غلام رکھ سکتے ہیں خواہ وہ غلام مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔
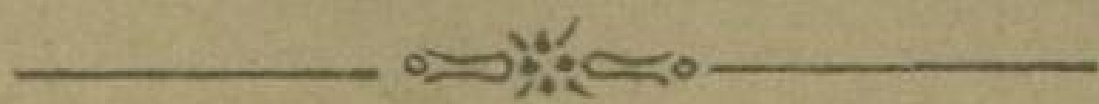
غلاموں کی تجارت

اس عہد میں پوری مملکت اسلامیہ میں غلاموں کی تجارت خوب پھیلی ہوئی تھی۔ بغداد میں ایک سڑک کا نام ہی "شارع دار الرقیق" (غلاموں کے بازار کی سڑک) پڑ گیا تھا۔[2] امین اور مامون کے درمیان جنگ ہوئی تو یہ بازار لوٹ لیا گیا تھا۔ کسی شاعر نے ایک لمبے قصیدہ میں اس کا مرثیہ کہا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

وَ مَھْمَا اَنْسَ مِنْ شَیْءٍ تَوَلّٰی

فَاِنِّیْ ذَاکِرٌ دَارَ الرَّقِیْقِ

میں کتنی ہی باتیں جو اس سلسلہ میں ہوئی ہیں بھول جاؤں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں غلاموں کے بازار کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

غلاموں کی تجارت کرنے والے کو نخّاس کہا جاتا تھا ـــ یہ لفظ در اصل

---

[1] اخبار الحکماء صفحہ ۳۸۷ [2] مسعودی صفحہ ۲۴۱ جلد ۲

چوپایوں کی تجارت کرنے والوں کے لیے تھا۔ اس عہد میں بغداد کے اندر بہت سے نخاس مشہور تھے۔ ان کی شہرت کا سبب یہ تھا کہ ان کے پاس نہایت حسین و جمیل باندیاں ہوتی تھیں جن کے پاس اکثر شعراء اور ادباء آتے جاتے تھے۔ چنانچہ محلۂ کرخ میں ایک نخاس تھا جس کی کنیت "ابوعمیر" تھی۔ اس کے پاس کئی گانے والی باندیاں تھیں جو بہت پُر مذاق تھیں۔ اس کی باندیوں میں ایک باندی "عبادہ" تھی جس کے عشق میں عبداللہ محمد بن الیواب گرفتار تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ ؎

لَوْ تَشَکّیٰ اَبُوْ عُمَیْرٍ قَلِیْلاً
لَاَتَیْنَاہُ مِنْ طَرِیْقِ الْعِبَادَہْ
فَقَضَیْنَا مِنَ الْعِیَادَۃِ حَقًّا
وَ نَظَرْنَا فِیْ مُقْلَتَیْ "عَبَادَہْ"

اگر ابوعمیر ذرا سا بیمار ہو جائے تو ہم مزاج پُرسی کرنے کے لیے اس کے ہاں ضرور جائیں۔ اس طرح مزاج پُرسی کا حق بھی ادا ہو جائے اور عبادہ کی سرمگین آنکھیں بھی دیکھنے کو مل جائیں۔[1]

ان میں سے ایک ابوالخطاب نخاس تھا جس کے پاس ایک مغنیہ باندی تھی۔

---

[1] اغانی صفحہ ۴۴ جلد ۲۰

"ذَاتُ الْخَالِ" کے لقب سے وہ مشہور تھی۔ ابراہیم موصلی کو اس سے عشق تھا۔[1] ان میں سے ایک اور نخاس "حرب بن عمرو ثقفی" تھا۔ اس کے پاس بھی ایک گانے والی باندی تھی، بغداد کے شعراء، میر منشی، اور اہل ادب برابر اس کے پاس آتے جاتے اور اس کا گانا سنتے تھے۔ اس کے گھر پر بیش قرار رقمیں خرچ کی جاتی تھیں۔ اسے انعامات اور تحائف دیئے جاتے تھے۔ اسی باندی کے بارہ میں اشجع شاعر کہتا ہے۔

أَشْكُو الَّذِي لَاقَيْتُ مِنْ حُبِّهَا
وَبُغْضِ مَوْلَاهَا إِلَى الرَّبِّ

مِنْ بُغْضِ مَوْلَاهَا وَمِنْ حُبِّهَا
سَقِمْتُ بَيْنَ الْبُغْضِ وَالْحُبِّ

فَاخْتَلَجَا فِي الصَّدْرِ حَتَّى اسْتَوَى
أَمْرُهُمَا فَاقْتَسَمَا قَلْبِي

تَعَجَّلَ اللهُ شِفَائِي بِهَا
وَعَجَّلَ السُّقْمَ إِلَى حَرْبِ

میں اپنے پروردگار سے اس کیفیت کی شکایت کرتا ہوں جو مجھے

---

[1] اغانی صفحہ ۵۰ جلد ۱۷

باندی کی محبت اور اس کے مالک کے رقیبانہ بغض کی وجہ سے درپیش ہے۔ اس کے مالک کی عداوت اور خود اس کی محبت کی وجہ سے میں بغض اور محبت کے دوگونہ عذاب سے بیمار ہو رہا ہوں۔ دونوں کیفیتیں میرے سینے میں ہیجان بپا کرتی رہتی ہیں اور میرا دل ان دونوں کیفیتوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ خدایا مجھے تو اس باندی کے ذریعہ سے جلد از جلد شفا دیدے اور حرب بن عمر (مالک) کو جلد از جلد بیمار ڈال دے[1]۔

"ابو دلامہ شاعر کا ایک نخاس پر گذر ہوا جو غلام اور باندیاں فروخت کرتا تھا۔ ابو دلامہ نے اس کے پاس ایک سے ایک بڑھ کر حسین باندی دیکھی۔ وہ وہاں سے بڑا ہی کبیدہ خاطر لوٹا اور مہدی کے دربار میں حاضر ہو کر اپنا قصیدہ سنایا جس میں اس نے نخاسی کے پیشہ کو شعر گوئی پر ترجیح دی۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

إِنْ كُنْتَ تَبْغِي الْعَيْشَ حُلْوًا صَافِيًا

فَالشِّعْرَ اَغْنِ بِهٖ وَكُنْ نَخَّاسًا

اگر تو شیریں اور صاف زندگی گذارنا چاہتا ہے تو شعر گوئی ترک کردے اور نخاس بن جا۔

آزاد منش ادیب نخاسوں پر ان کے پیشہ کی وجہ سے رشک کرتے تھے لیکن اکثر

---

[1] اغانی صفحہ ۱۲۸ جلد ۹

غلام اس پیشہ کو ناپسند اور نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ کچھ لوگ امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ان سے ان کے پیشوں کے متعلق سوال کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ غلام فروخت کرتے ہیں۔ امیر معاویہؓ نے فرمایا کہ یہ تجارت تو بہت ہی بری ہے۔ ایک جان کی ذمہ داری اور اتنا ذرا سا نفع جس سے ڈاڑھ بھی گرم نہ ہو۔[۱]

ان غلاموں کی تجارت کرنے والوں پر افسران حکومت میں سے ایک آفیسر مقرر ہوتا تھا جو ان کے اعمال کی نگرانی کرتا اور ان کے تجارتی کاروبار پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ اس آفیسر کو "قیّم الرقیق" (غلاموں کا منتظم) کہتے تھے۔

یہ غلام مختلف انواع کے ہوا کرتے تھے ان میں سے کچھ تو سیاہ رو ہوتے تھے۔ اس قسم کا اہم ترین بازار مصر، جزیرۂ عرب کا جنوبی حصہ اور شمالی افریقہ تھا۔ قافلے جنوب کی طرف سے ان غلاموں کو لیکر جاتے اور سونا لے کر آتے تھے۔ سنہ ۵۰۰ھ میں ایک غلام کی قیمت عموماً دو سو درہم کے لگ بھگ ہوا کرتی تھی۔ کافور اخشیدی حبشی جو آگے چل کر مصر کا بادشاہ ہوا اپنے ابتدائی زمانہ میں سنہ ۳۱۲ ہجری میں اٹھارہ دینار (ایک سو اسی درہم) میں فروخت ہوا تھا کیونکہ وہ خصی تھا۔[۲] اس کے بارہ میں

---

[۱] عیون الاخبار صفحہ ۲۵۰ جلد ۱ [۲] اغانی صفحہ ۲۷ جلد ۲۰

متنبی نے ناراض ہو کر کہا تھا

مَنْ عَلَّمَ الْاَسْوَدَ الْمَخْصِیَّ مَكْرُمَةً
اَقَوْمُهُ الْبِيْضُ اَمْ اٰبَاۤؤُهُ الصِّيْدُ

اَمْ اُذْنُهٗ فِيْ يَدِ النَّخَّاسِ دَامِيَةٌ
اَمْ قَدْرُهٗ وَهُوَ بِالْفَلْسَيْنِ مَرْدُوْدُ

وَذَاكَ اَنَّ الْفُحُوْلَ الْبِيْضَ عَاجِزَةٌ
عَنِ الْجَمِيْلِ فَكَيْفَ الْخِصْيَةُ السُّوْدُ

سیاہ روخصی سے کسی فضیلت کا کون پتہ لگا سکتا ہے۔ کیا اس کی قوم سفید رو ہے یا اس کے آبا و اجداد شریف ہیں۔ کیا اسکے کان دیکھیں جو نخاس کے ہاتھ میں خون آلودہ ہو رہے ہیں یا اس کی قدر اور مرتبہ دیکھیں جو یہ ہے کہ دو ٹکے میں فروخت کر دیا جائے تو خریدنے والا اسے واپس کر دے۔ سفید رو جو امرد بھی آجکل تو اچھے کاموں سے عاجز آگئے ہیں تو سیاہ روخصی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

ان غلاموں میں سے گورے چٹے بھی ہوتے تھے۔ ان میں زیادہ مشہور ترک اور صقلبی تھے۔ لوگ صقلبی غلاموں کو ترکوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ یہ بات ہمیں خوارزمی کے اس ایک فقرہ سے معلوم ہوتی ہے جو کتاب "یتیمۃ الدہر" میں انھوں نے لکھا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے۔ "صقلبی غلام نہ ملنے کی صورت میں

ترکی غلام سے خدمت لی جاتی ہے[۱] گورے غلاموں کی تجارت کی اہم ترین منڈی شہر سمرقند تھا۔ شہر سمرقند اس قسم کے بہترین غلام مہیا کرنے میں بہت مشہور تھا۔ مملکت اسلامیہ میں اور یورپ میں غلاموں کی تجارت بہت بڑھ گئی تھی اور یورپ کے اطراف وجوانب میں ان کی تجارت کرنے والے یہودی ہوا کرتے تھے۔[۲]

غلاموں کی مختلف انواع اور ہر نوع کے امتیازات

غلاموں کی انواع میں سے ہر نوع کے خصوصی امتیازات ہوتے تھے جن میں وہ مشہور تھے۔ ہندوستانی باندیاں نازو انداز، نزاکت، صبر وسکون اور بچوں کی عمدہ پرورش میں مشہور تھیں۔ لیکن وہ بہت جلد لاغر ہو کر سوکھ جاتی تھیں۔ ہندوستانی غلام گھر کے انتظام، دستکاریوں کی مہارت وغیرہ میں مشہور ہوتے تھے لیکن ان میں یہ عیب ہوتا تھا کہ عین جوانی میں وہ یکبارگی مرجاتے تھے۔ ہندوستانی غلام اور باندیاں زیادہ تر "قندھار" سے لائی جاتی تھیں۔ سندھ کی باندیاں لاغر پہلو اور لمبے بالوں میں مشہور ہوا کرتی تھیں۔ وہ باندیاں جن کی پیدائش مدینہ منورہ میں ہوتی تھی (یعنی وہ باندیاں جن کی نشوونما اور تربیت مدینہ منورہ میں ہوتی تھی) ناز و انداز

---

[۱] یتیمہ صفحہ ۱۱۶ جلد ۴۔ صقالیہ کا لفظ ان اجناس پر بولا جاتا تھا جو بلغاریہ سے لے کر حدود قسطنطنیہ تک سکونت رکھتے تھے۔

[۲] MEZ ۵۲۔

ہنس مکھ ہونے، خوش رہنے اور عشق و محبت کی باتیں کرنے میں زیادہ شہرت رکھتی تھیں۔ ان میں بہترین مغنیہ بننے کی عمدہ استعداد ہوتی تھی۔ وہ باندیاں جن کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی ہوتی نازک کلائیوں اور کھلے جوڑوں اور خمار آلود آنکھوں کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتی تھیں۔ بربری (یعنی مغرب کی) باندیوں کا عمدہ بچے پیدا کرنے میں جواب نہیں تھا۔ ان کی عادات اور اخلاق نرم ہوتے تھے اس لئے ان میں اس کی صلاحیت زیادہ ہوتی تھی کہ جس قسم کے کام کا جی چاہے انھیں عادی بنایا جا سکتا تھا۔ باندیوں کا بلند ترین معیار — جیسا کہ ابو عثمان دلال نے بیان کیا ہے — یہ تھا کہ "اس کی اصل تو بربرے ہو مگر اپنی عمر کے نویں سال میں اپنے ملک سے جدا ہو گئی ہو۔ اس کے بعد تین سال تک مدینہ منورہ میں اور اتنے ہی سال مکہ مکرمہ میں رہی ہو۔ اور سولھواں سال لگنے پر عراق میں آ گئی ہو تا کہ یہاں کی تہذیب کے رنگ میں رنگی جائے۔ اس کے بعد جب پچیس سال کی عمر میں اسے فروخت کیا جائے تو اس میں تمام خوبیاں جمع ہو چکی ہوں گی۔ اصل کی عمدگی، مدنی عورتوں کا ناز و انداز، مکی عورتوں کی نزاکت اور عراقی عورتوں کی تہذیب و مدنیت۔"

سوڈانی غلام تمام بازاروں میں اٹے پڑے رہتے تھے۔ یہ بے صبری اور بے توجہی اور غیر ذمہ داری میں مشہور تھے۔ ساتھ ہی ڈھول بجانے اور ناچنے کی طرف رغبت رکھنے میں بھی ان کی کافی شہرت تھی۔ لعاب کی کثرت کی وجہ سے

ان کے دانت خدا کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ سفید اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ عموماً ان کی بغل میں بو ہوتی ہے اور چھونے میں جلد کھردری ہوتی ہے۔ ان وجہوں سے انھیں زیادہ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔

حبشی باندیاں کمزور اور ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہیں۔ ان میں سینہ کے امراض کی زیادہ استعداد ہوتی ہے۔ سوڈانی باندیوں کے برعکس نہ اچھا گا سکتی ہیں نہ ناچ سکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اخلاقی اعتبار سے نہایت قوی اور قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ وہ اس کی اہل ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔

ترکی باندیاں گوری چٹی، نہایت حسین وجمیل ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں مگر ان میں ایک قسم کی جاذبیت ہوتی ہے۔ عموماً فربہ اور چھوٹے قد کی ہوتی ہیں۔ ان کے بچے بکثرت ہوتے ہیں۔ شریف اور پاکیزہ ہوتی ہیں۔ استمتاع کے لئے بہترین مگر ساتھ ہی قطعاً بھروسہ اور اعتماد کے قابل نہیں ہوتیں۔

رومی باندیاں گوری چٹی سرخی مائل ہوتی ہیں۔ ان کے بال نہایت عمدہ ہوتے ہیں آنکھیں نیلگوں ہوتی ہیں۔ مطیع و فرمانبردار ہوتی ہیں۔ جس قسم کے حالات میں ہوں ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہیں۔ مخلص اور قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ رومی غلام بھی گھر کا انتظام بہت اچھا کرتے ہیں اور ہر امر میں ضبط و نظم کو پسند کرتے ہیں۔ خرچ کرنے میں میانہ روی ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ فنون جمیلہ میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔

گوری جنس میں سب سے بدتر ارمنی ہوتے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے اچھے ہوتے ہیں مگر ان کے پاؤں نہایت بدشکل ہوتے ہیں۔ عفت اور پاکدامنی تو جانتے ہی نہیں۔ ان میں چوری عام ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت اور بات کرنے کے انداز میں ایک طرح کا کھردراپن ہوتا ہے۔ اگر تم کسی ارمنی کو ذرا دیر کے لئے بیکار چھوڑ دو تو وہ کسی ایذارسانی کی تیاری میں لگ جائے گا۔ وہ محض ڈر کی وجہ سے کام کرتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہر وقت اس کے لئے لاٹھی اٹھائے رکھو اور ڈانتے ڈپٹتے رہو تاکہ تمھاری منشا کے مطابق کام کرتا رہے۔[۵۱]

بہر حال غلام اور خاص طور سے باندیاں مختلف انواع سے تعلق رکھتی تھیں ہندی۔ سندھی۔ مکی۔ مدنی، سوڈانی، حبشی، ترکی، رومی، اور ارمنی ــــ جاحظ نے نخاسوں کے پاس غلاموں کے ان انواع کو کبوتروں کے رنگوں سے تشبیہ دی ہے۔ صقلبی باندیوں کو انھوں نے سفید رنگ کی کبوتریوں سے اور زنجی باندیوں کو سیاہ رنگ کی کبوتریوں سے تشبیہ دی ہے۔[۵۲]

---

۵۱ یہ ٹکڑا ہم نے MEZ کی کتاب سے ترجمہ کیا ہے جو درحقیقت اس کا خلاصہ بھی ہے۔ MEZ نے یہ باتیں ایک رسالہ سے نقل کی ہیں جو ابن بطلان نے غلام خریدنے کے بارہ میں تصنیف کیا تھا۔ یہ رسالہ برلن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہمیں مصر میں اس کی عربی اصل نہیں مل سکی۔ ۵۲ الحیوان صفحہ ۵۰، جلد ۳

اس بات نے خلفاء اور امراء کے محلات کو مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے غلاموں اور باندیوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ ان کی طبیعتیں، عادتیں اور زبانیں مختلف تھیں۔ طبری نے بیان کیا ہے کہ مامون جب فضل پر ناراض ہوا تو اسے مامون کے چار غلاموں نے قتل کیا تھا جن کے نام غالب مسعودی حبشی، قسطنطین رومی، فرج دیلمی اور موفق صقلبی تھے[1]۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خلیفہ متوکل کے پاس چار ہزار ممتوعہ باندیاں تھیں جو طبیعت کے لحاظ سے مختلف جنسوں سے تعلق رکھتی تھیں[2]۔ ایک مرتبہ روز سعانین (نصاریٰ کی عید کا دن) میں احمد بن صدقہ مامون کی خدمت میں حاضر ہوا تو مامون کے حضور میں اس وقت بیس رومی باندیاں دست بستہ کھڑی تھیں۔ ان کے گلوں میں بدھیاں پڑی ہوئی تھیں۔ رومی دیباج کے لباس سے آراستہ پیراستہ تھیں۔ ان کے گلوں میں سونے کی صلیبیں لٹک رہی تھیں۔ اور ہاتھوں میں تنکے اور زیتون لئے ہوئے تھیں۔ مامون نے اس سے کہا۔ احمد! تیرا ناس ہو۔ میں نے ان کے بارہ میں چند اشعار موزوں کئے ہیں۔ ذرا انھیں مجھے گا کر تو سنا دو۔ اس کے بعد مامون نے یہ اشعار سنائے۔

ظِبَاءٌ كَالدَّنَانِيرِ   مِلَاحٌ فِي الْمَقَاصِيرِ

جَلَاهُنَّ السَّعَانِينُ   عَلَيْنَا فِي الزَّنَانِيرِ

---

[1] ابن جریر صفحہ ۲۵۰ جلد ۱۰ [2] مسعودی صفحہ ۳۰ جلد ۲

وَ قَدْ زَرَّفْنَ اَصْدَاغًا ۔۔۔ كَاَذْنَابِ الزَّنَابِيْرِ
وَ اَقْبَلْنَ بِاَوْسَاطٍ ۔۔۔ كَاَوْسَاطِ الزَّنَابِيْرِ

ہرنیاں ہیں، دیناروں کی طرح سُرخ اور ملیح، اپنے بالاخانوں میں۔
سعانین کی عید نے انھیں بدھیاں پہنا کر ہمارے سامنے اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ کانوں میں ایسے آویزے لٹکا رکھے ہیں جیسے زرزیر کی دُمیں۔
زنبور کی پتلی اور نازک کمر کی طرح نازک اور پتلی کمروں کے ساتھ وہ آرہی ہیں۔

احمد نے یہ اشعار مامون کو گا کر سنائے وہ شراب پیتا رہا اور باندیاں اس کے سامنے رقص کرتی رہیں[1]۔

مروان بن ابی حفصہ نے ہارون رشید کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تو ہارون رشید نے اسے مال و دولت اور دس رومی غلام انعام میں مرحمت فرمائے[2]۔ محمد بن شغوف ہاشمی کے پاس تین گانے والے غلام تھے۔ ان میں سے دو صقلبی تھے خاقان اور حسین۔ خاقان بہترین گویا تھا۔ اور حسین درمیانہ درجہ کا گویا تھا مگر وہ اس کے ساتھ بہترین سازندہ بھی تھا۔ تیسرا غلام جس کا نام حجاج تھا نہایت حسین اور رومی طرز پر گانے والا تھا[3]۔

---

[1] اغانی صفحہ ۱۳۰ جلد ۱۹ [2] طبری صفحہ ۱۱۴۴ جلد ۱۰ [3] اغانی صفحہ ۵۳ جلد ۱۵

بشار کے پاس ایک سیاہ رنگ کی باندی تھی جس کے بارہ میں وہ کہتا ہے۔

وَ غَادَةٍ سَوْدَاءَ بَرَّاقَةٍ

كَالْمَاءِ فِيْ طِيْبٍ وَفِيْ لِيْنٍ

كَأَنَّهَا صِيْغَتْ لِمَنْ نَالَهَا

مِنْ عَنْبَرٍ كَالْمِسْكِ مَعْجُوْنٍ

بعض نازک اندام، سیاہ پانی کی طرح چمکدار، عمدہ اور نرم لڑکیاں ایسی ہیں گویا کہ وہ اپنے مالک کے لئے مشک کی طرح گوندھے ہوئے عنبر سے ڈھال کر بنائی گئی ہیں۔

ابوالشیص شاعر کے پاس ایک سیاہ رنگ کی باندی تھی جس سے اُسے عشق تھا۔ اس کے بارہ میں وہ کہتا ہے۔

يَا ابْنَةَ عَمِّ الْمِسْكِ الذَّكِيِّ وَمَنْ

لَوْلَاكِ لَمْ يُتَّخَذْ وَ لَمْ يَطِبِ

نَاسَبَكِ الْمِسْكُ فِي السَّوَادِ وَفِي الرِّ

يْحِ فَأَكْرِمْ بِذَاكِ مِنْ نَسَبِ

خوشبودار مشک کے چچا کی لڑکی اور وہ کہ اگر تو نہ ہوتی تو نہ مشک بنائی جاتی اور نہ وہ خوشبو دیتی سیاہی اور خوشبو میں مشک کو تیرے ساتھ نسبت ہے اور کتنی اچھی ہے یہ نسبت[1]۔

---

[1] اغانی صفحہ ۱۱۱ جلد ۱۵

ابراہیم ابن مہدی کے پاس ایک رومی باندی تھی جو گھر کی صفائی کرتی تھی اور عربی اچھی طرح نہیں بول سکتی تھی[۱]۔ مہدی کے پاس ایک نصرانی لونڈی تھی جو ہر وقت اپنے سینہ پر سونے کی ایک صلیب لٹکائے رہتی تھی[۲]۔ بہر حال اس کی مثالیں بہت دیجا سکتی ہیں ــــ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ اکثر کوئی گھر بھی کسی نہ کسی باندی یا غلام سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ مختلف جنسوں، مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے تصریحات بالا سے یہ بھی دیکھ لیا کہ خلفاء اور امراء نے اپنے ان غلاموں اور باندیوں کو دین ومذہب کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ بعض مرتبہ لونڈی نصرانی ہوتی تھی اور وہ صلیب اور زنار پہنتی تھی۔ وہ اپنا قومی لباس پہنتی اور اپنی زبان میں گفتگو کرتی تھی کیونکہ اسے عربی بولنی نہیں آتی تھی۔ ان باتوں کے اپنے نتائج تھے جن پر ہم آگے چل کر متنبہ کریں گے۔

باندیوں کی تعلیم وتربیت
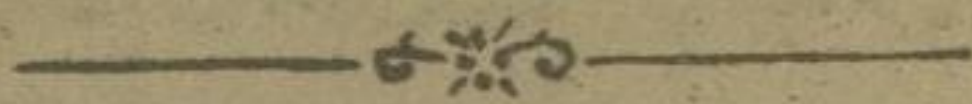
عباسیوں نے باندیوں کو تعلیم دینے پر ــــ ان کی مختلف انواع کے مطابق ــــ خصوصی توجہ سے کام لیا۔ وہ زیادہ تر انھیں گانے بجانے کی تعلیم

---

[۱] اغانی صفحہ ۱۱ جلد ۹ [۲] طبری صفحہ ۳۰ جلد ۱۰

دیتے تھے۔ گانا بجانا ان کے عہد میں بہت زیادہ پھیل گیا تھا بلکہ انسان کی بنیادی ضروریات میں سے شمار ہونے لگا تھا۔ گانے والے اور گانے والیاں پبلک مقامات سڑکوں، خلفار کے محلات، مالداروں اور فقیروں کے مکانات غرضکہ ہر جگہ نظر آتی تھیں۔ لوگوں کا ذوق گانے بجانے میں حیرتناک طریقہ پر بڑھتا جا رہا تھا۔ کتابیں اس کی حکایتوں اور تذکروں سے بھری پڑی ہیں۔ لوگوں کو گانے بجانے کا اتنا شوق ہو گیا تھا کہ کوئی گویا کسی پُل پر گانا شروع کر دیتا تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور یہ ڈر ہونے لگتا کہ کہیں پل ہی نہ ٹوٹ کر گر جائے[1] اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ عمدہ گانے کے اثر سے مسحور ہو کر لوگ ستونوں سے سروں کو ٹکرا دیتے تھے[2] خود خلفار اور ان کی اولاد بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی کہ نئے نئے سُر نکالیں اور ان میں گائیں۔ چنانچہ صاحب اغانی کا بیان ہے کہ واثق اور منتصر دونوں خلیفہ نہایت خوش آواز تھے اور دونوں گاتے تھے اور بہت عمدہ گاتے تھے[3] انھوں نے اس موضوع سے متعلق ایک طویل اور مستقل باب باندھا ہے جس میں بتایا ہے کہ خلفار کی اولاد نے گانے کے فن میں کیا کیا کاریگریاں دکھائی تھیں[4]۔ عُلَیّہ کو جو خلیفہ مہدی کی صاحبزادی ہیں تہتر راگوں پر قدرت حاصل تھی۔ احمد بن داؤد قاضی کا بیان ہے کہ میں گانے کو بہت ناپسند کرتا اور گانے والوں پر

---

[1] اغانی صفحہ ۱۲۷ جلد ۱۰ [2] اغانی صفحہ ۱۵۶ جلد ۱۵ [3] اغانی صفحہ ۱۶۲ جلد ۸ [4] اغانی صفحہ ۳۵/۷ و نیز جلد نہم

طعن و تشنیع کیا کرتا تھا۔ ایک دن معتصم شماسیہ کی طرف نکل کر گئے ان کے ساتھ تعیش و تنعم کے پورے ساز و سامان تھے۔ انھوں نے شراب نوشی شروع کی اور میری تلاش میں آدمی بھیجا۔ میں پہنچا۔ میں ذرا قریب پہنچا تو گانے کی آواز سنی۔ اس گانے نے مجھے وارفتہ کر دیا اور ہر چیز سے بے خبر بنا دیا حتیٰ کہ کوڑا میرے ہاتھ سے گر گیا۔ میں اپنے غلام کی طرف متوجہ ہوا کہ اس سے اس کا کوڑا مانگ لوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ بقسم! میرا کوڑا ابھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آخر تمھارا کوڑا کیوں ہاتھ سے گر گیا؟ وہ کہنے لگا کہ میں ایک ایسی آواز سن رہا ہوں جس نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس عالم بے خبری میں کوڑا میرے ہاتھ سے کہیں گر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس پر بھی بعینہٖ وہی اثر ہوا ہے جو مجھ پر ہوا تھا۔ قاضی احمد بن داؤد فرماتے ہیں کہ میں گانے کے ساتھ سازوں کے استعمال کو بہت ہی برا سمجھتا تھا کیونکہ وہ لوگوں کو وارفتہ کر دیتے اور ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں معتصم سے مناظرے کیا کرتا تھا۔ جب میں اس کے حضور میں اس دن حاضر ہوا تو میں نے اس دن کا واقعہ اسے سنایا جسے سن کر وہ بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ یہ میرے چچا مجھے گا گا کر یہ شعر سنا رہے تھے جس سے تم اتنے مسحور ہو گئے۔

إِنَّ هٰذَا الطَّوِيْلَ مِنْ اٰلِ حَفْصٍ

نَشَرَ الْمَجْدَ بَعْدَ مَا كَانَ مَاتَا

خاندانِ حفص کے اس لمبے آدمی نے بزرگی اور عظمت کو پھیلا دیا
ہے اس کے بعد کہ وہ مردہ ہو گئی تھی

اگر تم نے اپنے مناظروں سے توبہ کر لی ہو جو تم گانے کی مذمت میں ہم سے کرتے رہتے ہو تو میں ان سے درخواست کروں کہ وہ اس شعر کو دوبارہ گائیں۔ چنانچہ میں نے توبہ کی اور انھوں نے وہ شعر دوبارہ گایا۔ میں اس سے کہیں زیادہ مسحور ہو گیا جتنا میں دوسروں کے متعلق سنا کرتا اور اس پر اعتراض کیا کرتا تھا۔ اُس دن سے میں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا[1]۔

گانے کے ساتھ اس شغف نے ان لوگوں کو اس پر راغب کیا کہ وہ باندیوں کو گانے کی تعلیم دلائیں، تاکہ جہاں ان کا حسن و جمال جنت نگاہ ہو ساتھ ہی ان کا گانا بھی ان کے لئے فردوس گوش بن سکے۔ گانا سیکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں عربی ادب بھی سیکھنا پڑتا تھا کیونکہ لوگ ان دنوں زیادہ تر عربی کے فصیح و بلیغ اشعار ہی گانے میں پسند کرتے تھے مثلاً عمر بن ابی ربیعہ، بشار بن برد، مسلم بن الولید اور ابو العتاہیہ وغیرہ کے اشعار۔ گانے والی ان کے اشعار کو اس وقت تک کامیابی کے ساتھ نہیں گا سکتی تھی جب تک اس قسم کے بہت سے اشعار اُسے یاد نہ ہوں اور حروف کے مخارج کو اچھی طرح ادا نہ کر سکے۔ اس طرح اُسے

---

[1] اغانی صفحہ ۵۵ جلد ۹

کافی لٹریچر پر عبور حاصل کرنا ضروری ہوتا تھا۔

بلکہ ہم نے تو گانے والیوں کے متعلق ایسی بہت سی روایات دیکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گاتی تھیں تو اشعار اور راگ سب خود ان کی اختراع ہوا کرتے تھے۔

ابو دلامہ شاعر کہتا ہے۔

هٰذِي رِسَالَةُ شَيْخٍ مِنْ بَنِي اَسَدٍ
يُهْدِي السَّلَامَ اِلَى الْعَبَّاسِ فِي الْكُتُبِ

تَخُطُّهَا مِنْ جَوَارِ الْمِصْرِ كَاتِبَةٌ
قَدْ طَالَمَا ضَرَبَتْ فِي اللَّامِ وَالْاَلِفِ

وَ طَالَمَا اخْتَلَفَتْ صَيْفًا وَ شَاتِيَةً
اِلَى مُعَلِّمِهَا بِاللَّوْحِ وَالْكَتِفِ

حَتّٰى اِذَا نَهَدَ الثَّدْيَانِ وَ امْتَلَأَ
مِنْهَا وَ خِيفَتْ عَلَى الْاِسْرَافِ وَالْقَرَفِ

صِينَتْ ثَلَاثَ سِنِينَ مَا تَرَى اَحَدًا
كَمَا يَصُونُ تِجَارٌ دُرَّةَ الصَّدَفِ

یہ بنو اسد کے ایک بوڑھے آدمی کا خط ہے جس میں وہ عباس کو اپنا سلام بھیجتا ہے یہ خط ان چند صحیفوں کے ساتھ بھیجا جا رہا ہے جو

مصر کی باندیوں میں سے ایک لکھنے والی باندی نے لکھے ہیں جس نے
لام اور الف (حروف نویسی) کی بڑی ہی مشق بہم پہنچائی ہے۔
سردی اور گرمی میں وہ عرصہ دراز تک تختی اور دفتی لے کر اپنے استاد
کے پاس کتابت کا فن سیکھنے کے لئے جاتی رہی حتیٰ کہ اس کے
پستان اُبھر آئے اور بھر گئے اور اس کے متعلق یہ اندیشہ کیا جانے
لگا کہ کہیں وہ کسی لغزش میں آکر کسی بُرائی میں گرفتار نہ ہو جائے
تو تین سال سے اسے پردہ میں بٹھا کر اس کی اس طرح حفاظت کی
جاتی ہے کہ وہ کسی آدمی کو بھی نہیں دیکھ سکتی جیسا کہ تجارت پیشہ
لوگ سیپی کے اندر موتی کی حفاظت کیا کرتے ہیں۔

حُریب مغنیہ، باندیوں کو اشعار رواں کرایا کرتی تھی تاکہ وہ انھیں عمدگی
کے ساتھ گا سکیں[۱]۔ امام مبرد کا بیان ہے کہ مجھ سے امام جاحظ نے ابراہیم ابن
السندی سے نقل کیا کہ میرے پاس "حمدونہ" کی باندی "ہاشمیہ" اپنی مالکہ کی
ضرورتوں سے آجایا کرتی تھی۔ جب وہ آتی تھی تو مجھے اپنے حواس بجا کر کے سارے
خطرات ذہن سے نکال کر ہمہ تن ذہن کو اس کی طرف متوجہ کر دینا پڑتا تھا کہ کہیں
وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جائے جسے میں سمجھ نہ سکوں کیونکہ لٹریچر پر اس کی بہت ہی

---

[۱] نشوار المحاضرہ صفحہ ۱۳۲ جلد ا

گہری نظر تھی اور اس بات پر اسے بڑی ہی قدرت حاصل تھی کہ زبان وہ کچھ ادا کرے جو اس کے دل میں ہو ـــــ اس قسم کی باتیں ربطہ بنت ابی العباس کی دونوں باندیوں خالصہ اور عتبہ کے متعلق بھی نقل کی جاتی ہیں[۱]۔

مسعودی کا بیان ہے کہ جب متوکل خلیفہ ہوا تو ابن طاہر نے اسے تحائف وہدایا بھیجے ان میں سو غلام اور باندیاں تھیں۔ ان ہدایا میں ایک باندی تھی جس کا نام "محبوبہ" تھا۔ یہ باندی طائف کے ایک آدمی کے پاس تھی جسے اس نے کافی عربی لٹریچر اور ثقافت کی بڑی گہری تعلیم دی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے اسے مختلف علوم و فنون کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کر دیا تھا۔ اسے ان تمام علوم کی بڑی اچھی بصیرت حاصل تھی جن کی بصیرت بڑے بڑے علماء ہی کو ہو سکتی ہے۔ متوکل اس باندی کی بڑی عزت کرتا تھا۔

لہٰذا باندیاں زیادہ تر ادب اور لٹریچر اور دیگر علوم و فنون اور خصوصیت کے ساتھ گانے کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اور ان تعلیمات کی وجہ سے ان کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکیں گے کہ ایک باندی فروخت کرنے کے لئے پیش کی گئی تو اس کی قیمت تین سو دینار لگائی گئی۔ اس باندی کو ابراہیم بن مہدی نے گانے کی تعلیم دی اور اس کے بعد جب اسے فروخت

---

[۱] الکامل للمبرد صفحہ ۲۷۹ جلد ۲

کے لئے پیش کیا گیا تو اس کی قیمت تین ہزار دینار لگائی گئی[1]۔ عریب مشہور مغنیہ، پانچ ہزار دینار میں فروخت ہوئی تھی[2]۔

دحمان نے ایک باندی دو سو دینار میں خریدی اور اسے تعلیم و تربیت کے بعد دس ہزار دینار میں فروخت کیا[3]۔ ہارون رشید نے موصلی سے ایک باندی چھتیس ہزار دینار میں خریدی تھی کیونکہ ہارون رشید سمجھتا تھا کہ وہ باندی اس کے لائق اور اس کی طبیعت کے مناسب ہے[4]۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ابراہیم موصلی کو جو ہارون رشید کے مغنی تھے ــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ــــ باندیوں کو تعلیم و تربیت دینے اور انھیں مہذب بنانے کا بہت زیادہ سلیقہ اور شوق تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کی۔ ان کے بیٹے کا بیان ہے کہ "لوگ خوبصورت باندیوں کو گانا نہیں سکھاتے تھے بلکہ زرد رو اور سیاہ فام باندیوں کو گانے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے حسین و جمیل باندیوں کو جس نے گانے کی تعلیم دی وہ میرے والد تھے۔ انھوں نے باندیوں کی تعلیم و تربیت پر ہر ممکن سعی فرمائی اور ان کی قدر کو بڑھانے میں بڑا کام کیا۔" اس سلسلہ میں ابو عیینہ شاعر کے یہ اشعار قابل توجہ ہیں۔ ابو عیینہ کو ایک باندی سے عشق ہو گیا تھا، اس باندی کا نام "امان" تھا۔ اس کے مالک نے

---

[1] مروج الذہب صفحہ ۳۹ ج ۲ [2] اغانی صفحہ ۱۰۹ ج ۱۴ [3] اغانی صفحہ ۱۴۳ ج ۵ [4] اغانی صفحہ ۷ ج ۵

اس کی بڑی گراں بہا قیمت مانگی تھی

قُلْتُ لَمَّا رَأَیْتُ مَوْلَی آمَانٍ ... قَدْ طَغَیٰ سَوْمُهُ بِهَا طُغْیَانَا
لَا جَزَی اللّٰهُ الْمَوْصِلِیَّ اَبَا اِسْحٰقَ ... عَنَّا خَیْرًا وَلَا اِحْسَانَا
جَاءَنَا مُرْسَلًا بِوَحْیٍ مِنَ الشَّیْطٰنِ ... اَغْلٰی بِهٖ عَلَیْنَا الْقِیَانَا
مِنْ غِنَاءٍ کَاَنَّهٗ سَکَرَاتُ الْ ... حُبِّ یُصْبِی الْقُلُوْبَ وَالْاٰذَانَا

جب میں نے "امان" کے مالک کو دیکھا کہ وہ اس کی قیمت لگانے میں حدود سے متجاوز ہو گیا ہے تو میں نے کہا۔ خدا ابو اسحٰق موصلی کو ہم لوگوں کی طرف سے جزائے خیر نہ دے اور اس پر احسان نہ کرے۔ وہ شیطان کی طرف سے وحی لے کر، رسول بن کر آیا اور اس نے باندیوں کا نرخ انھیں گانا سکھا کر گراں کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گانا محبت کی سکرات ہے جس سے دل اور کان دونوں یکساں طور پر گرفتار محبت ہو جاتے ہیں۔[1]

ابراہیم موصلی اور یزید حوراء نے باندیوں کو خریدنے اور انھیں گانا سکھانے کے لئے ایک کمپنی بنائی تھی۔ اور نفع میں وہ دونوں شریک تھے۔[2]

٭ ٭٭ ٭

---

[1] اغانی صفحہ ۹ج ۵ [2] اغانی صفحہ ۷۳ جلد ۳

ثقافت اور فنون پر پابندیوں کے اثرات

ان پابندیوں نے ایک نئی قسم کی تہذیب و ثقافت پھیلادی تھی جو عباسیوں جیسی مدنیت میں ناگزیر تھی۔ یہ امر تو ہر مدنیت ہی میں ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ نئی قسم کی تہذیب و ثقافت فنون لطیفہ کا ترقی یافتہ فنی ذوق تھا۔ اس عہد میں حرکتِ علمیہ کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری حرکت بھی چل رہی تھی جو کسی طرح پہلی حرکت سے فروتر یا کم نہیں تھی۔ یہ فنی حرکت تھی۔ اس میں گانا بجانا، نقاشی، صورت گری اور رقص و سرود شامل تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کا جمالیاتی ذوق بڑی شدت کے ساتھ بیدار ہو چکا تھا۔ ان کے شعراء نے خصوصیت کے ساتھ مسلم بن الولید اور ابو نواس وغیرہ نے حسن و جمال کی تعریف، اس میں وارفتگی اور بغیر کسی تکان کے اس میں مشغولیت کے مضامین میں بڑے ہی تفنن سے کام لیا۔ ابو نواس کہتا ہے۔

لِلْحُسْنِ فِي وَجَنَاتِهِ بِدَعٌ

مَا إِنْ يَمَلُّ الدَّرْسَ قَارِيهَا

حسن کے رخساروں میں اس کی ایک عجیب بات ہے۔ ان کا پڑھنے والا اور مطالعہ کرنے والا کبھی تھکتا نہیں۔

جاحظ کا بیان ہے کہ جو کوئی مرغے اور مرغی کو پانی پیتا ہوا دیکھ لے وہ کتنا ہی پیاسا کیوں نہ ہو۔ مرغے اور مرغی کے پانی پینے کی بد ذوقی کو دیکھ کر اس کی

پیاس جاتی رہتی ہے۔ لیکن جو کوئی کبوتر کو پانی پیتا ہوا دیکھ لے وہ کتنا ہی سیراب ہو کر کیوں نہ آرہا ہو مگر کبوتر کے پانی پینے کے حسن کو دیکھ کر اس کا جی بھی چلانے لگتا ہے کہ وہ بھی پانی میں منہ ڈال دے۔[1] اس سے ـــــ بلاشبہ ـــ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دنوں لوگوں کا جمالیاتی شعور کس قدر شدید ہو گیا تھا۔ عتابی ہر مجلس کا جمال اسے شمار کرتا تھا کہ اس کی چھت بھی سرخ رنگ کی ہو اور فرش بھی سرخ رنگ کا ہو۔ بشار کہتا ہے۔

هِجَانٌ عَلَيْهَا حُمْرَةٌ فِي بَيَاضِهَا
تَرُوقُ بِهَا الْعَيْنَيْنِ وَالْحُسْنُ أَحْمَرُ

وہ دوغلی نسل کی ہے۔ اس میں سفیدی کے ساتھ سرخی ملی ہوئی ہے جس سے آنکھیں تر و تازہ ہو جاتی ہیں اور حسن تو نام ہی سرخی کا ہے۔

جیسا کہ ان لوگوں میں جمال صورت کا شعور بیدار ہو گیا تھا اسی طرح جمال معنی کا شعور بھی بیدار ہو چکا تھا۔ چنانچہ حسن روح اور حسن گفتگو کے متعلق بھی انھوں نے اس عہد میں بہت کچھ کہا۔ بشار یہ کہتا ہے کہ

وَكَانَّ رَجْعَ حَدِيْثِهَا قِطَعُ الرِّيَاضِ كُسِيْنَ زَهْرًا

---

[1] الحیوان صفحہ ۳۲ جلد ۵

وَكَأَنَّ تَحْتَ لِسَانِهَا ــــ هَارُوتَ يَنْفُثُ فِيهِ سِحْرًا

وہ جب باتیں کرتی اور باتوں کا جواب دیتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ باغ کی کیاریاں ہیں جس میں پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان کے نیچے ہاروت بیٹھا ہوا ہے جو اس کی ہر بات میں جادو پھونک دیتا ہے۔

اور کہتا ہے۔

وَبِكْرٍ كَنُوَّارِ الرِّيَاضِ حَدِيثُهَا

تَرُوقُ بِوَجْهٍ وَاضِحٍ وَقَوَامِ

بعض کنواری لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کی باتیں باغ کے پھولوں کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ اپنے روشن چہرے اور سیدھے قد سے دلوں پر چھا جاتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جمالیاتی شعور کی بیداری اور اس کے ماتحت فنون لطیفہ کو پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ باندیاں ہی تھیں۔ لوگ اس عہد میں جس کی تاریخ ہم بیان کر رہے ہیں ان باندیوں کے محض جسمانی حسن کے پہلو ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے فنی جمال کے پہلو پر بھی توجہ دیتے تھے تاکہ دونوں طرح کی خوبصورتیاں ان کے پاس جمع ہو جائیں۔ گانے اور ناچنے کی طرف ان کو میلان تھا نئے نئے طرح کے لباسوں کا انھیں شوق تھا۔ وغیر ذلک۔ انھوں نے باندیوں کو یہ فنون

سکھانے شروع کئے۔ اور بہت جلد یہ فنی شعور مردوں سے باندیوں کی طرف منتقل ہوگیا۔ بلند پایہ مغنیوں نے اپنی باندیوں کو اپنے راگ، سُر اور اپنے گانے کا انداز سکھانا شروع کیا۔ چنانچہ ابراہیم موصلی اپنی باندیوں کو اپنے فن کی تعلیم دیتے تھے حتیٰ کہ وہ ان کے فن میں کمال حاصل کر لیتی تھیں۔ عبداللہ ابن طاہر مکمل علمی انداز میں گانا سکھاتے تھے۔ وہ نئے نئے راگ بناتے اور باندیوں کو سکھاتے تھے۔ مغنی ان دنوں دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک تو پرانی جماعت تھی اور دوسری نئی جماعت۔ اسی طرح باندیوں کے بھی دو گروہ ہو گئے تھے کیونکہ جن سے انھوں نے تعلیم پائی تھی خود ان کے دو گروہ تھے۔ کتاب الاغانی گانے والی باندیوں کے حالات زندگی سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً عریب، متیم، بذل، ذات الخال فریدہ وغیرہ۔ صاحب اغانی نے لمبی لمبی فصلوں میں ان باندیوں کے نوادرات اور ان میں سے ہر ایک کے خصوصی امتیازات اور برتری کی انواع بیان کی ہیں۔

اب ہم ان فنون کی کچھ انواع بیان کریں گے جو ان باندیوں نے پھیلائی تھیں۔

ان میں سے سب سے پہلی چیز گانا تھا۔ عمدہ گانوں سے ان باندیوں نے پورے عراق کو بھر کر رکھ دیا تھا۔ لہو و لعب اور عشق و محبت تو اس کے اثرات تھے ہی۔ یہ باندیاں دو طرح کی تھیں۔ ایک تو خاص لوگوں کی باندیاں ہوتی تھیں۔ چنانچہ خلیفہ کی اپنی باندیاں تھیں جو اسے گانا سناتی تھیں اور امراء

اور مالدار لوگوں کی باندیاں بھی اسی طرح کی باندیاں ہوتی تھیں۔ پھر یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو باندیوں کے تحفے دیتے تھے تاکہ ان کے ذوق تجدد کی تسکین ہو سکے کیونکہ ایک ہی طرح کی آواز سنتے سنتے وہ اکتا جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس میں کچھ تبدیلی ہو سکے۔

ایک دوسری قسم عام گانے والیوں کی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بنخاس جوان کا مالک ہوتا کسی مقام پر انھیں گانے کے لئے پیش کرتا جہاں ان کا گانا سننے کے لئے نوجوان جمع ہو جاتے اور ان پر خرچ کرتے۔ اس کا ایک نمونہ وہ حکایت ہے جو صاحب اغانی نے "ابن رامین" کے متعلق نقل کی ہے۔ ابن رامعین کا کوفہ میں اپنا مکان تھا۔ اس کے پاس کئی گانے والی باندیاں تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت "سلامت زرقاء" کی تھی۔ ابن رامعین کوفہ میں سب سے بڑا گانے والی باندیوں کا کاروبار کرنے والا تھا۔ اس کے مکان میں نوجوان گانا سننے اور شراب پینے کے لئے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ شعرا اس کے اور اس کی گانے والی باندیوں کے بارہ میں اشعار کہتے تھے۔ اس کے مکان پر جن لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی ان میں روح بن حاتم مہلبی، محمد ابن الاشعث، معن ابن زائدہ اور ابن المقفع جیسے جلیل القدر لوگ بھی شامل تھے۔ یہ لوگ گانا سنتے اور دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ غزل کے اشعار سناتے تھے۔ جب ابن رامین اپنی ساری باندیوں کو لے کر حج کے ارادہ سے روانہ ہوا تو شعراء نے اس کی مجلس کی

جدائی اور ان لوگوں کی کثرت کے بیان میں جو اس کے گھر پر آیا کرتے تھے اشعار کہے۔ ان میں سے کسی ایک کے یہ اشعار بھی ہیں۔

اَیَّةُ حَالٍ یَا ابْنَ رَامِیْنٍ
حَالُ الْمُحِبِّیْنَ الْمَسَاکِیْنِ
تَرَکْتَهُمْ مَوْتیٰ وَلَمْ یَتْلَفُوْا
قَدْ جَرَّعُوْا مِنْكَ الْاَمَرَّیْنِ
وَسِرْتَ فِیْ رَکْبٍ عَلٰی طِیَّةٍ
رَکْبِ تِهَامٍ وَیَمَانِیْنِ
یَا رَاعِیَ الذَّوْدِ لَقَدْ رُعْتَهُمْ
وَیْلَكَ مِنْ رَوْعِ الْمُحِبِّیْنِ
فَرَّقْتَ جَمْعًا لَا یُرٰی مِثْلُهُمْ
بَیْنَ دُرُوْبِ الرُّوْمِ وَالصِّیْنِ

اے ابن رامین تجھے کچھ معلوم بھی ہے کہ محبت کرنے والے مسکینوں کا کیا حال ہے؟ تو انھیں مُردہ کر کے چھوڑ گیا مگر وہ ختم بھی تو نہ ہو گئے۔ اُنھیں تیری طرف سے دو کڑوی چیزیں گھونٹ گھونٹ کر کے پینی پڑ رہی ہیں۔ تو ایک قافلہ کے ساتھ سواری پر بیٹھ کر چل دیا وہ قافلہ تہامہ اور یمن والوں کا تھا۔ اے اونٹوں کو ہنکانے والے

تو نے انھیں خوف زدہ کر دیا۔ تیرا ناس ہو محبت کرنے والوں کو خوف زدہ
کر دیا۔ تو نے ایک ایسی جماعت کو پراگندہ کر دیا۔ جن جیسی جماعت روم
اور چین کے محلوں میں بھی نہیں مل سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی باندیوں نے معاشرہ کے اندر رندی و آزاد
منشی علانیہ اظہار عشق و محبت کو پھیلا کر بڑے ہی برے اثرات مرتب کئے۔
جس نے رسالہ "ایقان" ــــ جو جاحظ کی طرف منسوب ہے ــــ یا کتاب
"موشّٰی" میں گانے والیوں کی مذمت میں "وشاء" کا بیان پڑھا ہے وہ
پتہ لگا سکتا ہے کہ ان باندیوں کا معاشرہ پر کتنا گہرا اثر تھا جس کا سایہ اس
عہد کے رند شرب اور آزاد خیال شعراء کے کلام پر بہت کافی پڑا تھا۔ اور رند
شرب اور آزاد خیال شعراء ہی کی اس زمانہ میں کثرت تھی[۱]۔ جاحظ نے ان نوجوان
عورتوں کے خراب ہو جانے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا ہے "ایک گانے والی عورت
فتنہ سے کس طرح بچ سکتی یا کس طرح عفیف اور پاک دامن رہ سکتی ہے؟
خواہشات نفسانی ہی اس کا ذریعۂ معاش ہوتی ہیں اور اسے ایسی زبانیں اور
ایسے اخلاق سیکھنے پڑتے ہیں جن سے وہ دوسروں کو خوش رکھ سکے۔ وہ پیدائش
سے لے کر اپنے مرنے کے وقت تک ان حالات میں زندگی گذارتی ہے جو لہو و لعب سے

---

[۱] الموشّٰی صفحہ ۹۵ و مابعد۔

تعلق رکھتے ہیں اور خدا کو یاد کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں میں انھیں زندگی گذارنی پڑتی ہے جو رند مشرب اور اوباش قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن سے کبھی کوئی ڈھنگ کی بات سننے میں نہیں آتی۔ نہ ان سے ثقاہت، دینداری، مروّت وغیرہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے جو گانے میں ماہر ہوتی ہیں وہ چار چار ہزار تال اور سُر بلکہ ان سے بھی زیادہ نقل کرتی ہیں۔ ہر تال اور سُر دو شعر یا چار شعروں میں تو ادا ہوتا ہے۔ یہ اشعار ان اشعار سے الگ ہوتے ہیں جو ویسے ہی ان کو یاد کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ان اشعار کو جمع کیا جائے تو اس قسم کے کم از کم دس ہزار اشعار نکلیں گے جن میں سے کسی ایک میں بھی خدا کا نام نہیں ہوتا۔ خدا سے غافل کرنے والے مضامین ہی ہوتے ہیں ان میں سے کسی شعر میں خدا کے عذاب سے ڈرانے یا ثواب کی رغبت کے مضامین نہیں ہوں گے سارے اشعار میں، عشق محبت اشتیاق وغیرہ کا ذکر ہوگا۔ پھر ایک گانے والی عورت کو اپنے فن کی خاطر ہمیشہ اس قسم کی چیزیں پڑھنی پڑتی ہیں اور ہمہ تن ان پر متوجہ رہنا پڑتا ہے اور رند مشرب لوگوں سے اسے یہ چیزیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ انھیں وہ چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ اگر وہ ان چیزوں کو چھوڑتی ہے تو اس کی مقبولیت میں کمی آتی ہے اور وہ ایک مقام پر کھڑی رہ جاتی ہے۔ جو آدمی ایک مقام پر کھڑا ہو کر رہ جائے ظاہر ہے کہ وہ نقصان ہی کی طرف جا رہا ہے[۱]۔ اسکے علاوہ باندیوں نے خوش ذوقی کی بھی بہت سی چیزیں پھیلائیں جن میں لوگوں نے انکی پیروی

---

[۱] رسالۃ القیان صفحہ ۷۲

کی اور ان کے نقوش قدم پر چلے۔ مثلاً پھولوں سے محبت اور ان کا عشق۔ اغانی کا بیان ہے کہ علی ابن ہشام کی باندی کو بنفشہ کے پھول بہت ہی پسند تھے۔ اس کے پاس طرح طرح کے پھول اور خوشبوئیں رہا کرتی تھیں۔ چونکہ اسے یہ چیزیں بہت ہی پسند تھیں اس لئے بہت کم اس کی آستینیں ان چیزوں سے خالی رہتی تھی۔ اسے جب بھی دیکھو ایسی نظر آتی تھی جیسے اسے ابھی ابھی باغ کی کسی شاخ سے توڑ کر لایا گیا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کو اب پھولوں سے نئے نئے مضامین سوجھنے لگے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے،

أَهْدَتْ إِلَيْهِ بَنَفْسَجًا يُسْلِيهِ

تُنْبِيهِ أَنَّ بِنَفْسِهَا تَفْدِيهِ

فَارْتَاحَ بَعْدَ صَبَابَةٍ وَكَآبَةٍ

وَرَجَا بِحُسْنِ الظَّنِّ أَنْ تُدْنِيهِ

اس نے اسے تسلی کی خاطر بنفشہ کا پھول تحفہ میں بھیجدیا جس سے اس طرف اشارہ تھا کہ وہ اس پر اپنی جان قربان کرتی ہے۔ وہ عشق و محبت اور اس کی مشقت و تکلیف کے بعد راحت محسوس کرنے لگا۔ اور اسے نیک گمان کی وجہ سے یہ امید بندھ گئی کہ وہ اسے اپنا قرب بخش دے گی۔

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے کہ

سُرَّ بِالْآسِ الَّذِیْ اَهْدَتْ لَهٗ
ثُمَّ لَمَّا اَهْدَتِ الْوَرْدَ جَزَعْ
ذَاكَ اَنَّ الْآسَ بَاقٍ دَائِمٌ
وَاِنَّ الْوَرْدَ حِیْنًا یَنْقَطِعْ

اس نے اسے آس کے پھول تحفہ میں بھیجے تو وہ خوش ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد جب اس نے گلاب کا پھول تحفہ میں بھیج دیا تو وہ فریاد کرنے لگا۔ وجہ یہ کہ آس تو ہمیشہ باقی رہتا ہے لیکن گلاب کے پھول کچھ عرصہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔

ایک دوسری قسم کی عجیب چیز لوگوں میں پھیل گئی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ عمدہ قسم کے اشعار اور ظرافت آمیز جملے زردوزی کے کام سے قمیصوں، چادروں، آستینوں وغیرہ پر لکھوا لیا کرتے تھے۔ ماوردی کا بیان ہے کہ میں نے ایک باندی کو دیکھا ہم اس وقت محمد بن عمرو بن سعدہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے...... وہ باندی ایک قمیص پہنے ہوئے تھی جس کے دامن پر یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

اَغِیْبُ عَنْكِ بِوُدٍّ لَا یُغَیِّرُهٗ
نَأْیُ الْمَحَلِّ، وَلَا صَرْفٌ مِنَ الزَّمَنِ

میں محبت کے ساتھ تیرے پاس سے جا رہی ہوں۔ وہ محبت جسے مقام کی دوری اور زمانہ کے تغیرات تبدیل نہیں کر سکتے۔

چادر پر زردوزی کے ساتھ یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

أَقَلُّ النَّاسِ فِي الدُّنْيَا سُرُورًا

مُحِبٌّ قَدْ نَأَى عَنْهُ الْحَبِيبُ

دنیا میں سب سے کم خوشی اسے نصیب ہوتی ہے جس کا محبوب اس سے دور چلا گیا ہو۔

مادردی ہی کا بیان ہے کہ میں نے کسی ہاشمی کی باندی کو دیکھا۔ اس باندی کا نام "عریب" تھا وہ ایک زردوزی کے کام کی قمیص پہنے ہوئے تھی اور اس کے دامن پر یہ دو شعر لکھے ہوئے تھے۔

وَإِنِّي لَأَهْوَاهُ مُسِيئًا وَمُحْسِنًا

وَأَقْضِي عَلَى قَلْبِي لَهُ بِالَّذِي يَقْضِي

فَحَتَّى مَتَى رُوحُ الرِّضَا لَا يَنَالُنِي

وَحَتَّى مَتَى أَيَّامُ سُخْطِكَ لَا تَمْضِي

میں اس سے برابر عشق کرتی رہوں گی خواہ وہ بُرا سلوک کرے یا اچھا سلوک کرے اور میں اپنے دل کے خلاف وہی فیصلے کرتی رہوں گی جو وہ فیصلے کرے گا۔ کب تک مجھے رضامندی کی روح حاصل نہیں ہوگی اور کب تک تیری ناراضگی کے دن نہیں گذریں گے۔

پٹیوں پر، موباف باندھنے کی جگہوں پر، مینڈھیوں پر، زناروں پر، رومالوں پر

گدّوں اور بچھونوں پر، تختوں پر، سر کے لباسوں پر، جوتوں پر، موزوں پر اور حتیٰ کہ مہندی کے ساتھ قدموں اور ہتھیلیوں پر اسی قسم کی چیزیں لکھی ہوئی ہوتی تھیں[1]۔

لوگوں میں خوش مذاقی کا یہ شعور بیدار کرنے اور ان کی حدود کا التزام کرنے میں باندیاں بہت کامیاب رہیں۔ حتیٰ کہ خوش مذاق لوگوں کا لباس، نظر، کھانے، پینے غرضکہ ہر چیز میں ایک خاص انداز قرار پا گیا۔ "وشاء" نے اس خاص انداز کو لے کر خوش مذاق لوگوں کے لئے اسے قانونی صورت دیکر اپنی کتاب اَلْمُوَشّیٰ میں مدوّن کر دیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ان تمام باتوں کا سہرا صرف باندیوں کے سر ہی تھا۔ یقیناً ان کے مالکوں کا بھی اس میں حصہ تھا جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ابراہیم موصلی اور ان جیسے دیگر مغنیوں نے ہی تو ان باندیوں کو گانا سکھایا تھا۔ اور انھیں ان کے راگ اور سُر یاد کرائے تھے اور اونچے طبقہ کے لوگوں نے ہی باندیوں کے دلوں میں خوش مذاقی کی یہ تمام چیزیں ڈالی تھیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معاشرہ کے مختلف طبقات میں ان باتوں کو مقبول بنانے اور فنونِ جمیلہ کو ان میں پھیلانے کے اندر صرف باندیوں ہی کا حصّہ تھا۔ کیونکہ انھیں ہی

---

[1] اس قسم کی بہت سی چیزیں آپ کو کتاب الموشیٰ میں ملیں گی۔

ان باتوں میں زیادہ انہماک تھا اور لوگ انہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ لوگوں کو طبعاً ان باتوں کی طرف میلان ہوتا تھا جنھیں یہ باندیاں پسند کرتی تھیں۔

ان باندیوں کا ایک اور بھی احسان تھا۔ یہ باندیاں ـــــ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں ـــــ مختلف قوموں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں ہندی بھی تھیں، ترکی بھی اور رومی بھی وغیر ذلک۔ ہر قسم کی باندیاں لائی جاتی تھیں۔ ان کی اپنی عادتیں پختگی پا چکی ہوتی تھیں۔ یا تقریباً پختہ ہو چکی تھیں۔ رومی باندیاں اپنے ساتھ گانے اور دیگر انواع میں اپنی قوم کی عادات کو لے کر آتی تھیں۔ یہی حال باقی قوموں کی باندیوں کا بھی تھا۔ اس کے بعد یہ مملکت اسلامی میں آتی تھیں اور اپنی عادتوں کو یہاں آکر پھیلاتی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد دوسری قوموں کی باندیوں کے عادات پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی اور بالآخر قانونِ انتخاب کے مطابق جو بات سب سے زیادہ بہتر ہوتی وہ چل نکلتی اور اس کا رواج پڑ جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا گانا بجانا بھی منتخب ہوا کرتا تھا۔ یہی وہ بات ہے جس سے اس شدید نزاع کی توجیہہ ہو جاتی ہے جو اغانی نے نقل کیا ہے کہ مغنیوں کی ایک جماعت قدیم گانوں کے ساتھ تعصب رکھتی تھی اور دوسری جماعت جدید قسم کے گانوں سے مانوس تھی۔ ظاہر ہے کہ قدیم قسم کے گانے تو وہی تھے جو دولت امویہ کے عہد سے معبد اور اس جیسے دوسرے مغنیوں سے مانوس چلے آرہے تھے۔ اور جدید قسم کے گانے وہ تھے جو فارسی اور رومی نغمات سے ترکیب دے کر بعد میں پیدا کئے گئے تھے۔ بعینہٖ یہی حال دیگر

فنون کا بھی تھا۔

باقی فنون جمیلہ کی طرح ایک اور فن بھی تھا جس میں باندیوں کے اثرات بڑے نمایاں تھے، یہ دوسرا فن عربی لٹریچر تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہر قوم میں اور ہر زمانہ میں لٹریچر پر عورت کا دو جہت سے بڑا احسان ہوتا ہے (پہلی جہت) تو یہ ہے کہ عورت ہی مردوں کے دلوں میں ان شدید جذبات کو بھڑکاتی ہے جو ان کے سینوں میں طوفان بپا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان کی زبانوں سے نفیس شعر اور پُر معنی لٹریچر کو ادا کراتی ہے۔ (دوسری جہت) فنی اور ادبی شہ پاروں کو جنم دینے میں مردوں کے ساتھ عورت کی شرکت ہے، خصوصیت کے ساتھ ان موقعوں پر جو عورت کے شعور کو زیادہ متاثر کر سکیں۔ اور عورتوں کو اس پر زیادہ قدرت ہوتی ہے۔

عباسی دور حکومت میں بھی یہی حالت تھی۔ ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ دونوں جہتوں کے اعتبار سے باندیوں کا پلڑا آزاد عورتوں کے مقابلہ میں کہیں بھاری تھا۔

آزاد عورتوں اور باندیوں میں مقابلہ

یعنی ادبی شہ پارے پیدا کرنے کے اعتبار سے بھی اور شعراء کو معانی و مضامین سجھانے کے اعتبار سے بھی۔ اس کی وجہ غالباً اس زمانہ کا نظام اجتماعی تھا۔ لوگ ــــ جیسا کہ ہم جاحظ سے پہلے نقل کر چکے ہیں۔ ــــ آزاد عورتوں پر بہ نسبت باندیوں کے زیادہ غیرت محسوس کرتے تھے ــــ

آزاد عورتوں کو پردہ میں بٹھاتے تھے اور پردہ میں بڑی شدت برتتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تو وہ پیغام دینے کے لیئے کسی عورت ہی کو بھیجتا تھا جو لڑکی کو دیکھ کر آتی اور مرد سے آکر اس کے عیوب اور محاسن بیان کرتی تھی۔ خود مرد اگر چاہتا تو لڑکی کو نہیں دیکھ سکتا تھا وہ شادی ہو جانے کے بعد ہی اسے دیکھ سکتا تھا۔ لیکن باندیوں کی یہ صورت نہیں تھی۔ اس کی وجہ سے لوگ اتنی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ باندیاں ایک بڑی حد تک بے پردہ ہوتی تھیں کیونکہ وہ تو ہر وقت خریدی اور فروخت کی جا سکتی تھیں۔ پھر یہ بھی کہ باندیاں تو آدمی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتیں اور مالک کی ضروریات کے لئے ہر وقت باہر نکلنے پر مجبور تھیں۔ جب کوئی عام آدمی گانے والی باندیاں رکھنے والوں کے مکانات پر جا کر گانا سننا چاہتا یا گانیوالی باندیوں کے ساتھ چہل اور ہنسی مذاق کرنا چاہتا تو یہی باندیاں اس کے اس میلان خاطر کی تسکین کرتی تھیں۔ یہ باندیاں ہی ـــــ بے پردہ ہونے کی وجہ سے وہ عورتیں تھیں جن پر لوگوں کی نگاہیں پڑتی تھیں۔ کیونکہ آزاد عورتوں کو تو ان کے قریبی عزیزوں کے سوا کوئی غیر آدمی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لہذا یہ چیز بالکل طبعی تھی کہ ادیب اور شعراء اپنے ادب اور شعر کی غذا باندیوں سے ـــــ بہ نسبت آزاد عورتوں کے ـــــ کہیں زیادہ حاصل کرتے تھے۔ دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ لوگ آزاد عورتوں کو تعلیم دینے کے مقابلہ میں ـــــ جیسا کہ ظاہر ہے ـــــ باندیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دیتے تھے۔ اس کی وجہ خالص تجارتی نقطہ نظر تھا۔ کیونکہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ بازار میں باندی

کے جسم سے زیادہ اس کے علم اور ادب کی قیمت لگائی جاتی تھی۔ اگر ایک جاہل باندی کی قیمت دو سو دینار ہوتی تھی تو مغنیہ اور ادیبہ ہونے کے بعد اس کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اور بہر حال ہر زمانہ میں مال و دولت ہی حرکات اجتماعیہ کا مرکز و محور رہا ہے۔ آزاد عورتوں کی تعلیم و تربیت پر ایک چھوٹے سے طبقہ کے علاوہ عموماً کوئی خاص توجہ نہیں دیجاتی تھی۔ یہ طبقہ اشراف اور امرار کا تھا اور یہ چند گنتی کے لوگ ہوتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ دیکھتے تھے کہ باندیاں تو لوگوں کا سامان تفریح ہیں۔ لہذا جو لوگ اس سامان تفریح کو مہیا کرنے والے تھے وہ اس کا بھی خیال رکھتے تھے کہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق وہ لحظہ بلحظہ اسے ترقی دیں کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ باندی اگر مغنیہ، ادیبہ اور موسیقار ہوتی تھی تو لوگوں کے دلوں پر وہ زیادہ اثر انداز ہوتی تھی اور لوگوں کا اس کی طرف میلان بہت زیادہ ہوتا تھا۔ لہذا لوگوں کی خواہشات کی تسکین کا سامان مہیا کرنے میں وہ کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

ہاں! بہت سی آزاد عورتیں بھی ہمیں ایسی ملتی ہیں جو بعض علوم میں مشغول رہیں۔ لیکن ان کی اس مشغولیت کا زیادہ تر باعث دینی پہلو ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں ہمیں کئی محدث عورتیں اور متصوف عورتیں مل جاتی ہیں۔ لیکن یہاں یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہمارا موضوع تو یہاں فنون جمیلہ میں عورتوں کا مشغول ہونا ہے۔ اور باندیاں ـــ بلا شبہ ـــ اس ضمن میں بہت زیادہ ہیں اور ان کے اثرات بھی زیادہ نمایاں ہیں۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ ـــ اگر انشائی جہت سے دیکھا جائے ـــ تو ہمیں بے شمار ایسی باندیاں مل جائیں گی جو بلند پایہ ادیبہ ہوں گی اور مختلف علوم و فنون کی ماہر ہوں گی ایسی ماہر کہ آزاد عورتیں ان کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ "عریب" کے بارہ میں اغانی کا بیان ہے کہ وہ نہایت خوش گلو مغنیہ، بلند پایہ شاعرہ اور خوش خط تھی۔ اس کا انداز گفتگو نہایت ہی حسین، حسن و جمال اور خوش مذاقی میں نہایت اعلیٰ مرتبہ پر فائز، خوبصورت، بہترین سازندہ، نغموں اور راگوں کو بہترین طور پر سمجھنے والی اور ادا کرنے والی اور شعر و ادب کی بہترین طور پر بیان کرنے والی تھی۔[۱]

نیز "مقیم" کے بارہ میں اغانی کا بیان ہے کہ ـــ زرد رو عورت تھی۔ بصرہ میں اس کی پیدائش کسی باندی کے بطن سے ہوئی تھی۔ بصرہ ہی میں نشو و نما پائی اور وہیں لٹریچر اور گانے کی تعلیم حاصل کی۔ اسحاق موصلی سے اس فن کو سیکھا اور اس سے پہلے اسحاق موصلی کے والد سے بھی استفادہ کیا...... اس کا چہرہ نہایت ہی حسین تھا۔ موسیقی اور ادب پر بڑا عبور تھا۔ شعر کہتی تھی جو اگرچہ بہت عمدہ تو نہیں ہوتے تھے لیکن اس جیسی لڑکی کے لیے بہر حال قابل فخر تھے۔[۲] نیز "دنانیر" کے بارہ میں اغانی ہی کا بیان ہے کہ یحییٰ بن خالد برمکی کی باندی تھی۔[۳] نہایت ہی حسین و جمیل چہرہ۔ نہایت خوش مذاق اور کامل ترین عورت تھی۔ لٹریچر پر اسے

---

[۱] اغانی صفحہ ۱۷۵ جلد ۱۸ [۲] اغانی صفحہ ۳۱ جلد ۷

کافی عبور تھا۔ اسے بے شمار گانے اور بے شمار اشعار یاد تھے۔

دوسری طرف ـــــ یہ باندیاں شعراء کو شعر کے نت نئے مضامین سجھاتی تھیں اس کا سبب ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بشار، ایک باندی پر عاشق تھا جس کا نام "فاطمہ" تھا۔ اس نے اسے گاتے ہوئے سنا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ اور اس کے بارہ میں بہت سے اشعار کہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے وہ ایک سیاہ فام باندی کے بارہ میں بھی اشعار کہتا رہا ہے۔ دعبل خزاعی، مسلم بن الولید۔ صریع الغوانی کی زندگیاں ان واقعات سے بھری پڑی ہیں جو انھیں باندیوں کے ساتھ پیش آئے ان سب نے انکے بارہ میں اشعار بھی کہے۔ ابو نواس شاعر ایک باندی پر عاشق تھا جس کا نام "جنان" تھا۔ یہ عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی کے خاندان کی باندی تھی۔ یہ بھی نہایت حسین باندی تھی۔ اسے بھی لٹریچر پر کافی عبور حاصل تھا۔ واقعات عرب اور اشعار وغیرہ کی روایت کرنے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ابو نواس کو اس کے سوا کسی عورت سے سچا عشق نہیں ہوا۔ ابو نواس نے اس کے بارہ میں اپنے بہترین اشعار کہے ہیں ـــــ عباس ابن احنف کو بھی "فوز" نامی باندی سے عشق تھا۔ یہ محمد بن منصور کی باندی تھی۔ عباس نے اس کے بارہ میں اپنے بہترین اشعار کہے ہیں ـــــ

یہ ہم نے چند مثالیں پیش کی ہیں۔ ورنہ لٹریری کتابیں اس قسم کے اشعار اور واقعات سے بھری پڑی ہیں جو نوجوان طبقہ کے لوگوں، شعراء اور ادباء کو ان باندیوں

کے ساتھ اس زمانہ میں پیش آتے رہے۔

ادیبوں اور شاعروں کو اس حالت اجتماعیہ پر بڑا ہی رشک آتا تھا جس کے نتیجہ میں اس قدر عمدہ اشعار اور ادبی شہ پارے عالم وجود میں آسکے تو دوسری طرف علمائے دین اور علمائے اخلاق کو رونا آتا تھا کہ کس قدر ادبی عریانی اور رندی و اوباشی کو عروج حاصل ہو رہا تھا۔ اوّل الذکر حضرات لوگوں کو برانگیختہ کرتے تھے کہ اس حیات نو سے استفادہ کریں اور اس کے ثمرات سے متمتع ہوں تو آخر الذکر حضرات لوگوں کے فسق و فجور کے مرثیے پڑھتے تھے پھر ان سب چیزوں سے بھاگ کے زاہدانہ زندگی اور لذائذ دنیوی سے فرار کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔ ان امور کو ہم آیندہ فصل میں بیان کر رہے ہیں۔

⁂

فصل پنجم

لہو و لعب کی زندگی اور حقیقت پسندانہ زندگی

کیا لوگ اس عہد میں تعیش و تنعم اور لہو و لعب کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یا پاک دامنی اور حقیقت پسندی کی زندگی گذارتے تھے؟ ابتدائی خلفائے عباسیہ دینی امور کا لحاظ رکھتے اور ان کی پابندی کرتے اور صرف انہی چیزوں تک محدود رہتے تھے جنھیں خدا نے ان کے لیئے حلال قرار دیا تھا؟ —— جیسا کہ بعض مورخین نے ان کی تصویر کھینچی ہے —— یا بہت سی قیود کو توڑ کر لہو و لعب میں اسراف کی حد تک پہنچ گئے تھے؟ —— جیسا کہ دوسرے لوگوں نے ان کی تصویر کھینچی ہے —— معاشرہ کی حالت ان کے زمانہ میں وسعت، فراخی اور فارغ البالی کی تھی یا تنگی اور رقت، دقاقہ کی؟ ان تمام باتوں کے اثرات علم و فن اور ادب پر کیا مرتب ہوئے؟

اس فصل میں ہم ان باتوں کا جواب دینا چاہتے ہیں۔

امویوں اور عباسیوں کے درمیان مقابلہ جب ہم عمومی انداز سے حیاتِ امویہ اور حیاتِ عباسیہ کے درمیان موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اموی طرزِ حیات زیادہ سے زیادہ سادہ اور تکلفات سے زیادہ دور تھا۔ جو بدوی، سادہ، عربی ذوق کی نشاندہی کرتا تھا۔ عربی عنصر چونکہ اموی عہد میں غالب تھا اس لئے اس نے اپنے عہد کی حیاتِ اجتماعیہ کو اسی رنگ میں رنگ رکھا تھا۔ وہ ترفہ اور تنعم کی چیزیں اختیار کرنا چاہتے بھی تھے تو دوسری قوموں کے ترفہ وتنعم کی چیزوں میں سے انتخاب کر کے وہ اختیار کرتے تھے۔ انھیں بالکلیہ اور جوں کا توں اختیار نہیں کر لیتے تھے۔ پھر اس کے بعد وہ اپنے عربی ذوق اور میلان کے مطابق اس میں ایک طرح کا اعتدال پیدا کر لیا کرتے تھے اور اسے ایک ایسی چیز بنا دیتے تھے کہ نہ تو وہ عربی ہوتی تھی اور نہ خالص ایرانی اور نہ ہی خالص رومی۔ انھوں نے ایرانی دعوتوں کو دیکھا۔ اور خلفاء اور امراء نے ان دعوتوں کے مطابق اپنی دعوتوں کو بھی ایک طرح سے خوشنما بنانے کی کوششیں کیں۔ لیکن جب ایک عربی بادیہ نشین امیر معاویہ یا عبدالملک کے دربار میں جاتا تو وہ یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ وہ کسی نئی فضا میں آگیا ہے جو اس کی مانوس فضا اور ماحول سے کوئی تعلق نہ رکھتی ہو۔

ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ۔ "اپنے کسی لڑکے کی ختنہ میں حجاج بن یوسف نے دعوتِ ولیمہ کا انتظام کرنا چاہا۔ اس نے کسی ایرانی سردار کو بلایا اور ایرانیوں کی دعوتوں کے متعلق اس سے پوچھا۔ حجاج نے اس سے کہا کہ مجھے کسی سب سے بڑی دعوت کا حال سناؤ۔ ایرانی سردار نے عرض کیا کہ اے امیر! مجھے کسریٰ کے ایک مرزبان کی دعوت میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا جس نے ایرانیوں کے لیے اس دعوت کا انتظام کیا تھا۔ اس مرزبان نے چاندی کے خوانوں[1] پر سونے کے بڑے بڑے برتنوں میں کھانا پیش کرنے کا انتظام کیا تھا۔ ہر خوان پر چار آدمیوں کا کھانا تھا۔ اور اسے چار باندیاں اٹھائے ہوئے تھیں۔ ہر خوان پر چار چار آدمی بیٹھ گئے۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو ان چاروں آدمیوں کے پیچھے پیچھے وہ خوان، اس کے برتن اور اس کی باندیاں بھیج دی گئیں اور انہی کو عطا کر دی گئیں۔ حجاج نے یہ سن کر کہا۔ غلام! تم اونٹوں کو ذبح کرو اور لوگوں کو کھانا کھلاؤ[2]۔ گویا حجاج نے اس دعوت کے تکلفات کو ناپسند کیا اور بیجا اسراف تصور کیا۔ یہ چیز اس کے عربی ذوق کے خلاف تھی۔ اس نے اسے جھوٹی نمائش اور ایک ایسا اظہار شان شمار کیا جو اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے اسے اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کی عادت پر ہی اکتفا کیا۔ ان کا یہی حال دفاتر اور دیگر

---

[1] خوان اس چوکی کو کہتے تھے جس پر کھانا چن کر کھایا جاتا تھا، جیسا کہ آجکل میزیں ہوتی ہیں۔ اس زمانہ میں اس مقصد کے لئے بڑی بڑی چوکیاں ہی ہوا کرتی تھیں۔ [2] ابن خلدون صفحہ ۲۰۵ ج ۱

تہذیبی انواع واقسام میں بھی تھا۔ مختصر یہ ہے کہ اموی عہد حکومت میں عربی ذوق پوری طرح پر نمایاں تھا۔ اور دمشق، مکہ، مدینہ اور دیگر شہروں کا تعلق ــــ یعنی اجتماعی جہت سے سیاسی جہت سے نہیں ــــ ایک مضبوط اور مستحکم تعلق تھا۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے اور ایک دوسرے کے ذوق سے اچھی طرح لطف اندوز ہوتے تھے۔ اسلام کو بھی ان کے زمانہ میں اپنی سادگی اور پابندیوں کے ساتھ عباسی عہد کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھا گیا تھا۔

عباسیوں کا یہ حال نہیں تھا۔ اگر اموی خلفاء و امراء دوسری تہذیبوں کی کچھ عادتوں اور باتوں کو اپنے ہاں اپنے رنگ میں رنگ کر منتقل کرتے تھے تو عباسی خلفاء اور امراء ان کے برعکس بالکلیہ طور پر خود ان نئی عادتوں اور نئی پابندیوں کی طرف منتقل ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ذرا "نوروز" کو لے لیجئے۔ "نوروز" پرانے زمانے سے پارسیوں کی عید چلی آتی تھی۔ ہم نے اموی عہد حکومت میں کوئی ایسی بات نہیں سنی جس سے یہ پتہ لگ سکے کہ انھوں نے اسے کوئی اہمیت دی ہو۔ لیکن عباسیوں نے اسے ایک قومی عید بنا لیا تھا۔ وہ اس میں اسی طرح جمع ہوتے تھے جیسے عید الفطر میں جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو تحفے دیتے۔ شعراء قصیدے پڑھتے اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے۔ خلفاء، خاص اہتمام سے دربار منعقد کرتے اور لوگ انھیں مبارکبادیں پیش کرتے تھے۔ یہی حال لباس وغیرہ کا تھا۔ چنانچہ ٹوپی، عبا اور طرح طرح کے ایرانی ملبوس پھیل چکے تھے۔

قاضی لوگ بڑی بڑی ٹوپیاں پہنتے اور خلفار ٹوپیوں کے اوپر عمامے باندھتے تھے۔ عماموں میں بھی طرح طرح کے نقش اختیار کیئے جاتے تھے۔ چنانچہ مختلف طبقات کے مختلف عمامے ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ ایرانیوں میں دستور تھا۔ خلفار کا عمامہ اور طرح کا ہوتا تھا۔ فقہار کا دوسری طرح کا۔ خچر ہانکنے والوں کا تیسری طرح کا۔ اعرابیوں کا عمامہ چوتھی طرز کا۔ غرضکہ ہر جماعت کا لباس الگ ہوا کرتا تھا۔ قاضیوں کا لباس الگ ہوتا تھا۔ قاضیوں کے دفتر سے متعلق افراد کا لباس الگ ہوتا تھا۔ سپاہیوں کا لباس الگ ہوتا تھا۔ اور سلطان کے درباریوں کا اپنے اپنے رتبہ کے لحاظ سے الگ الگ لباس ہوتا تھا۔ چنانچہ کچھ لوگ مبطنہ پہنتے تھے۔ کچھ دُرّاعہ پہنتے تھے اور کچھ "بازیکند" پہنتے تھے۔ شعرار زرکار، کناردار اور سیاہ چادریں اوڑھتے تھے ۔۔ کوئی شاعر اس زمانہ میں پرانا لباس پہنا کرتا تھا تو کچھ شعرار نے اس کی ہجو میں اشعار کہے تھے[۱]

اموی خلفار جب کسی کو عطیہ دیتے تھے تو عربوں کے مسلک اور ان کی بدویانہ طرز زندگی کے مطابق ان کے عطایا زیادہ تر اونٹوں کی شکل میں ہوا کرتے تھے لیکن بنوعباس کی حکومت میں ان کے انعامات درہم و دینار کی تھیلیاں، کپڑوں کے تخت اور زین اور ساز سمیت گھوڑے وغیرہ ہوا کرتے تھے[۲] خلاصہ یہ ہے کہ عباسی عہد حکومت میں

---

[۱] لباس اور انواع کی بحث البیان والتبیین صفحہ ۶۵ جلد ۳ اور اس کے بعد کے صفحات پر دیکھیے۔

[۲] ابن خلدون صفحہ ۱۴۵ جلد ۱

لوگ ـــ بنوامیہ کے دورِ حکومت کے برعکس ـــ دوسری قوموں کی عادات و رسوم کی طرف منتقل ہو چکے تھے اور اس میں بہت زیادہ افراط سے کام لینے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کے مسلمانوں اور جزیرۂ عرب کے مسلمانوں کے درمیان اجتماعی رشتے اور شکل و صورت کی ہم آہنگی تقریباً ختم ہو چکی تھی یا ختم ہوتے لگی تھی۔ اغانی نے ناہض بن ثومہ کے متعلق ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے ـــ ناہض بن ثومہ کے شعراء میں سے ایک بدوی اکھڑ شاعر ہے ـــ کہ اسے حلب میں ایک شادی کی محفل میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ جو کچھ اس نے وہاں دیکھا اسے دیکھ کر اس کی عقل چکرانے لگی اور فکر پراگندہ ہو گئی کیونکہ بادیہ نشینی کی زندگی میں اس نے یہ چیزیں خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ اسے دلہن کی آرائش سے انتہائی حیرت ہوئی۔ طرح طرح کے لباسوں اور طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزوں اور موسیقی کے ایرانی آلات وغیرہ سے وہ دنگ ہو کر رہ گیا۔ جوں جوں اس کا تجربہ بڑھتا جا رہا تھا لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔[۱] اگر کہیں بدقسمتی سے وہ بغداد میں کسی شادی کی محفل میں شریک ہو گیا ہوتا تو شاید وہ سچ مچ پاگل ہی ہو گیا ہوتا۔

---

[۱] یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اغانی صفحہ ۳۶ جلد ۱۲ میں ملاحظہ فرمائیے۔

اس عہد میں لہو ولعب کا تدریجی ارتقاء اور اس کی تاریخ

اس زمانہ میں کچھ لوگ لذائذ ونعم میں حدود سے متجاوز ہوگئے اور قصداً افراط سے کام لینے لگے۔ اور لطف اندوزیوں کے نئے انداز اور طریقے ایجاد کرنے لگے تھے۔ جب لطف اندوزی کے کسی ایک انداز سے اکتا جاتے تو ایک نیا انداز اختراع کر لیتے۔ جب ذرا اس طوفان میں سکون کے آثار نظر آنے لگتے تو اس کے داعی انھیں ابھارنے لگتے کہ تنعم و تعیش میں ڈوب جانا چاہیئے۔

حافظ بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اگر ہم دولتِ عباسیہ کی تاریخ کا اس ضمن میں تتبع کریں تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ یہ حکومت تدریجی قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ اس انتہا تک پہنچی تھی۔ اور ہر خلیفہ —عموماً— اپنے پہلے خلیفہ سے ترفہ و تنعم کی سیڑھی پر ایک دو درجے بلند ہی ہوتا جاتا تھا۔ اگر ہم اس ترقی کے بیان کے لئے رسمی خط کھینچنا شروع کر دیں تو ہم شاید اس بلندی کی مقدار کو متعین کر سکیں جو یکساں طور پر مسلسل ہر خلیفہ تنعم کی طرف چڑھنے میں برابر طے کرتا جارہا تھا۔ اور عوام الناس تو ہر زمانہ میں — اور خصوصیت کے ساتھ ان زمانوں میں — اپنے امام کے تابع ہوتے ہیں۔

دولتِ عباسیہ کی ابتدا ہوئی تو بنوامیہ اور ان کے ممنونین کرم میں سے بیشمار دشمن ان کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے۔ جب خلافت کے لئے سفاح کو اور اس کے

بعد منصور کو منتخب کیا گیا تو خود عباسی گھرانے کے بہت سے لوگ ناراض ہو گئے۔ اُدھر شیعانِ علی بھی بگڑ گئے۔ لہٰذا قیامِ حکومت کے لئے ایسے خلفاء کی ضرورت تھی جو لہو و لعب سے دور رہتے ہوئے حقائق و واقعات کا مقابلہ کر سکیں اور اپنا پورا وقت حکومت کی تاسیس پر صرف کر سکیں۔ ساتھ ہی اپنے ہم خیال اور ہم نوا پیدا کرنے، دشمنوں کا قلع قمع کرنے اور باغیوں کا خون بہانے پر پوری توجہ دے سکیں حتیٰ کہ یہ دور ختم ہو گیا۔ معاملات پُرسکون ہو گئے۔ باغیوں کا سر کچل دیا گیا اور دوسرے لوگ مطیع و فرمانبردار بن گئے۔ اور سلطنت میں امن و امان قائم ہو گیا تو اب آگے آنے والے خلفاء کے لئے امن و امان اور سکون و اطمینان کی وجہ سے فراغت کا اتنا وقت مل سکتا تھا جو ترفہ و تنعم اور لہو و لعب میں گذارا جا سکے۔ لیکن وہ سارا وقت ان امور کے لئے نہیں دے سکتے تھے۔ کیونکہ ان کو اندرونی معاملات کی تنظیم پر بھی توجہ دینی پڑتی تھی جبکہ اس سے پہلے خلفاء کا سارا دوسر خارجی امور کی تنظیم بنا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ جب آگے چل کر داخلی اور خارجی معاملات یکساں طور پر استوار ہو گئے اور معاملات اپنے محور پر گردش کرنے اور ان بنیادوں پر یکسانیت کے ساتھ چلنے لگے، جنھیں ابتدائی خلفاء نے مضبوطی کے ساتھ استوار کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی خلفاء نے دیکھا کہ مال و دولت کے وہ ذخیرے فراوانی کے ساتھ ان سر چشموں سے مسلسل بہتے چلے آ رہے تھے جو ابتدائی خلفاء نے بیرونی حضرات کی حفاظت اور اندرونی تنظیم کر کے قائم کر دیئے تھے تو اب انھوں نے عیش و عشرت کی داد دینی

شروع کی اور خوب خوب داد دی اور اب ان کے پاس اس کے لئے وقت میں بھی کافی گنجائش تھی۔

سفّاح

عباسی خلفاء مکمل طور پر ان ادوار کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ ان کی تاریخ ہمارے اس قول کی شاہد ہے۔ چنانچہ ابوالعباس سفّاح ــــ ان کا پہلا خلیفہ ــــ حقیقت شناسی اور علم کو لہو ولعب کی انواع پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ مجھے اس آدمی پر تعجب آتا ہے جو علمی ترقیات کو چھوڑ کر جہالت میں بڑھتا جاتا ہے اور اسے پسند کرتا ہے۔ ابوبکر ہذلی نے ایک مرتبہ پوچھ لیا کہ اے امیرالمومنین! آپ کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟ سفّاح نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ وہ تم جیسے اور تمھارے اصحاب جیسے لوگوں کے ساتھ تو بیٹھتا نہیں۔ اپنی بیوی یا باندی کے پاس اندر چلا جاتا ہے اور بیہودہ باتیں سننے اور خرافات بکنے میں اپنا وقت گذار دیتا ہے۔ جب سفّاح نے ام سلمہ سے شادی کر لی تو اس نے قسم کھالی تھی کہ نہ اس کے بعد کوئی دوسری شادی کرے گا اور نہ ہی استمتاع کے لئے کوئی باندی رکھے گا۔ کچھ مقربان دربار نے اس کی خلافت کے زمانہ میں وسوسہ اندازی کرنی چاہی اور باندیوں کے اور ان کے انواع واقسام کا تذکرہ کر کے لذت اور شہوت کے جذبات کو بھڑکانا چاہا۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے[1] سفّاح کی زندگی محض خوں ریزی کی زندگی رہی[2] اور دشمنوں کی

---

[1] ملاحظہ ہو مسعودی صفحہ ۱۸۰ جلد ۲ و مابعد [2] مسعودی صفحہ ۲۰۰ جلد ۲

سرکوبی اس کا شغل رہا۔

منصور سفاح کا جانشین منصور ہوا جو دولت عباسیہ کی نمایاں شخصیت اور اس کی بنیادوں کو استوار کرنے والی ہستی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے خود اپنے گھرانے اور غیروں میں سے اپنے اور حکومت کے دشمنوں کا صفایا کیا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اسے تو لہو ولعب کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ طبری نے یحییٰ بن سلیم سے نقل کیا ہے کہ "منصور کے گھر میں کبھی لہو ولعب یا لہو ولعب سے مشابہ اور ملتی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔ سوائے ایک دن کے کہ ہم نے منصور کے بیٹے عبدالعزیز کو دیکھا (اس کا انتقال نو عمری ہی میں ہو گیا تھا) کہ وہ باہر نکلا، کمان گلے میں ڈالے ہوئے، عمامہ باندھے ہوئے، چادر اوڑھے ہوئے، بالکل ایک اعرابی لڑکے کی ہیئت بنائے ہوئے۔ گھوڑے پر دو خرجینوں کے درمیان نشست پر بیٹھا ہوا ان دونوں خرجینوں میں صقل، جوتے، مسواکیں اور وہ چیزیں تھیں جو اعرابی لوگ کسی کو تحفہ میں دے سکتے ہیں۔ لوگوں کو اس ہیئت کذائی پر بڑا تعجب ہوا اور اسے بالکل ایک نئی سی بات خیال کیا۔ وہ لڑکا پل پر سے گذر کر رصافہ میں مہدی کے پاس گیا اور اسے تحفہ میں وہ تمام چیزیں پیش کیں۔ خرجینوں میں جو کچھ تھا مہدی نے اسے قبول کر کے دونوں خرجینوں کو درہموں سے پر کر دیا۔ لڑکا واپس لوٹ آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ بادشاہوں کا ایک کھیل تھا[1]۔ آپ نے

---

[1] طبری صفحہ ۲۹۸ جلد ۹

ملاحظہ فرمایا کہ لوگوں نے لڑکے کے اس عمل کو باوجود اس کی سادگی اور لطافت کے ایک نئی سی بات محسوس کیا کیونکہ وہ لہو ولعب اور اس قسم کی باتوں سے مانوس ہی نہیں تھے ـــــ ایک مرتبہ منصور نے اپنے مکان میں شور سنا۔ اس نے شور کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ ایک خدمت گار باندیوں کے درمیان بیٹھا ہوا طنبورہ بجا رہا ہے۔ اور باندیاں ہنس رہی ہیں۔ منصور اٹھ کر اس جگہ گیا جہاں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ غلام اور باندیوں نے جونہی منصور کو دیکھا سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ منصور نے حکم دیا کہ طنبورہ کو اس خدمت گار کے سر پر مار کر توڑ دیا جائے اور اس کے بعد اس خدمتگار کو فروخت کرا دیا[1]۔ منصور نہایت محتاط آدمی تھا۔ لہو ولعب سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے یہ شعور تھا کہ لوگ اعمال میں اس کی پیروی کرتے ہیں لہٰذا وہ اس کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتا تھا۔ جب طریف بن تمیم عنبری کے اس نے یہ شعر سنے

اِنَّ قَنَاتِی لَنَبْعٌ لَا یُؤَیِّسُهَا
غَمْزُ الثِّقَافِ وَلَا دُهْنٌ وَلَا نَارُ

مَتٰی اُجِرْ خَائِفًا تَأْمَنْ مَسَارِحُهٗ
وَاِنْ اُخِفْ آمِنًا تَقْلَقْ بِهِ الدَّارُ

---

[1] طبری صفحہ ۲۹۴ جلد ۹

اِنَّ الْاُمُوْرَ اِذَا اَدْبَرَتْهَا صَدَرَتْ

اِنَّ الْاُمُوْرَ لَهَا وِرْدٌ وَ اِصْدَارُ

میرا نیزہ درخت نبع کی لکڑی کا بنا ہوا ہے جیسے مضبوط آدمیوں کا دبانا اور تیل لگانا اور آگ دکھانا غرضکہ کوئی بات ٹیڑھا نہیں کر سکتی میں جب کسی خوف زدہ کو پناہ دیتا ہوں تو تمام راستے اس کے لئے مامون ہو جاتے ہیں اور جب میں کسی مامون آدمی کو خوف زدہ کر دیتا ہوں تو اس کا گھر بھی اس کے لئے باعث اضطراب بن جاتا ہے۔ معاملات کو جب میں کسی گھاٹ پر اتارتا ہوں تو وہ خود بھی لوٹ بھی جاتے ہیں۔ کیونکہ معاملات کا تو کام ہی آنا اور واپس لوٹ جانا ہے۔

منصور نے کہا کہ طریف کے ان دونوں شعروں کا میں زیادہ حقدار ہوں اس نے اپنی تعریف نہیں کی بلکہ میری ہی تعریف کی ہے۔ منصور میں آخر دم تک بدویانہ خو بو اور سادگی کی طرف میلان رہا۔

اسے اطلاع ملی کہ عبداللہ ابن مصعب ابن الزبیر صبح تک ایک باندی کے پاس رہے جو انھیں ان کے اشعار گا گا کر سناتی رہی۔ ان اشعار میں عشقیہ مضامین اور رندانہ مطالب بیان کئے گئے تھے۔ اس پر منصور نے کہا کہ مجھے تو یہ بات پسند آتی ہے کہ کوئی حدی خواں آج کی رات مجھے طریف عنبری کے اشعار حدی کے طرز پر سنائے۔ میرے نزدیک یہ باتیں زیادہ مانوس اور اہل عقل کی پسندیدگی کے زیادہ

قابل ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک حدی خواں کو بلایا تاکہ وہ اسے حدی سنائے۔ منصور نے اسے خود ایسے اشعار بتائے جن کا تعلق مکارم اخلاق پر فخر کرنے سے تھا۔ چنانچہ حدی خواں نے وہ اشعار حدی کے طرز پر اسے گاکر سنائے۔ منصور نے کہا کہ بخدا یہ چیزیں انسانی مروّت کو زیادہ بیدار کرنے والی اور بڑی آدمیوں کے زیادہ لائق ہیں۔ پھر ربیع کو بلاکر حکم دیا کہ اس حدی خواں کو ایک درہم دیدو۔ حدی خواں نے عرض کیا۔ اے امیرالمومنین! میں نے ہشام بن عبدالملک کو حدی سنائی تھی تو اس نے مجھے بیس ہزار درہم دیئے تھے۔ اور آپ ایک درہم ہی دے رہے ہیں۔؟ منصور نے کہا۔ انا للہ! تونے اس بات کا ذکر کردیا جس کا ذکر ہم پسند نہیں کرتے تھے۔ تونے اس آدمی کا واقعہ بیان کیا ہے جس نے اکثر و بیشتر خدا کا مال بغیر اس کے کہ وہ اس کے لئے حلال ہو قبضا لیا اور اسے ناجائز موقعہ پر صرف کیا ہے۔ اے ربیع! مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اس کو پکڑ لو اور اس سے وہ بیس ہزار درہم واپس لیلو جو اسے ہشام بن عبدالملک نے دیئے تھے۔ بیچارہ حدی خواں برابر روتا رہا اور فریاد کرتا رہا۔ بڑی مشکل سے منصور نے اسے چھوڑا۔[1]

اس طرح منصور شراب کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اور نہ اس کے دسترخوان پر شراب پی جاتی تھی۔ بختیشوع طبیب جب آیا تو منصور نے اس کے لیے صبح کا

---

[1] یہ پورا واقعہ اغانی صفحہ ۱۱۶ جلد ۱۳ پر مذکور ہے۔

کھانا منگایا۔ جب اس کے سامنے دسترخوان بچھایا گیا تو اس نے شراب مانگی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ امیرالمومنین کے دسترخوان پر شراب تو نہیں پی جاتی۔ بختیشوع نے کہا کہ میں تو ایسا کوئی کھانا نہیں کھاتا جس کے ساتھ شراب نہ ہو۔ اس کی اطلاع منصور کو دی گئی تو منصور نے کہا اسے چھوڑ دو۔[1]

پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی حدی خواں، شاعر اور مدح گوئی کرنے والے کو عطایا دینے میں بھی اسراف سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ اپنی اولاد کو اگر وہ اسراف کرتے تھے تنبیہہ کرتا رہتا تھا۔ گراں قیمت لباس نہیں پہنتا تھا۔ دسترخوان پر بھی زیادہ صرف نہیں کرتا تھا۔ غرضکہ زندگی کے تمام شعبوں میں میانہ روی اس کا شعار تھا حتی کہ ان چیزوں میں بھی جو خدا نے اس کے لیے حلال کی تھیں وہ میانہ روی کو نہیں چھوڑتا تھا بلکہ بعض اوقات تو وہ میانہ روی میں اتنا ہی غلو کرنے لگتا تھا جتنا اس کے جانشین اسراف میں غلو کرنے لگے تھے ——— لوگوں کا بیان ہے کہ منصور کی ماں ——— جو ایک مغربی عورت تھی ——— کے شکم میں جب منصور کا حمل تھا تو اس کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک شیر کو اٹھائے ہوئے ہے جسے شیر سجدہ کر رہے ہیں۔ بلاشبہ اگر اس میں شیر جیسی ہمت نہ ہوتی اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے پرہیز نہ کرتا اور لہو ولعب سے الگ رہ کر تدبیر مملکت کی طرف پوری توجہ نہ دیتا تو وہ کبھی اتنی بڑی مملکت

---

[1] طبری صفحہ ۳۰۹ جلد ۹

کی تاسیس کے فرض سے عہدہ برآنہ ہوسکتا کہ بعد والوں کو مضبوط اور مستحکم بنی بنائی مملکت مل گئی جنھیں صرف اس کی ضرورت ہی رہ گئی تھی کہ جو کچھ انھیں وراثت میں مل گیا تھا اس کی حفاظت کریں۔

منصور نے ملک کو ایک وحدت کی شکل میں اپنے جانشین کے حوالہ کیا جس سے اندلس کے سوا کوئی علاقہ باہر نہیں تھا۔ مملکت میں ہر طرف امن وامان کا دور دورہ تھا جس میں کہیں کوئی بڑے فتنے نہیں تھے۔ خزانے مال ودولت سے بھرپور تھے۔ سکانِ مملکت میں سے عربوں کے اثرات کم ہونے شروع ہو چکے تھے۔ ان کا اثر ونفوذ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ موالی اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ہر شعبۂ زندگی سے انھیں باہر کر دیں اور جزیرہ نمائے عرب میں انھیں دھکیل دیں۔ جیسا کہ وہ بدویانہ زندگی کے دور میں جاہلیت کے زمانہ میں تھے۔ وہ برابر کوشش کرتے رہے تھے کہ عربی عادات ورسوم کی جگہ ایرانی عادات ورسوم لے لیں اور عربی زندگی کی سادگی کی جگہ متمدن زندگی کی پیچیدگیاں چھا جائیں۔ بہرحال وہ دوسرا دور آیا جس میں خلیفہ اور لوگوں کو اس کا وقت ملا کہ وہ فراغت اور عیش وعشرت کی سوچ سکیں۔ یہ دور ترفہ وتنعم کے لئے بہت زرخیز سرچشمہ ثابت ہوا۔

مہدیؒ

منصور کی موت کے بعد لوگ کسی حد تک راحت محسوس کرنے لگے تھے۔ منصور کے زمانہ میں لوگ ان مشقتوں سے تھک چکے تھے

جو ایک مملکت کی تاسیس کے لئے ضروری ہوتی ہیں جس کے لئے بڑی بڑی دشواریوں پر قابو پانا ہوتا ہے۔ اس میانہ روی اور کوشش پیہم سے لوگ اکتا گئے تھے جو منصور کا خصوصی جوہر تھا۔ وہ ایسی زندگی کے متلاشی تھے جس میں مالی وسعت اور آرام و آسائش کی گنجائش نکل سکے۔ یہ بات انھیں خلیفہ "مہدی" میں ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ مہدی کا دس سالہ دورِ حکومت وہ درمیانی پل تھا جس کے ایک طرف منصور کے عہد کی محنت و مشقت، تنگی اور خشکی اور عملی جد وجہد کی زندگی تھی اور دوسری طرف ہارون رشید اور اس کے جانشینوں کے دور کی ترفہ اور تنعم کی زندگی تھی۔

مہدی، سخی اور فراخ دست خلیفہ تھا۔ لوگوں کو منصور کی بخیلی سے ذرا سانس لینا میسر آیا۔ منصور اپنے بعد چودہ ملین دینار اور چھ سو ملین درہم چھوڑ گیا تھا۔[1] مہدی نے یہ تمام دولت لوگوں میں تقسیم کردی۔ علاوہ ازیں جو دولت خود اس کے زمانہ میں حاصل ہوئی وہ اسے بھی تقسیم کرتا رہا۔ دولت کی فراوانی ـــ ہر قوم اور ہر عہد میں ـــ ترفہ اور تنعم اور لہو ولعب کا سبب رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ سخاوت کا معیاری اندازہ اس سے بلند تر کرنے لگے تھے۔ وہ مہدی کے زمانہ میں بخیلوں کے پُر لطائف قصے کہانیاں بیان کرتے تھے، شاید اسی کا اثر تھا کہ امام جاحظ نے ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھ دی جس کا نام ہی "کتاب البخلا" ہے

---

[1] مسعودی صفحہ ۱۹۶ جلد ۲

مہدی میں فنون جمیلہ سے محبت اور سخاوت کی طرف شدید میلان دونوں باتیں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں۔ لوگ ان دونوں باتوں میں اس کی پیروی کرتے تھے اور اہل فن پر گراں قدر اموال خرچ کرتے تھے جس سے فن کو ترقی ہوتی تھی اور وہ معاشرہ کے مختلف طبقوں میں پھیلنے لگا تھا۔ مہدی نے گویوں کے گانے سننے کے لئے مجلسیں آراستہ کر کے بیٹھنا شروع کر دیا تھا جبکہ اس کا باپ منصور ان گانوں پر حُدی خوانی کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اغانی کا بیان ہے کہ مہدی سب گویوں کا گانا سنتا تھا۔ وہ اس کی مجلس میں حاضر ہوتے اور پردہ کے پیچھے سے گانا سناتے تھے۔ گویئے مہدی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ البتہ خلیج ابن ابی العوراء کو ایک مرتبہ مہدی نے اجازت دیدی تھی کہ وہ اس کی مجلس میں حاضر ہو کر دو شعر سنائے۔ خلیج کو خود مہدی کے اہل اور موالی کے درمیان حاضر ہونے کی اجازت دی گئی تھی۔ چنانچہ خلیج وہ پہلا شخص تھا جس نے مجلس میں مہدی کا چہرہ دیکھا ہو۔[۵] کتاب "اخلاق الملوک" کے مصنف کا بیان ہے کہ منصور کی پیروی میں ابتدائی ایک سال تک مہدی اپنے ندیموں سے پردہ میں رہا پھر اس کے بعد اس نے یہ پابندی ختم کر دی تھی تو ابو عون نے مشورہ دیا کہ ندیموں سے پردہ ہی میں رہنا چاہیئے۔ مگر مہدی نے ناگواری کے ساتھ اس مشورہ کو رد کر دیا اور

---

[۵] اغانی صفحہ ۹۹ جلد ۴

کہا۔ ہٹو! تم بالکل ہی جاہل ہو۔

سرور کو مشاہدہ کرنے اور اس سے قریب رہنے ہی میں لذت ہے جو مجھے خوش کر سکے۔ دور دور۔ اس میں کیا بھلائی اور لذت ہو سکتی ہے؟[1] اپنے باپ کے برعکس وہ لوگوں کو گانے پر بے دریغ مال بھی دیتا تھا۔ منصور اپنے ندیموں وغیرہ میں سے کسی کو کبھی ایک درہم بھی نہیں دیتا تھا اور نہ اس نے کسی ایسے آدمی کو جو لہو ولعب، ہنسی دل لگی یا ہنر گوئی کا کام کرتا ہو کبھی ایک چپہ بھر زمین کبھی جاگیر میں دی۔ لیکن مہدی بہت زیادہ عطایا بخشنے والا تھا۔ وہ مسلسل دیتا رہتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی اس کے سامنے حاضر ہوا اور اس نے اسے بے نیاز نہ کر دیا ہو۔[2] مہدی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے قصر شاہی میں اپنے دونوں بچوں، ابراہیم ابن المہدی اور عُلیّہ بنت المہدی کے لئے گانے بجانے، اور خوش مذاقی کے سلسلہ میں دنیا کی ساری زینتیں اور اپنے وقت کی تمام لذتیں مہیا کر رکھی تھیں۔

مہدی کو باندیوں سے بھی انس تھا۔ عورتوں کے متعلق باتیں کرنے کو بغیر کسی تکلف اور جھجک کے وہ پسند کرتا تھا۔ جاحظ کا بیان ہے کہ "مہدی گانے والی باندیوں کو پسند کرتا اور گانا سنتا تھا۔ اسے ایک باندی بہت ہی پسند تھی جس کا نام "جوہر" تھا۔ اسے اس نے مروان شامی سے خریدا تھا۔ مہدی نے اس باندی کے سلسلہ میں

---

[1] اخلاق الملوک صفحہ ۳۲ [2] اخلاق الملوک صفحہ ۳۴-۳۵

کچھ اشعار بھی کہے ہیں۔[1]

صاحب اغانی اور طبری دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ مہدی شراب نہیں پیتا تھا لیکن اس نے ابوجعفر منصور کے بعد اس سلسلہ میں ایک قدم ضرور آگے بڑھایا تھا ہم منصور کے متعلق دیکھ چکے ہیں کہ نہ وہ شراب پیتا تھا اور نہ کسی کو اس کی اجازت دیتا تھا کہ وہ دسترخوان پر شراب پی سکے۔ لیکن مہدی کے متعلق طبری کا بیان ہے کہ وہ خود شراب نہیں پیتا تھا۔ لیکن اس وجہ سے نہیں کہ وہ بُری چیز سمجھتا تھا بلکہ اسے اس کی کبھی خواہش ہی نہیں ہوئی۔ اس کے اصحاب اس کے پاس بیٹھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے شراب پیتے تھے۔ مہدی کا وزیر یعقوب بن داؤد اس سلسلہ میں اسے نصیحت کرتا تھا اور باصرار اسے مجبور کرتا تھا کہ گانا سننا اور شراب پلانا بند کر دے۔ اکثر تو اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر مہدی نے یہ باتیں نہ چھوڑیں تو وہ اپنے منصب سے الگ ہو جائے گا۔ لیکن مہدی اس کے جواب میں یہ دلیل دیا کرتا تھا کہ آخر عبداللہ ابن جعفر بھی تو گانا سنا کرتے تھے۔[2]

مہدی اپنے کھانے اور پہننے میں بھی فضول خرچ تھا حج کے لیے جاتا تھا تو برف بغداد تک پہنچائی جاتی تھی۔ مہدی پہلا خلیفہ تھا جس نے ایسا کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ مہدی ــــــ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے ــــــ اپنے لہو و لعب

---

[1] البیان والتبیین صفحہ ۲۰۸ جلد ۳ [2] اغانی صفحہ ۵ جلد ۵ وطبری صفحہ ۲۰ جلد ۱۰

اور ترفہ و تنعم میں اعتدال سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ لیکن اسے لوگوں کے لئے بھی اس سلسلہ میں باگ اتنی ڈھیلی نہیں چھوڑنی چاہیئے تھی کہ وہ اسے اچھی چیز سمجھنے لگیں۔ رند مشرب لوگ افراط کی حد تک پہنچ گئے تھے اور چھوٹ ہو چلے تھے۔ منصور کے عہد حکومت میں لوگوں کو اس رندی کی جرأت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ خود منصور نے ان کے سامنے اپنا نمونہ حقیقت پسندانہ اور محتاط رکھا ہوا تھا۔ جب لوگوں نے مہدی کو دیکھا کہ وہ لہو و لعب کی طرف دو چار قدم بڑھا رہا ہے تو لوگوں کو جرأت ہوئی اور انھوں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ مہدی کے عہد میں بشار کی عریاں گوئی اور فحش نگاری نے بڑے لوگوں کو بڑے ہی فتنہ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور پورے ملک کو اس فحاشی اور عریانی کا شکار بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ اشراف اس کے اشعار سے تنگ آ کر مہدی کے پاس حاضر ہوئے۔ ان اشراف میں خود مہدی کے ماموں یزید بن منصور جیسے حضرات بھی شامل تھے۔ انھوں نے مہدی سے درخواست کی کہ وہ اس فحاش کی زبان کو لگام دے ورنہ انھیں اندیشہ ہے کہ ان کی عورتیں اور لڑکیاں خراب ہو جائیں گی۔ بالآخر مہدی نے مداخلت کی اور بشار کو غزل گوئی کی ممانعت کر دی۔ بشار کہتا ہے۔

قَدْ عِشْتُ بَیْنَ الرَّیْحَانِ وَالرَّاحِ وَالْ
مِزْھَرِ فِیْ ظِلِّ مَجْلِسٍ حَسَنِ
قَدْ مَلَأْتُ الْبِلَادَ مَا بَیْنَ فَغْ
فُوْرَ اِلَی الْقَیْرَوَانِ فَالْیَمَنِ

شِعْرًا تُصَلِّي لَهُ الْعَوَاتِقُ وَالثَّيِّبُ

بُ صَلٰوةَ الْغُوَاةِ لِلْوَثَنِ

ثُمَّ نَهَا نِي الْمَهْدِيُّ فَانْصَرَفَتْ

نَفْسِي صَنِيعَ الْمُوَفَّقِ اللَّقِنِ

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا شَرِيْكَ لَهٗ

لَيْسَ بِبَاقٍ شَيْءٌ عَلَى الزَّمَنِ

میں نے ایک عمدہ مجلس کے زیر سایہ پھولوں، شراب اور باجوں گاجوں کے درمیان زندگی گذاری ہے۔ میں نے فغفور سے لیکر قیروان اور یمن تک سارے شہروں کو ایسے اشعار سے بھر دیا ہے جن کے لئے کنواری لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں اس طرح نمازیں پڑھتی ہیں جس طرح گمراہ لوگ بتوں کے لئے نمازیں پڑھتے ہیں۔ مگر پھر مجھے مہدی نے منع کر دیا تو میرا دل اسی طرح پلٹ گیا جس طرح ایک مطیع و فرمانبردار آدمی پلٹ جاتا ہے۔ اس خدا کا شکر ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور جس کے سوا زمانہ میں کوئی چیز باقی رہنے والی نہیں۔

لیکن اس کے باوجود وہ اپنی خباثت سے باز نہیں آیا۔ وہ کھلم کھلا تو نہیں اب چھپ چھپ کران مضامین کو بیان کرتا اور مہدی کی ممانعت کے پردہ میں اپنی حفاظت ڈھونڈھتا تھا۔ وہ کہتا ہے۔

يَا مَنْظَرًا حَسَنًا رَأَيْتُهُ   مِنْ وَجْهِ جَارِيَةٍ فَدَيْتُهُ

بَعَثَتْ إِلَيَّ تَسُومُنِي   ثَوْبَ الشَّبَابِ وَقَدْ طَوَيْتُهُ

وَاللهِ رَبِّ مُحَمَّدٍ   مَا إِنْ غَدَرْتُ وَلَا نَوَيْتُهُ

أَمْسَكْتُ عَنْهُ وَرُبَّمَا   عَرَضَ الْبَلَاءُ وَمَا ابْتَغَيْتُهُ

إِنَّ الْخَلِيفَةَ قَدْ أَبَىٰ   وَإِذَا أَبَىٰ شَيْئًا أَبَيْتُهُ

وَنَهَانِيَ الْمَلِكُ الْهُمَا   مُ عَنِ النِّسَاءِ فَمَا عَصَيْتُهُ

بَلْ قَدْ وَفَيْتُ وَلَمْ أُضِعْ   عَهْدًا وَلَا وَأْيًا وَأَيْتُهُ

وَأَنَا الْمُطِلُّ عَلَى الْعِدَىٰ   وَإِذَا غَلَا الْحَمْدُ اشْتَرَيْتُهُ

وَأَمِيلُ فِي أُنْسِ النَّدِيـ   مِ مِنَ الْحَيَاءِ وَمَا اشْتَهَيْتُهُ

وَيَشُوقُنِي بَيْتُ الْحَبِيـ   بِ إِذَا غَدَوْتُ وَأَيْنَ بَيْتُهُ

حَالَ الْخَلِيفَةُ دُونَهُ   فَصَبَرْتُ عَنْهُ وَمَا قَلَيْتُهُ

اُف! وہ حسین منظر جو میں نے ایک باندی کے چہرہ میں دیکھا۔ میری جان اُس پر قربان۔ اس نے میرے پاس اپنی جوانی کے لباس کا سودا کرنے کے لئے آدمی بھیجا۔ میں نے اس کے اس لباس کو لپیٹ دیا۔ محمد کے پروردگار اللہ کی قسم میں نے نہ عہد شکنی کی اور نہ اس کا ارادہ کیا۔ میں اس سے رُکا رہا لیکن بسا اوقات ایسی آزمائش آپڑتی ہے جس کا میں طلبگار بھی نہیں ہوتا۔ خلیفہ نے مجھے منع کر دیا ہے اور جب وہ منع کر دیتا ہے تو میں اس سے

رک جایا کرتا ہوں۔ مجھے عظیم بادشاہ نے عورتوں سے روک دیا ہے اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے حکم کو بجالاتا ہوں اور جو وعدہ کر چکا ہوں اسے ضائع نہیں کرتا۔ میں دشمنوں پر ہر وقت متوجہ رہتا ہوں اور جب حمد گراں ہو جاتی ہے تو اسے خرید لیا کرتا ہوں۔ شرم کی وجہ سے میں ہمنشین کی نسبت میں پورا پورا میلان رکھتا ہوں مگر اس کی انتہا نہیں رکھتا۔ محبوب کا گھر مجھے اپنی طرف جب میں صبح کو جاتا ہوں شوق کے ساتھ کھینچتا ہے۔ اور کہاں ہے اس کا گھر؟ خلیفہ کا حکم اس کے گھر کے درمیان حائل ہو گیا ہے میں اس سے صبر تو کرتا ہوں مگر اسے ناپسند نہیں کرتا۔

اور وہ کہتا ہے۔

دَفَنْتُ الْهَوٰى حَيًّا فَلَسْتُ بِزَائِرٍ

سُلَيْمٰى وَلَا صَفْرَاءَ مَا قَرْقَرَ الْقُمْرِيْ

تَرَكْتُ الْمُهْدِيَ الْاَنَامِ وِصَالَهَا

وَرَاعَيْتُ عَهْدًا بَيْنَنَا لَيْسَ بِالْخَتْرِ

وَلَوْلَا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ مُحَمَّدٌ

لَقَبَّلْتُ فَاهَا اَوْ لَكَانَ بِهَا فِطْرِيْ

لَعَمْرِيْ لَقَدْ اَوْقَرْتُ نَفْسِيْ خَطِيْئَةً

فَمَا اَنَا بِالْمُزْدَادِ وِقْراً عَلٰی وِقْرِی

میں نے زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنی محبت کو دفن کر دیا ہے۔ چنانچہ
جب تک قمریاں بولتی رہیں گی میں سلیمیٰ اور صفرا سے ملنے کے لئے
نہیں جاؤں گا۔ لوگوں کے مہدی کی وجہ سے میں نے ان کے وصال
کو چھوڑ دیا ہے اور اس عہد کا لحاظ کرتا ہوں جو ہمارے درمیان ہوا ہے
اور جو قریب نہیں ہے۔ اگر امیر المومنین محمد (مہدی) نہ ہوتے تو میں
ضرور اس کا منہ چوم لیتا بلکہ یقیناً اپنا روزہ ہی اس کے ساتھ کام جوئی
سے افطار کرتا لیکن میری زندگی کی قسم میں نے تو اپنے نفس کو گناہوں
سے لاد رکھا ہے۔ اب میں بوجھ پر مزید بوجھ بڑھانے والا نہیں ہوں۔

اس کے بعد مہدی کو ابراہیم موصلی کی خوش آوازی کی شہرت معلوم ہوتی ہے
تو وہ اسے اپنا مقرب بنا لیتا ہے۔ مہدی ہی پہلا شخص ہے جس نے ابراہیم موصلی
کی شان کو بلند کیا اس کے بعد مہدی کو معلوم ہوا کہ موصلی شراب پیتا اور رندانہ
باتیں کہتا ہے۔ مہدی چاہتا ہے کہ موصلی برابر اس کے ساتھ رہے اور اپنی رندانہ
باتیں چھوڑ دے۔ لیکن موصلی کے بس کی یہ بات نہیں تھی۔ مہدی اسے مارتا ہے
اور قید کر دیتا ہے۔ ابراہیم موصلی کا بیان ہے کہ مجھے مہدی نے ایک دن بلایا اور
لوگوں کے گھروں پر جا کر شراب پینے اور ان کے ساتھ رندی کرنے پر بڑی ملامت
کی تو میں نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین! میں نے یہ فن اس لئے سیکھا ہے

کہ اس سے لذت حاصل کروں اور اپنے دوستوں کے ساتھ عیش و عشرت کی داد دوں۔ اگر میرے لئے ان تمام باتوں کا چھوڑنا ممکن ہوتا جن میں گرفتار ہوں تو محض خدا کی خاطر میں ان کو کبھی کا چھوڑ چکا ہوتا۔ مہدی کو میرے اس جواب پر بہت سخت غصہ آیا اور وہ کہنے لگا۔ بہت اچھا مگر خبردار تم موسیٰ اور ہارون کے پاس آیندہ سے کبھی نہیں جاؤ گے! خدا کی قسم اگر تو ان کے پاس گیا تو سمجھ رکھنا کہ میں کیا کچھ کروں گا۔ میں نے کہہ دیا کہ مجھے یہ بات منظور ہے مگر چند ہی دن کے بعد اس کو اطلاع مل گئی کہ میں ان دونوں کے پاس گیا اور ان کے ساتھ میں نے شراب پی۔ یہ دونوں شراب کے متوالے تھے۔ مہدی نے مجھے اس جرم میں مجھے تین سو کوڑے لگوائے اور قید کر دیا۔[1]

درحقیقت مہدی نے لوگوں کے لئے لہو ولعب کا دروازہ کھول دیا۔ پھر اس کی کوشش کی کہ وہ حد کے اندر رہیں۔ حد سے آگے نہ بڑھیں۔ مگر لوگ حدود کو پھاند کر آگے بڑھ چکے تھے۔ اس کے بعد مہدی نے بڑی کوشش کی کہ سزائیں دے دے کر لوگوں کو اس حد کے اندر رہنے پر مجبور کرے جو اس نے ان کے لئے مقرر کی تھی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

ہارون رشید کے زمانہ میں لوگوں نے عیش و عشرت کے اندر اسراف میں

---

[1] اغانی صفحہ ۵ جلد ۵

ہارون رشید

ایک قدم اور آگے بڑھایا جس کے چند اسباب تھے۔ ان میں کچھ تو وہ باتیں تھیں جن کا تعلق اُمت کے طبعی نشوونما سے تھا۔ حکومت کے حالات منظم ہو جانے کی وجہ سے مملکت کی ثروت میں اضافہ ہو گیا تھا اور اسے یہ قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کر سکے۔ ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ ہارون رشید کے عہد حکومت میں مملکت کی آمدنی سات ہزار پندرہ قنطار سالانہ تھی[1] اور قنطار ان کے حساب میں دس ہزار دینار کہلاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجموعہ آمدنی ستر ملین ایک لاکھ پچاس ہزار دینار سالانہ تھی۔ یہ میزانیہ بہت ہی بڑا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ مملکت کی دولت اس کے عہد میں کس قدر بڑھ گئی تھی اور عیش وعشرت کی زندگی گزارنے پر اسے کس قدر قدرت حاصل ہو چکی تھی۔

دوسرا سبب اس کے عہد میں ایرانیوں کے تسلط کا بڑھ جانا تھا۔ جن میں سب سے آگے آگے برامکہ تھے ایرانی قوم شروع ہی سے لہو ولعب، خوشی اور سرور، شراب کی پسندیدگی میں افراط کی طرف مائل رہی ہے دین زردشتی میں شراب حلال تھی جو اسے دینی شعائر میں جگہ دیتی تھی۔ پروفیسر براؤن کے قول کے مطابق شراب آج تک زردشتی پارسیوں کی روزانہ کی زندگی میں نمایاں چلی آتی ہے —— ایرانی، پرانے زمانہ سے شراب پینے اور گانا سننے میں افراط سے کام لیتے آئے تھے۔ اچھے اور بُرے

---

[1] مقدمہ صفحہ ۱۵۱

کھیلوں کے بہت سے فنون میں وہ افراط کے عادی تھے۔ دولت عباسیہ میں جب ان کا تسلط بڑھا خصوصیت کے ساتھ ہارون رشید اور مامون کے عہد میں تو انھوں نے اپنے اثر و نفوذ کے ساتھ اکاسرہ کا طرز زندگی اور ان کی تہذیب اور لہو و لعب کی چیزیں بھی پھیلا دیں ـــــ اپنی حقیقت شناسی کے ماتحت انھوں نے نظم سیاسی پیدا کیا تو ساتھ ہی اپنی لہو آمیزی کے ماتحت، شراب، گانے کی محفلیں، غزل کی مجلسیں وغیرہ بھی پھیلائیں۔

تیسری وجہ خود ہارون رشید کی طبیعت اور اس کی تربیت سے تعلق رکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہارون رشید ایک تیز طبع نوجوان تھا۔ لیکن اس قسم کا نہیں کہ خود کو بالکل ہی شہوات نفسانیہ کے حوالہ کر دے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا دل قوی اور طبعاً اور تربیت کے ماتحت بھی وہ ایک فوجی آدمی تھا۔ اکثر مشرق و مغرب میں اس نے فوجوں کی کمان کی تھی ـــــ طبیعت کی اس تیزی، دل کی قوت اور شباب کی سرسبزی و شادابی نے مل کر اس کی شخصیت کو مختلف کیفیات کا مظہر بنا دیا تھا۔ اسے نصیحت کی جاتی تھی تو وہ نصیحت سے متاثر ہوتا حتیٰ کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔ گانا سنتا تو اس سے پوری طرح پر لطف اندوز ہوتا تھا۔ ابراہیم موصلی سے گانا سنتا برصوم سے بانسری سنتا اور زلزل سے طبلہ سنتا۔ بعض مرتبہ جوش طرب میں ایسی باتیں بھی اس کے منہ سے نکل جاتیں جن سے دینی تقویٰ سے بے احتیاطی کی بو آتی۔ وہ کہہ دیتا۔ "اے آدم! اگر تم

دیکھتے کہ آج تمھاری اولاد میں سے میرے سامنے کون کون لوگ حاضر دربار ہیں تو تم کتنا خوش ہوتے۔" بعد میں اپنی ان باتوں پر نادم بھی ہوتا اور استغفر اللہ پڑھتا۔ — اس میں ایک طرف دینی رجحان بھی بڑھا ہوا تھا، مگر دوسری طرف فنون لطیفہ کا رجحان بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ نمازیں پڑھتا اور بہت نمازیں پڑھتا۔ گانے سنتا اور خوب خوب سنتا۔ اشعار سنتا اور ان سے لطف لیتا۔ اس کے میلانات و رجحانات مختلف اطراف کی طرف چلتے تھے اور وہ ہر حیثیت میں آخری حد تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ ابو العتاہیہ کے یہ اشعار سنتا۔

يَالَكَ الطَّرْفُ طَمُوْحُ	أَيُّهَا الْقَلْبُ الْجَمُوْحُ
لِلدَّوَاعِي الْخَيْرِ وَالشَّرُّ	دُنُوٌّ وَ نُزُوْحُ
هَلْ لِمَطْلُوْبٍ بِذَنْبٍ	تَوْبَةٌ مِنْهُ نَصُوْحُ؟
كَيْفَ إِصْلَاحُ قُلُوْبٍ	إِنَّمَا هُنَّ قُرُوْحُ
أَحْسَنَ اللّٰهُ بِنَا أَنَّ	الْخَطَايَا لَا تَفُوْحُ
سَيَصِيْرُ الْمَرْءُ يَوْمًا	جَسَدًا مَا فِيْهِ رُوْحُ
بَيْنَ عَيْنَيْ كُلِّ حَيٍّ	عَلَمُ الْمَوْتِ يَلُوْحُ
كُلُّنَا فِيْ غَفْلَةٍ وَالْ	مَوْتُ يَغْدُوْ وَيَرُوْحُ
لِبَنِي الدُّنْيَا مِنَ الدُّنْـ	ـيَا غَبُوْقٌ وَ صَبُوْحُ
رُحْنَ فِي الْوَشْيِ وَأَصْـ	ـبَحْنَ عَلَيْهِنَّ الْمُسُوْحُ

كُلُّ نَطَّاحٍ مِنَ الدَّهْرِ — لَهُ يَوْمٌ نَطُوحُ

نُحْ عَلَىٰ نَفْسِكَ يَا مِسْكِينُ إِنْ كُنْتَ تَنُوحُ

لَتَمُوتَنَّ وَإِنْ عُمِّرْتَ مَا عُمِّرَ نُوحُ

اے بے صبرے دل! اُٹھی ہوئی آنکھیں تجھ سے خیانت کر رہی ہیں
خیر اور شر کے داعیئے قریب بھی ہوتے ہیں اور دُور بھی چلے جاتے ہیں۔
کیا ایسے آدمی کے لئے جس کی گناہوں میں تلاش ہو رہی ہو سچی توبہ ہو سکتی
ہے؟ دلوں کی اصلاح کس طرح کی جائے۔ وہ تو زخم ہی زخم ہیں۔ خدا
ہمارے ساتھ احسان کا سلوک فرمائے ورنہ گناہوں سے تو کوئی خوشبو
نہیں آیا کرتی۔ آدمی ایک دن ایسا جسم بن جائے گا جس میں جان نہیں
ہوگی۔ ہر زندہ آدمی کی آنکھوں کے درمیان موت کا جھنڈا نظر آتا ہے۔
ہم سب غفلت میں گرفتار ہیں۔ اور موت صبح و شام آتی جاتی رہتی ہے
دنیا داروں کا دنیا سے حصہ اتنا ہی ہے کہ وہ صبح کو اور شام کو کچھ پی لیں۔
لوگ شام کو زرکار کپڑوں میں جاتے ہیں اور صبح کو ٹاٹ پہن کر آتے ہیں۔
زمانہ کی ہر سینگ مارنے والی چیز کے لئے سینگ مارنے کا ایک دن
آتا ہے۔ اے مسکین اپنے آپ پر نوحہ پڑھ اگر تجھے نوحہ پڑھنا ہے۔ تجھے
ضرور موت آکر رہے گی اور اگر تیری لمبی عمر بھی ہو گئی تو نوح علیہ السلام
بھی تو ہمیشہ زندہ نہیں رہے تھے۔

ہارون رشید نے یہ اشعار سنے تو رونے لگا اور اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔[1] بر امکہ سے خوش ہوتا ہے تو انھیں حد سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے اور انھیں انتہائی مقرب بنا لیتا ہے۔ پھر وہ ان پر ناراض ہوتا ہے اور حاسدین اس کے رجحان کو اور بھی بھڑکاتے ہیں تو انھیں اتنی سخت سزا دیتا ہے کہ پناہ بخدا۔ اسے گانا پسند آتا ہے تو ابراہیم موصلی کو اس طرح مقرب بنا لیتا ہے جیسے علماء اور قضاۃ کو مقرب بناتا تھا۔ جب کوئی مغنی یا شاعر اس کے جذبۂ پسندیدگی کو ابھار دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو پھر وہ کبھی نہیں پوچھتا تھا کہ اس نے کتنا مال خرچ کر دیا ہے۔ ہارون رشید کے بیان میں مجھے صاحب اغانی کا یہ جملہ بہت ہی پسند ہے جو اس کی شدتِ رجحان کی بہترین مصوری کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "نصیحت کے وقت ہارون رشید بے تحاشا آنسو بہاتا تھا اور غیض و غضب کے وقت انتہائی درجہ کا بے رحم بن جاتا تھا۔"[2] لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں اگر آپ اسے انتہائی درجہ کا دیندار دیکھتے ہیں۔ وہ نمازیں پڑھتا ہے تو دن میں سو سو رکعتیں پڑھ ڈالتا ہے۔ اگر آپ کسی وقت اسے ناراض دیکھتے ہیں تو وہ بے تحاشا ایسی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر خون بہانے لگتا ہے جو بہر حال خون بہانے کے لائق نہیں ہوتیں، جوشِ طرب میں آتا ہے تو مستی اور طرب ناکی اس پر اور اس کے حواس پر پوری طرح قابض ہو جاتی ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو ایک آدمی میں بیک وقت جمع

---

[1] اغانی صفحہ ۱۰۰ جلد ۳ [2] اغانی صفحہ ۱۰۸ جلد ۳

ہوسکتی ہیں اور اس کا تصور کچھ دشوار نہیں ہے۔

آپ کتاب الاغانی کا مطالعہ کیجئے تو اسے پڑھ کر بسا اوقات ہارون رشید کی جو تصویر آپ کے ذہن میں بنے گی وہ کچھ اس قسم کی ہوگی کہ وہ چوبیس گھنٹے لہو و لعب اور غنا و طرب میں گرفتار رہتا تھا۔ اسے گانا سننے کے سوا کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا۔ ندیموں کے ساتھ گھلا ملا رہنا اور شعراء کو انعامات دینا ہی اس کا مشغلہ تھا۔ اس میں صاحب اغانی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی کتاب تاریخ پر نہیں لکھی کہ وہ مختلف خلفاء کے اعمال کو بیان کر کے ان کی تمام حسنات و سیئات گنائیں اور پھر ان خلفاء کا درجہ متعین کریں۔ انھوں نے اپنی کتاب گانوں کے موضوع پر لکھی ہے۔ لہذا یہ طبعی چیز ہے کہ وہ اپنی کتاب میں اسی قسم کی باتیں بیان کرنے پر اکتفا کریں جن کا تعلق گانے کے فن سے ہو جیسا کہ نحاۃ اور اہل لغت کے طبقات کی کتابیں علماء پر محض لغوی اور معنوی زاویہ نظر ہی سے گفتگو کرتی ہیں۔ اگر قصور ہے تو ان پڑھنے والوں کا ہے جو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ گانا ہی ایک ایسے شخص کی مکمل مصوری کر دیتا ہے جس کی شخصیت مختلف رجحانات کا مجموعہ ہو۔

آپ ابن خلدون کو پڑھیئے تو وہ محض حقیقت پسندانہ دینی جہت ہی سے اس کی مصوری کرنے پر اکتفاء کر جاتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ ہارون رشید شراب نہیں پیتا تھا کیونکہ وہ علماء اور اولیاء اللہ کی صحبت میں رہتا، نمازوں اور دوسری عبادتوں کی بڑی پابندی کرتا۔ صبح کی نماز ہمیشہ اپنے وقت پڑھتا۔ ایک سال جہاد کرتا اور دوسرے

سال حج کیا کرتا تھا۔ وہ ان باتوں سے استدلال کرتے ہیں کہ علم اور سادگی میں اس کا اپنا خاص مقام تھا کیونکہ سلف سے اس کا زمانہ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے درمیان اور اس کے دادا ابو جعفر منصور کے درمیان کوئی بڑا زمانہ نہیں گذر گیا تھا۔ ہارون رشید فقہائے عراق کے مذہب کے مطابق صرف نبیذ پی لیا کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے فتوے کافی مشہور ہیں۔ جہاں تک خالص شراب کا تعلق ہے تو ہارون رشید پر اس کی تہمت لگانے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ لہذا ہمیں ان کمزور اور ضعیف تاریخی روایات کی پیروی نہیں کرنی چاہیئے جن میں اس سے اس قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ وہ ہرگز ایسا آدمی نہیں تھا کہ ایک حرام چیز کا جو پوری ملت کے نزدیک اکبر الکبائر میں سے تھی ارتکاب کر سکتا۔ پوری کی پوری قوم ان دنوں لباس اور زینت میں ترفہ و تنعم اور دوسری چیزوں کے ساتھ اسراف برتنے سے بہت دور تھی کیونکہ ان میں ابھی تک بدویانہ زندگی کی خشونت اور دین کی سادگی پائی جاتی تھی جس سے وہ جدا نہیں ہوئے تھے۔[1]

ہمیں ابن خلدون کے ساتھ اس امر میں اتفاق ہے کہ ہارون رشید نے شراب نہیں پی۔ اس کے متعلق مشہور یہی ہے کہ وہ نبیذ پیا کرتا تھا۔ لیکن ہم اس نتیجہ سے اتفاق نہیں کرتے جو وہ آخر میں نکالتے ہیں کہ ترفہ و تنعم میں اسراف برتنے سے وہ بہت

---

[1] یہ بحث تاریخ ابن خلدون کی جلد اول صفحہ ۱۴ جلد ۱ پر ملاحظہ فرمایئے۔

دور تھا اور یہ کہ اس کی زندگی بالکل سادہ تھی۔ اور یہ کہ وہ ایک حرام چیز کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ نتائج نکالنا محض ہارون رشید کو مقدس بنانے میں افراط سے کام لینے کے مرادف ہے۔ جس پر خود ہارون رشید کی سیرت بھی دلالت نہیں کرتی۔ منصور کے ساتھ اس لئے بھی کہ ابن خلدون نے اس سلسلہ میں جو دلائل دیئے ہیں وہ محض واعظانہ اور خطیبانہ دلائل ہیں۔ منصور سے اس کا قریب العہد ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کی زندگی بھی منصور ہی کی طرح ہو۔ خود ابن خلدون نے بارہا اس کی تصریح کی ہے کہ ہارون رشید کے زمانہ میں ترفہ اور تنعم منصور کے زمانہ کے مقابلہ میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اگر قریب العہد ہونا ہی استدلال کرنے کے لئے کافی ہوا کرے تو ہمیں "امین" میں ۔۔۔ جو ہارون رشید سے قریب العہد ہے یہ بات کیوں نظر نہیں آتی کہ وہ ہارون رشید کی سیرت کے مطابق زندگی گذارتا۔

تعجب ہے کہ خود ابن خلدون نے لمبی لمبی فصلوں میں ہارون رشید، امین اور مامون کے عہد میں تہذیب و تمدن اور ترفہ و تنعم کی تفصیلات اور کھانے پینے اور پہننے میں ان کی جدت آرائیاں بیان کی ہیں اور خود ابن خلدون ہی وہ شخصیت ہیں جنھوں نے مسعودی اور طبری سے ان حکایات کو بیان کرنے میں اتفاق کیا ہے جو مثلاً بوران بنت حسن کے ساتھ مامون کی شادی میں پیش آئیں کہ مثلاً مامون نے اسے شب زفاف میں مہر کے طور پر یاقوت کے

ایک ہزار ٹکڑے دیئے تھے اور عنبر کی شمعیں روشن کی تھیں اور ہر شمع میں ایک سو من (یعنی دو سو رطل عنبر تھا) اور اس کے لئے ایک فرش بچھایا گیا تھا جو بوریئے کی طرح سونے کے تاروں سے بنا گیا تھا اور اس میں جگہ جگہ موتی اور یاقوت ٹکے ہوئے تھے الخ الخ

کیا یہ ترفہ و تنعم میں اسراف نہیں تھا؟ اور مامون کا زمانہ ہارون رشید سے اتنا ہی قریب نہیں تھا جتنا رشید کا زمانہ منصور سے تھا جس کی وجہ سے ابن خلدون کے نزدیک لوگوں کو سادہ زندگی برتنی چاہیئے تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ ابن خلدون نے ہارون رشید کے عہد کو سادگی کا زمانہ کہہ کر اور یہ بتا کر کہ وہ اور اس کی قوم ترفہ و تنعم میں اسراف کرنے سے بہت دور تھی غلطی کی ہے۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ابن خلدون نے ہارون رشید کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے جہاں ایک پہلو کی یہ صحیح تصویر پیش کی ہے کہ وہ نمازیں پڑھتا تھا اور بڑا تقویٰ شعار تھا وہیں ساتھ ہی یہ نتیجہ نکالنے میں غلطی کی ہے کہ اس کے سارے پہلو ایسے ہی تھے۔ اس کی زندگی کا ایک پہلو وہ بھی تھا جسے صاحب اغانی نے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ہم صاحب اغانی کی طرح ابن خلدون کی طرف سے کوئی معذرت

۱؎ تاریخ ابن خلدون صفحہ ۱۴۵ جلد ۱۔

پیش نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تو بہر حال ایک مورخ ہیں اور ان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایک شخص کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے دکھائیں۔ اگر ابن خلدون نے رشید کے ایک پہلو کو تشنہ چھوڑ دیا ہے تو وہ اس میں معذور قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

غالباً ابن خلدون نے یہ سمجھا ہے کہ جو شخص رات کو سو سو رکعتیں نماز پڑھ سکتا ہے، جو فضیل بن عیاض جیسے ولی اللہ کے ساتھ ہم نشینی کا شرف حاصل کرتا ہو اس سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ لہو و لعب کی مجلسیں آراستہ کر کے ان میں گانا بجانا سنے اور ان مجلسوں میں ترفہ و تنعم کے مظاہر کا مکمل طریقہ سے مظاہرہ کرے اگر ابن خلدون نے یہ سمجھا ہے تو بہت ہی غلط سمجھا ہے۔ انسانی طبیعت اس سے انکار نہیں کرتی۔

ہماری رائے یہ ہے کہ ہارون رشید حقیقت پسندانہ زندگی بسر کرتا تو اس میں گہرائی تک پہنچ جاتا۔ لہو و لعب میں مشغول ہوتا تو اس میں بھی انتہا تک پہنچ جاتا تھا۔ کیونکہ اس کی تیزی طبیعت کے جو مختلف میلانات و رجحانات تھے وہ ان کے آگے سپر انداز ہو جاتا تھا۔

ابو البختری وہب بن وہب قاضی کا بیان ہے کہ میں ایک روز ہارون رشید کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس نے برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی منگایا۔ ذخیرہ میں برف موجود نہیں تھی۔ ہارون رشید کو اس کی معذرت کے ساتھ ایسا پانی پیش کیا گیا جس میں برف نہیں تھا۔ ہارون رشید نے وہ پیالہ غلام کے منہ پر

کھینچ کر مارا اور غصہ سے بے قابو ہو گیا۔ میں نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین! اگر جان کی امان ہو تو میں کچھ عرض کروں۔ ہارون نے کہا کہو کیا کہتے ہو۔ میں نے عرض کیا۔" اے امیر المومنین! آپ دیکھ چکے ہیں کہ کل دوسروں کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ــــ بنو امیہ کی حکومت کے زوال کی طرف اشارہ تھا ــــ دنیا کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتی اور نہ ہی اس پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو ترفہ اور تنعم کا اتنا عادی نہ بنائیں۔ آپ کو نرم اور سخت ہر قسم کی چیزیں کھانی چاہئیں، ملائم اور کھردرا ہر طرح کا لباس پہننا چاہیئے۔ سرد اور گرم ہر نوع کی چیزیں پینی چاہئیں۔ ہارون نے مجھے اپنے ہاتھ سے تھپتھپایا اور کہا۔ خدا کی قسم میں اُدھر نہیں جا رہا ہوں جہاں تم سمجھ رہے ہو۔ میں نرم و نازک چیزیں اُس وقت تک پہنتا ہوں جب تک ترفہ و تنعم کی یہ چیزیں مجھے میسر ہیں۔ اگر مجھے زمانہ کی گردش پیش آئی تو میں اپنے اس دوسرے انداز کی طرف بغیر کسی جزع فزع کے لوٹ آؤں گا۔[1]

امین

امین آیا تو اس نے لہو و لعب میں ایک قدم اور آگے بڑھایا بلکہ چند قدم اور آگے بڑھائے ــــ محقق مورخین کتنا ہی کہیں کہ امین کے متعلق زیادہ تر واقعات اس کی شہرت کو داغدار بنانے اور اس کی شان کو کم کرنے اور جو کچھ اس کے ساتھ کیا گیا تھا اس کو درست ثابت کرنے کے لئے مامون کے زمانہ میں

---

[1] شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید صفحہ ۱۲۲ جلد ا

غلط طور پر گھڑے گئے ہیں۔ مگر لہو و لعب اور شراب و غلمان میں افراط کی طرف اس کا میلان ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کا انکار کر دینا سہل ہو۔

طبری کا بیان ہے کہ جب محمد امین بادشاہ ہوا تو اس نے ہیجڑے تلاش کر کر کے انھیں خریدا اور ان کی بڑی بڑی قیمتیں دیں۔ اور انھیں رات دن خلوت میں اپنے ساتھ رکھا۔ اس کے کھانے پینے کے انتظامات اور امر و نہی سے متعلق معاملات سب انہی ہیجڑوں کے ہاتھ میں تھے۔ آزاد عورتوں اور باندیوں سے اسے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ لوگ امین کو ان ہیجڑوں کے ساتھ متہم کرنے لگے تھے۔ اس سلسلہ میں کوئی شاعر کہتا ہے ؎

لَهُمْ مِنْ عُمْرِهٖ شَطْرٌ وَ شَطْرٌ
يُعَاقِرُ فِيهِ شُرْبَ الْخَنْدَرِيْسِ
وَمَا لِلْغَانِيَاتِ لَدَيْهِ حَظٌّ
سِوَى التَّقْطِيبِ بِالْوَجْهِ الْعَبُوْسِ
إِذَا كَانَ الرَّئِيْسُ كَذَا سَقِيْمًا
فَكَيْفَ صَلَاحُنَا بَعْدَ الرَّئِيْسِ؟
فَلَوْ عَلِمَ الْمُقِيْمُ بِدَارِ طُوْسٍ
لَعَزَّ عَلَى الْمُقِيْمِ بِدَارِ طُوْسٍ

اس کی عمر کا نصف حصہ تو ہیجڑوں کے لیے ہے اور باقی آدھا حصہ شراب

پینے کے لئے۔ خوبصورت عورتوں کے لئے اس کے نزدیک کوئی
حصہ نہیں سوائے منہ بنانے اور چہرہ پر شکنیں ڈال لینے کے جب رئیس
ایسا بیمار ہو تو رئیس کے بعد ہم لوگوں کی تندرستی کی کس طرح امید کی جا سکتی
ہے اگر وارطوس (وہ مقام، جہاں رشید مدفون تھا) میں رہنے والے
کو یہ معلوم ہو جائے تو اسے وارطوس میں رہنا مشکل ہو جائے۔[۱]

طبری کا بیان ہے کہ امین نے بادشاہ ہو جانے کے بعد تمام شہروں سے
تلاش کرا کر کے لہو ولعب کے فنکاروں کو جمع کیا۔ ہر وقت ان کو اپنے ساتھ رکھتا
اور انھیں بیش قرار تنخواہیں دیتا اور طرح طرح کے عجیب وغریب چوپائے اور وحشی
خطرناک جانور، درندے اور پرندے وغیرہ خریدنے میں بیش قرار رقمیں خرچ
کر ڈالیں۔ اپنے بھائیوں، گھر والوں، وزراء اور امراء سے دور دور رہتا۔ ان کی
توہین کرتا۔ خزانوں میں جو کچھ زر وجواہر تھا سب اپنے ہیجڑوں، ہم نشینوں اور
خوش گپیاں کرنے والوں میں تقسیم کر ڈالا۔ اپنی سیر وتفریح کے لئے کئی مکانات
بنوائے۔ ان میں خلوت کی جگہیں، کھیل کود کی جگہیں الگ الگ بنوائیں.....
دجلہ میں پانچ بڑے بڑے ستون بنوائے۔ ایک شیر کی صورت کا دوسرا ہاتھی کی
صورت کا تیسرا عقاب کی صورت کا چوتھا سانپ کی صورت کا اور پانچواں گھوڑے

---

[۱] طبری صفحہ ۲۱۵ جلد ۱۰

کی صورت کا۔ ان کے بنوانے پر بے شمار دولت خرچ کر ڈالی۔ ان کے بارہ میں ابو نواس شاعر نے اپنے مدحیہ قصیدے سے کہے[1] .... امین کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اس کا وزیر فضل بن الربیع کہتا ہے کہ وہ ظربان (عود بلاؤ) کی طرح سوتا ہے اسے مال و دولت کے زوال کی کوئی فکر نہیں۔ کوئی رائے قائم کرنے یا کوئی تدبیر اور چال سوچنے میں اپنی فکر کو تکلیف دینا پسند ہی نہیں کرتا اسے اس کے جام و سبو نے غافل کر رکھا ہے وہ اپنے لہو و لعب میں تیزی سے دوڑ اچھلا جا رہا ہے اور زمانہ اس کی ہلاکت کے لیے گڑگڑا رہا ہے۔ عبداللہ مامون نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس نے اس کے لیے چلہ میں نشانہ پر بیٹھنے والے تیر چڑھائے ہیں۔ مکان کی دوری کے باوجود اس پر موت کے تیر برسا رہا ہے اور گھوڑوں کی پشت پر اس کے لیے موتیں سوار کر کے بھیج رہا ہے۔ نیزوں اور تلواروں کی دھاریں اس نے اس کے لیے موت کی تیزیاں باندھ رکھی ہیں[2]۔

مامون

امین کے بعد مامون آیا۔ مامون کی خواہشات اور اس کے مشاغل وہ نہیں تھے جو امین کے تھے۔ امین کے مشغلے ایک الھڑ نوجوان کے مشغلے تھے جسے سلطنت اور مال و دولت بے دریغ مل گیا تھا۔ ساتھ ہی اس کی عقل میں بھی پختگی نہیں آئی تھی۔ لہٰذا وہ ہر وقت اپنی شہوت کو فرو کرنے

---

[1] طبری صفحہ ۲۱۵ جلد ۱۰ [2] طبری صفحہ ۱۵۷ جلد ۱۰

میں بے دریغ دولت خرچ کرتا رہتا تھا۔ مامون اس کے برعکس وہ آدمی تھا جسے تجربات نے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ جنگ کی ہولناکیوں نے جو اس نے سہیں اور مملکت کی ضرورتوں نے کہ اسے ازسرنو نئی تخلیق کی ضرورت تھی ــــ مامون کو حزم واحتیاط اور معاملات کی بصیرت کا سبق دیدیا تھا۔ اس کے بعد اس کی لذتیں زیادہ تر عقلی تھیں جن میں اس کا زیادہ تر وقت گذرتا تھا۔ اسے کتابوں سے محبت تھی۔ اسے فلسفہ سے عشق تھا۔ وہ دینی اور فقہی مسائل میں مناظرے اور مباحثے پسند کرتا تھا۔ اس کے گرد ہر قسم کے علمار رہتے تھے جن سے وہ ہر وقت بحث مباحثہ کرتا رہتا تھا اس کے ساتھ ہلکا سا لہو ولعب بھی کر لیتا تھا۔ چنانچہ نبیذ بھی پی لیا کرتا تھا[۱]۔ بغداد آجانے کے بعد بیس مہینے تک اس نے قطعاً گانا نہیں سنا۔ اس کے بعد سننے لگا تھا[۲]۔ اس کی مجلس کو زینت دینے والا اور اسے گانا سنانے والا اسحٰق موصلی تھا جیسا کہ اس کا باپ ابراہیم موصلی اس کے باپ رشید کی مجلس کو زینت بخشا کرتا تھا۔ مامون نے اسحٰق کو اپنا مقرب بنایا اور اس کی شان بہت بلند کر دی۔ ایسے ہی اس نے اپنے چچا ابراہیم بن المہدی کو بھی مقرب بنایا جو اپنے گانوں میں بڑا موجد تھا۔

امین اور مامون کے درمیان فتنوں کے دنوں میں لوگوں نے بڑی مشقتیں اور مصیبتیں اٹھائی تھیں بغداد برباد ہو گیا تھا اور ہر طرف تنگی اور بدحالی کا دور دورہ

---

[۱] طبری صفحہ ۲۵۶ جلد ۱۰ وطیفور صفحہ ۲۰۰ [۲] جلد ۱ ایضاً اغانی صفحہ ۱۰۶ جلد ۵

تھا۔ جونہی سکون و اطمینان لوٹا لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ انھیں جو کچھ وہ کھو چکے ہیں اس کے عوض کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس احساس کے ماتحت لوگ لہو و لعب میں گرفتار ہوئے اور حد سے تجاوز کر گئے۔

شاہی محلات کے مختلف پہلوؤں میں سے یہ ایک پہلو تھا جس کی تفصیل ہم نے بیان کی ہے کیونکہ فن اور ادب پر اس کا بہت بڑا اثر تھا۔ شاہی محلات کے دوسرے پہلو بھی تھے۔ ایک سیاسی پہلو بھی تھا جو ہمارے موضوع کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایک علمی پہلو بھی تھا یعنی علم کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی، اس سلسلہ میں مال و دولت کا خرچ، بحث مباحثہ اور مناظرہ کے لئے مجلسیں منعقد کرنا۔ کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ ان کو نقل کرانا اور ان کے ترجموں پر کام کرنا۔ اس سلسلہ میں جن خلفاء نے بہت زیادہ کام کیا ان میں خلیفہ منصور، ہارون رشید اور مامون رشید کا نام سر فہرست ہے۔ اس پہلو کی وضاحت ہم حرکت علمیہ پر گفتگو کرتے ہوئے آیندہ کریں گے۔

٭

شراب کے متعلق گفتگو اور مذاہب کا بیان

چونکہ شراب کے بارہ میں بہت باتیں کہی گئی ہیں ہم ابن خلدون کی وہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ بعض خلفاء نبیذ پیتے تھے۔ شراب نہیں پیتے تھے۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ عراق کے فقہاء نبیذ پینے کو جائز سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں

قوں کے اثرات ادب اور لٹریچر پر بھی پڑے۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم شراب کے متعلق چند باتیں کہتے جائیں۔

عربوں کے ہاں شراب بہت ہوتی تھی اور اس کی انواع متعدد تھیں۔ وہ اپنے پڑوس میں بسنے والی دوسری قوموں سے بھی شراب کی نئی نئی اقسام اور رنگ رنگ کی عادات ورسوم لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ شام کے لوگوں نے رومیوں سے شراب کی وہ قسم لی جس میں شہد کی آمیزش ہوتی تھی۔ انھوں نے اس کا رومی نام "رساطون" (ROSATOUN) نقل کیا ہے۔ جسے حجاز عرب کے لوگ اس سے پہلے نہیں پہچانتے تھے[۱]۔ جیسا کہ بعض اموی امراء وخلفاء نے ایرانیوں سے ایک شراب لی تھی جس کا نام "ہفنجہ" تھا۔ جسے ایران کے لوگ سات ہفتوں میں پیتے تھے جبکہ چاند اپنی بعض خاص منزلوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ولید بن یزید نے بھی اسے اسی طرح پیا تھا[۲]۔

اسی طرح مختلف اقوام میں مختلف شرابیں، اور شراب سے متعلق مختلف عادات تھیں جو آہستہ آہستہ مسلمانوں میں بھی سرایت کرتی جارہی تھیں۔ جب عباسیوں کا دورِ حکومت آیا تو انھوں نے اس کی انواع میں، اس کی مجالس میں اور مجلس آرائیوں میں مزید تفنن سے کام لیا۔

---

[۱] لسان العرب میں "ر س ط" کا مادہ ملاحظہ فرمایئے [۲] اغانی صفحہ ۱۳۰ جلد ۶

اسلام نے شراب کے خلاف جنگ کی اور نشہ کو حرام قرار دیدیا۔ یہ آیت نازل ہوئی

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْأَنْصَابُ وَ الْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○

اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ شراب، جوا، چڑھاوے اور تیروں کے ذریعہ سے تقسیم کئے ہوئے اموال ناپاک اور نجس چیزیں ہیں لہذا ان سے بچتے رہو۔ توقع ہے کہ اس طرح تم قانون خداوندی سے ہم آہنگ رہ سکو گے۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تم لوگوں کے درمیان میں عداوت اور بغض کے بیج بوے اور تمہیں خدا کے قانون کو پیش نظر رکھنے سے اور صلوٰۃ سے روک دے۔ تو کیا اے مسلمانو! تم ان چیزوں سے باز آجاؤ گے؟

لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف سوالات اس آیت کریمہ کے متعلق اٹھائے گئے۔ "خمر" سے کیا مراد ہے۔ کیا صرف شیرہ انگور ہی کو، یا ہر نشہ آور چیز کو "خمر" کہتے ہیں؟ کیا ہر قسم کی شراب جس کی زیادہ مقدار نشہ کرتی

ہو اس میں سے تھوڑا سا پی لینا بھی حرام ہے یا بعض اقسام ایسی بھی ہیں جن میں تھوڑا سا پی لینا حلال ہے؟ دیکھئے فقہ میں نبیذ کا مسئلہ پیدا ہوا۔ وہ حرام ہے یا حلال ہے اور حلال ہے تو کس قدر حلال ہے؟ یہ اختلاف صحابہ کے دور ہی میں پیدا ہو گیا تھا اور بعد تک چلتا رہا۔ ہم نے عمر بن عبدالعزیز کو دیکھا ہے کہ نبیذ کے بارہ میں ان اختلافات سے انھیں آنے والے خطرہ اور اس کے ضرر کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ انھوں نے پورے ملک میں اپنی ایک چٹھی گشت کرا دی تھی جس میں نبیذ کو انھوں نے حرام قرار دیا تھا[1]۔ حتیٰ کہ ائمۂ فقہ کا زمانہ آگیا اور ان کے مابین بھی یہ اختلاف جوں کا توں رہا۔ تینوں امام یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل اس طرف گئے کہ اس دروازہ کو مکمل طور پر بند کر دینا ہی ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے آیت سابقہ میں۔ "الخمر" کی تفسیر ایسے معانی کے ساتھ کی جس میں تمام نشہ آور نبیذیں یعنی کھجور کی نبیذ، کشمش کی نبیذ، جو، چاول اور شہد کی نبیذ وغیرہ سب داخل ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ سب کو "خمر" کہا جاتا ہے اور سب کی سب حرام ہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہ نے آیت میں "الخمر" کی تفسیر شیرۂ انگور سے کی اور کلمۂ "خمر" کے لغوی معنی نیز بعض دوسری احادیث سے سند پکڑی اور ان کے اجتہاد نے انھیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ نبیذ کی

---

[1] حضرت عمرؒ کا یہ خط العقد الفرید صفحہ ۴۱۱ جلد ۳ میں موجود ہے۔

بعض اقسام مثلاً کھجور اور کشمش کی نبیذ اگر اسے ذرا سا جوش دیا گیا ہو اور اس کی اتنی مقدار پی لی جائے جو نشہ آور نہ ہو تو وہ حلال ہے۔ ایسے ہی اگر دو چیزوں کو ملا کر نبیذ بنائی جائے جسے "خلیطین" کہتے تھے۔ یعنی تھوڑی سی کھجوریں لی جائیں اور اس کے برابر کشمش لی جائے اور اسے برتن میں رکھ کر اس پر تھوڑا سا پانی ڈال دیا جائے اور کچھ عرصہ تک اسے ایسے ہی رہنے دیا جائے تو اس کا پینا بھی جائز ہے۔ ایسے ہی شہد اور انجیر کی نبیذ اور گیہوں اور شہد کی نبیذ بھی[۱]۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس مسئلہ میں جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود کی پیروی کی ہے۔ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہی اہل عراق کے مدرسہ کے امام تھے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی فقہ اور ابن مسعودؓ کی فقہ میں کس قدر شدید ارتباط ہے[۲]۔ ہمارے اس خیال کی دلیل وہ روایت ہے جو صاحب عقد فرید نے عبداللہ ابن مسعودؓ سے نقل کی ہے کہ وہ نبیذ کو حلال سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ ان سے یہ روایات بڑی کثرت اور شہرت کے ساتھ نقل کی جاتی ہیں اور پھیلائی گئی ہیں۔ کوفہ کے عام تابعین نے ان روایات ہی کی پیروی کی ہے۔ اور انھیں اپنی سب سے بڑی دلیل قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ان کا ایک شاعر کہتا ہے۔

---

[۱] ہم نے ان مسائل میں شرح نووی علی مسلم صفحہ ۳۹۲ جلد ۱۳ اور زیلعی صفحہ ۴۵ جلد ۶ و ما بعد سے رجوع کیا ہے [۲] فجر الاسلام صفحہ ۲۲۰

مَنْ ذَا يُحَرِّمُ مَاءَ الْمُزْنِ خَالَطَهُ
فِيْ جَوْفِ خَابِيَةٍ مَاءُ الْعَنَاقِيْدِ؟
اِنِّيْ لَاَكْرَهُ تَشْدِيْدَ الرُّوَاةِ لَنَا
فِيْهِ وَيُعْجِبُنِيْ قَوْلُ ابْنِ مَسْعُوْدِ

کون ہے جو اس بارش کے پانی کو حرام قرار دیدے جس میں کسی گھڑے کے اندر چند خوشوں کا عصارہ مل گیا ہو۔ میں رواۃ کے اس تشدد کو پسند نہیں کرتا جو وہ اس سلسلہ میں ہمارے لئے کرتے ہیں۔ مجھے تو اس ضمن میں ابن مسعودؓ کا قول بہت پسند ہے[1]۔

بہر حال فقہاء کے درمیان نبیذ کے بارہ میں سخت جھگڑا تھا۔ اسی طرح جیسا کہ گانے کے بارہ میں ان میں سخت اختلاف تھا۔ چنانچہ ابن ابی لیلی نبیذ کو حرام قرار دیتے اور امام ابو حنیفہ سے بحثیں کرتے تھے اور ابو حنیفہ ان کا جواب دیتے تھے۔ کوفہ کے فقہاء میں تنہا عبد اللہ ابن ادریس تھے جو نبیذ کو حرام کہتے تھے اور وہ ان لوگوں کی تردیدیں کرتے تھے اور یہ لوگ عبد اللہ ابن ادریس کی تردیدیں کرتے تھے[2]۔ چونکہ اکثر فقہائے عراق نبیذ کو حلال سمجھتے تھے لہذا عراق کے لوگ نبیذ کو

---

[1] العقد صفحہ ۵۰۱ جلد ۳ [2] ملاحظہ ہو کتاب العقد اور ابن قتیبہ کی کتاب الاشربہ۔ یہ کتاب مجلہ المقتبس میں شائع ہو چکی ہے اور صاحب العقد نے بھی اس کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔

حلال سمجھنے میں مشہور تھے.... چنانچہ ان کا ایک شاعر کہتا ہے۔

رَأْيُهُ فِي الْغِنَاءِ رَأْيُ حِجَازِيٍّ

وَفِي الشَّرَابِ رَأْيُ أَهْلِ الْعِرَاقِ

گانے کے بارہ میں اس کی رائے حجازی ہے اور شراب کے بارہ میں

اہل عراق کی رائے کے مطابق ہے۔[1]

یہ بحث مباحثے ادیبوں اور شاعروں تک پہنچ گئے تھے۔ اور انھوں نے ان آراء کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے تھے: "اہل حرمین نے گانے کو حلال کر دیا ہے اور نبیذ کو حرام کر دیا ہے اور اہل عراق نے نبیذ کو حلال اور گانے کو حرام کر دیا ہے۔ لہذا ان حضرات نے اپنے اختلاف کی وجہ سے ہمارے لئے دونوں معاملوں میں رخصت مہیا کر دی ہے۔ یہاں تک کہ ان میں اتفاق ہو جائے۔[2]

ابن الرومی نے کہا۔

أَبَاحَ الْعِرَاقِيُّ النَّبِيذَ وَشُرْبَهُ

وَقَالَ: حَرَامَانِ الْمُدَامَةُ وَالسُّكْرُ

---

[1] باوجودیکہ اکثر فقہائے عراق نبیذ کو حلال سمجھتے تھے لیکن اسے پینے سے بہر حال احتراز برتتے تھے۔ اس سلسلہ میں کسی فقیہ کا یہ قول مشہور ہے کہ میرے لئے بار بار نبیذ کے بارہ میں یہ کہنا کہ وہ حلال ہے اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں ایک مرتبہ اسے حرام کہدوں۔ اور میرے لئے آسمان سے گر پڑنا اور ریزہ ریزہ ہو جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں اس کا ایک قطرہ بھی چکھوں۔ الغیث صفحہ ۲۱۲ ج ۱ [2] محاضرات الادبار صفحہ ۲۱۲ ج ۱

وَقَالَ الْحِجَازِیُّ: الشَّرَابَانِ وَاحِدٌ

فَحَلَّ لَنَا مِنْ بَیْنِ قَوْلَیْهِمَا الْخَمْرُ

سَاٰخُذُ مِنْ قَوْلَیْهِمَا طَرَفَیْهِمَا

وَاَشْرَبُهَا لَا فَارَقَ الْوَازِرَ الْوِزْرُ

عراقی فقہار نے نبیذ اور اس کے پینے کو مباح قرار دیا۔ اور انھوں نے کہا کہ حرام تو شراب اور نشہ ہے۔ حجازی فقہار نے کہا کہ دونوں پینے کی چیزیں (نبیذ اور شراب) ایک جیسی ہیں لہذا ان دونوں کی باتوں سے ہمارے لئے شراب کا جواز نکل آیا۔ میں دونوں کی باتوں کا ایک ایک جزو لے لیتا ہوں۔ (عراقی فقہار کا یہ جزو کہ نبیذ حلال ہے اور حجازی فقہا کا یہ جزو کہ پینے کی دونوں چیزیں ایک جیسی ہیں) اور شراب پیتا ہوں گناہگار سے گناہ کبھی جدا نہ ہو۔[1]

مختصر یہ کہ بہت سے لوگوں نے ان آرار کو بہانہ بنا کر انھیں اپنی اغراض کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ فقہار کا یہ اختلاف نبیذ نوشی کا باعث نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اس نوع تک ہی اکتفار نہیں کرتے تھے جس کو انھوں نے حلال قرار دیا تھا اور نہ اس مقدار تک اکتفار کرتے تھے جو ان کے نزدیک جائز تھی

---

[1] محاضرات الادبار صفحہ ۴۱۲ جلد ۱

کیونکہ کسی فقیہہ نے بھی نبیذ کی کسی قسم کو نشہ لانے کی حد تک پینا جائز قرار نہیں دیا تھا۔ لیکن یہ تو ادیبوں کا ایک تفنن تھا اور شعراء کی ظرافت تھی جو انھیں ہاتھ آگئی تھی۔

ابو نواس اور اس کے ہم نوا شعراء نے کبھی اس طرح کے حیلوں کی آڑ نہیں لی بلکہ وہ کھلم کھلا پیتے تھے اور اقرار کرتے تھے کہ اس کا پینا حرام ہے۔ ان کا لیڈر ابو نواس کہتا ہے۔

فَإِنْ قَالُوْا حَرَامٌ قُلْ حَرَامٌ
وَلٰكِنَّ اللَّذَاذَةَ فِي الْحَرَامِ

اگر لوگ کہتے ہیں کہ شراب حرام ہے تو تم بھی کہو کہ حرام ہے۔ لیکن یہ بھی تو واقعہ ہے کہ لذت حرام ہی میں ہوتی ہے۔

اور وہ کہتا ہے :۔

أَلَا فَاسْقِنِيْ خَمْرًا، وَقُلْ لِيْ هِيَ الْخَمْرُ
وَلَا تَسْقِنِيْ سِرًّا إِذَا أَمْكَنَ الْجَهْرُ

یاد رکھ! تو مجھے شراب پلا اور کہہ کہ یہ شراب ہے۔ اور جب تک کھلم کھلا پلانا ممکن ہے مجھے چھپ کر نہ پلا

⁂

خواص اور مالدار لوگوں نے خلفاء کے محلات کی تقلید کی اور عیش و عشرت

کی زندگی بسر کرنے لگے بلکہ لہو ولعب میں یہ لوگ خلفاء سے

عباسی گھرانا اور لوگوں پر اس کے اثرات

بھی بڑھ گئے کیونکہ طبعی طور پر خلفاء کی مجالس میں رعب اور وقار قائم رکھا جاتا تھا اور ان مالداروں اور خواص کی مجالس میں اس کا اہتمام بھی نہیں تھا۔

خلفاء کی اولاد اور ان کے اعزا و اقارب کچھ کم نہیں تھے۔ مامون کے زمانہ میں ان کو شمار کیا گیا تو مرد، عورتیں، بچے اور بڑے سب مل ملا کر تینتیس ہزار تک پہنچے تھے[1] سب کے سب اپنی خوبصورتی اور نزاکت میں ممتاز تھے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اولادِ خلافت کی خوبصورتی ہارون رشید کی اولاد پر ختم ہو گئی ہے۔ اور رشید کی اولاد میں سے بھی محمد اور ابو عیسیٰ پر ختم ہو گئی ہے۔ ابو عیسیٰ جب سوار ہو کر کہیں جاتے تھے تو لوگ انھیں دیکھنے کے لئے سڑک پر دو رویہ .... بیٹھ جایا کرتے تھے۔ خود خلفاء کو دیکھنے کے لئے بھی لوگ اس اکثرت سے نہیں بیٹھتے تھے[2]۔ اس گھرانے کے زیادہ تر افراد گانے اور دیگر فنون لطیفہ کے گرویدہ تھے۔ عُلَیّہ بنت مہدی ان شاعروں میں سے تھی جو نہایت عمدہ اور نہایت ظرافت آمیز اشعار کہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کے لئے خود ہی بہتر سے بہتر دُھنیں بھی ایجاد کر لیتی تھی[3] اور اس کا بھائی ابراہیم ابن المہدی بھی گانوں کا بہترین عالم ساز بجانے کا

---

[1] مسعودی صفحہ ۲۰۹ جلد ۲ [2] اغانی صفحہ ۹۰ جلد ۹ [3] اغانی صفحہ ۸۳ جلد ۹۔

بہترین ماہر اور گانے میں نہایت طباع اور نہایت خوش گلو شخص تھا[1]۔ پھر ابو عیسیٰ ابن ہارون رشید — جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں — اپنی خوبصورتی میں نہایت مشہور تھا چہرہ اور بشرہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ حسین۔ ساتھ بیٹھنے اور بات چیت کرنے میں سب سے بہتر۔ نہایت رند مشرب بہترین نادرہ گو اور سب سے زیادہ کھیلوں کا شائق[2]۔ اس کی موت کا سبب یہ ہوا کہ اسے سؤر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ شکار میں سواری سے گر پڑا اور دماغ پر چوٹ آئی جس سے جاں بر نہ ہو سکا[3]۔ خواص کی اولاد ان کے قدم بقدم چلتی تھی۔ فضل بن الربیع — رشید کے وزیر — کا پوتا یعنی عبداللہ بن عباس ابن فضل بن الربیع، ماہر مغنی تھا۔ رند مشرب اور عریاں گو شاعر تھا[4]۔ نرگس کے باغیچوں میں صبح گذارتا اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس جیسے نوجوان بکثرت تھے جن کا تذکرہ کرنے سے مضمون طویل ہو جائے گا۔ مالدار خواص کی اولاد سے یہ بیماری متعدی ہو کر درمیانی طبقہ تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ وہ بھی ان کے قدم بقدم چلتے اور ان کے طریقہ پر زندگی بسر کرتے تھے۔

ترف کے مظاہر فن تعمیر میں بھی انھوں نے بڑی تفنن آفرینیاں کیں اور عمدگی کے ساتھ بڑے بڑے محلات بنائے۔ ابن الجہم نے

---

[1] اغانی صفحہ ۳۵ ج ۹ [2] اغانی صفحہ ۹۶ ج ۹ [3] اغانی صفحہ ۹۷ ج ۹ [4] اس کے حالات اغانی صفحہ ۱۲۷ ج ۱۷ میں دیکھیے۔

اس کی تعریف میں کہا تھا۔

صُحُونٌ تُسَافِرُ فِيهَا الْعُيُونُ

وَ تَحْسِرُ عَنْ بُعْدِ اَقْطَارِهَا

وَ قُبَّةُ مُلْكٍ كَاَنَّ النُّجُوْ

مَ تُصْغِيْ اِلَيْهَا بِاَسْرَارِهَا

وَ فَوَّارَةٌ ثَارُهَا فِي السَّمَاءِ

فَلَيْسَتْ تَقْصُرُ عَنْ ثَارِهَا

اِذَا اُوْقِدَتْ نَارُهَا فِي الْعِرَاقِ

اَضَاءَ الْحِجَازَ سَنَا نَارِهَا

تَرُدُّ عَلَى الْمُزْنِ مَا اَنْزَلَتْ

عَلَى الْاَرْضِ مِنْ صَوْبِ اَقْطَارِهَا

لَهَا شُرُفَاتٌ كَاَنَّ الرَّبِيعَ

كَسَاهَا الرِّيَاضَ بِاَنْوَارِهَا

وسیع صحن ہیں جن میں نگاہیں سفر کرتی ہیں اور ان کے بعد مسافت کی وجہ سے نگاہیں گوشۂ چشم میں سمٹ کر لوٹ آتی ہیں۔ شاہی اونچے اونچے قبے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ستارے اُن سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ فوارے ایسے کہ ان کی نظیر آسمان ہی پر مل سکتی ہے

اور جو اپنی ان نظیروں سے کسی طرح کم رتبہ نہیں ہیں۔ جب ان محلات
کے میناروں میں آگ عراق میں روشن کی جائے تو ان کی آگ کی
روشنی حجاز کو روشن کر ڈالے۔ وہ فوارے بادلوں کو ان کا وہ پانی
واپس دیر ہے ہیں جو انھوں نے زمین کے اطراف میں برسایا ہے۔ ان
میں ایسے ایسے سبز پوش بالا خانے ہیں کہ گویا بہار نے انھیں اپنے باغات
اور باغات کے شگوفے پہنا دیئے ہوں۔

کوئی آدمی واثق باللہ کے ایک قصر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔ حشم
و خدم مجھے برابر دوسرے حشم و خدم کے حوالہ کرتے رہے تا آنکہ میں ایک ایسے مکان
میں پہنچا جس کا صحن پختہ فرش کا تھا اس کی دیواروں پر زرکار دیبا کے پردے پڑے
ہوئے تھے کہ دیوار کہیں سے نظر نہیں آتی تھی۔ پھر میں ایک عالی شان دیوان میں پہنچا
جس کی زمین اور دیواروں پر اسی قسم کے پردے اور فرش پڑے ہوئے تھے میں
نے دیکھا تو دیوان کے صدر میں واثق باللہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک تخت پر بیٹھا تھا جو
جواہرات سے مرصع تھا۔ جو لباس وہ پہنے ہوئے تھا وہ بھی سونے کے تاروں سے
بنا ہوا تھا۔ اور اس کے پہلو میں اس کی باندی "فریدہ" بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی
اسی قسم کا لباس پہنے ہوئی تھی۔ اور اس کی گود میں عود تھا[1] دستر خوانوں، دستر خوانوں

---

[1] اغانی صفحہ ۱۴۴ جلد ۳

کی ترتیب و نظم، اور رنگ برنگے کھانوں میں بھی کافی مبالغہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ عمانی شاعر نے محمد بن سلیمان بن علی کے دستر خوانوں پر جو کچھ کھایا تھا اس کا بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے ؎

حَبَاؤُنَا بِهُرْنِيِّ لَهُمْ مَلْبُوْنٍ

بَاتَ يُسْقَى خَالِصَ السَّمُوْنِ

مُصَوَّمٍ مَعَ أَكْوَمَ ذِي غُضُوْنٍ

قَدْ حُشِيَتْ بِالسُّكَّرِ الْمَطْحُوْنِ

وَ لَوَّنُوْا مَا شِئْتَ مِنْ تَلْوِيْنٍ

مِنْ بَارِدِ الطَّعَامِ وَالسَّخِيْنِ

وَ مِنْ شَرَاسِيْفَ وَ مِنْ طَرْدِيْنٍ

وَ مِنْ هُلَامٍ وَ مَصِيْصٍ جُوْنٍ

وَ مِنْ أَدَنِيِّ نَاتِقٍ سَمِيْنٍ

وَ مِنْ دُجَاجٍ فُتَّ بِالْعَجِيْنِ

فَالشَّحْمُ فِي الظُّهُوْرِ وَالْبُطُوْنِ

وَ أَتْبَعُوْا ذٰلِكَ بِالْجَوْزِيْنِ

وَ بِالْخَبِيْصِ الرُّطَبِ وَاللَّوْزِيْنِ

وَ فَكَّهُوْا بِعِنَبٍ وَ تِيْنٍ

وَالرُّطَبِ الْأَزَاذِ وَالْهِيْرُوْنِ

وہ اپنی دودھ پلائی ہوئی فرنی لائے (فرنی ایک روٹی کی قسم ہے جس کے کنارے درمیان تک ملا دیئے جاتے ہیں اور گھی میں بھون لی جاتی ہے پھر اسے دودھ گھی اور شکر میں دیر تک تر رکھتے ہیں) جسے رات بھر خالص گھی پلایا گیا تھا۔ اندر سے کھوکھلی تھی اوپر سے اُٹھی ہوئی اور پھولی ہوئی اس کے اندر پسی ہوئی شکر بھری ہوئی تھی اور قسم قسم کے رنگ برنگے کھانے انھوں نے پیش کئے جن میں گرم کھانے بھی تھے اور ٹھنڈے بھی۔ بھُنی ہوئی چاب، کُردوں کا خاص کھانا طردین۔ گائے کے بچہ کے گوشت کے بھنے ہوئے کلیجے، بھنا ہوا گوشت جسے سرکہ میں بسایا گیا تھا۔ اور سیاہی مائل ٹکڑے۔ عمدہ تر و تازہ پرندے اور مرغ جن کو آٹے کے ساتھ توڑ کر پکایا گیا تھا۔ کمر اور شکم کی چربی، اور ان سب کے بعد جوزین (اخروٹ کی کھیر)، سوجی کا حلوہ، کھجور کا حلوہ اور بادام کا حلوہ۔ پھر تفکہات میں انھوں نے انگور اور انجیر پیش کئے اور عمدہ قسم کی ازاذ اور ہیرون (دو عمدہ قسم کی کھجوریں)

ابوالعتاہیہ کا بیان ہے کہ مجھے مخارق (ایک مغنی کا نام ہے) کے گھر میں بلایا گیا۔ میں اس سے ملنے کے لئے گیا تو وہ ایک نہایت صاف ستھرے مکان میں لے گیا جس میں صاف اور پاکیزہ فرش بچھا ہوا تھا۔ پھر اس نے دسترخوان منگایا جس پر تلی ہوئی

روٹی، سرکہ، سبزیاں اور نمک تھا۔ ایک بھنا ہوا بکری کا بچہ تھا۔ جب ہم نے کھایا
اس کے بعد اس نے بھنی ہوئی مچھلی منگائی، ہم نے خوب شکم سیر ہو کر کھائی۔ پھر اس نے
حلوا منگایا۔ ہم نے وہ بھی کھایا اور ہاتھ دھو لئے۔ اس کے بعد فواکہ اور مختلف پھول پیش
کئے گئے اور طرح طرح کی نبیذیں لائی گئیں۔ اور مخارق نے مجھ سے کہا ان میں جو
نبیذ مجھے پسند ہو اسے منتخب کر لیجئے۔ چنانچہ میں نے انتخاب کر کے نبیذ پی[لے] یہ
ابو العتاہیہ کے زاہد بننے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

لہو و لعب اور شراب کی مجلسوں کے متعلق تو آپ کا جو جی چاہے کہہ لیجئے۔
وہاں آزادی اور رندمشربی کا جو مظاہرہ ہوتا تھا اس کے بیان سے پوری کتاب
الاغانی بھری پڑی ہے نیز بشار بن برد، ابو نواس اور مسلم بن الولید جیسے شعراء
کے دواوین بھی[لے]

گانے کے وہ بہت زیادہ گرویدہ ہو چکے تھے اور اس سلسلہ میں بھی ان
کی تفنن آفرینیاں کچھ کم نہیں تھیں۔ اپنی گانے کی مجلسوں میں انھوں نے خوش
مذاقی کی باتیں، لطیفے، نادرہ گوئی کے عمدہ نمونے اور شراب وغیرہ داخل کر لی
تھیں۔ اس سلسلہ میں ان کے دو مسلک تھے ایک جدید اور دوسرا قدیم ہر فریق کو

[لے] اغانی صفحہ ۱۸۰ جلد ۳ [لے] شراب کی مجلس کے بیان میں اسجع کا بیان پڑھئے۔ اغانی صفحہ ۲۴
جلد ۱۱ اور ابن رہین کے اشعار دیکھئے صفحہ ۳۶/۱ و مابعد نیز صفحہ ۱۱۲/۵ ج ۶

اپنے اپنے مسلک کے ساتھ تعصب تھا[1]۔ چوسر اور شطرنج بھی وہ کھیلتے تھے اور اس میں انھیں کافی غلو تھا[2]۔ کبوتروں کو پالنے اور انھیں تربیت دینے کا بھی خاص اہتمام تھا چنانچہ کبوتروں کی قیمت بہت گراں ہو گئی تھی[3]۔ مرغ لڑانے اور کتے لڑانے کا بھی زبردست شوق تھا[4]۔ ابو نواس عرصہ تک کتوں کا کھیل کھیلتا رہا حتیٰ کہ اسے کتوں کے متعلق اتنی معلومات ہو گئی تھیں جتنی اعرابیوں کو بھی نہیں ہوتیں[5]۔ جوا عام طور سے پھیلا ہوا تھا حتیٰ کہ فقیروں کے تکیوں تک میں جوا کھیلا جاتا تھا[6]۔ نقش و نگار اور مصوری کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ پیالوں پر مختلف چیزوں کی تصاویر بنانے کا بڑا رواج ہو گیا تھا۔ جس کا تذکرہ آپ کو بشار اور ابو نواس کے اشعار میں جگہ جگہ مل سکتا ہے۔ ابو الشبل نے ایک چراغ دان کا مرثیہ لکھا تھا جس پر نہایت نادر مصوری کی گئی تھی۔ اس چراغ دان کو اس کے ایک بکرے نے توڑ دیا تھا[7]۔ یوم نوروز پر طرح طرح کے ہدایا ایک دوسرے کو دیتے تھے جن پر طرح طرح کے عجیب و غریب نقش و نگار اور تصویریں بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ رقص و سرود کو کافی ترقی ہو گئی تھی۔ اسحٰق بن ابراہیم موصلی بہت اچھا رقص کرتے تھے۔ ان کے زمانہ میں اور بھی بہت سے لوگ رقص میں شہرت رکھتے تھے[8]۔ باغات کو بہت پسند کرتے

---

[1] اغانی صفحہ ۲۵ ج ۷ [2] مسعودی صفحہ ۵۶۴ ج ۲ [3] کتاب الحیوان صفحہ ۱۹ ج ۳ [4] اغانی صفحہ ۵، ۷ جلد ۶
[5] کتاب الحیوان صفحہ ۱۰ ج ۲ [6] کتاب الحیوان صفحہ ۱۱ ج ۵ [7] اغانی صفحہ ۲۴ ج ۱۳ نیز زہر الآداب صفحہ ۳۶ ج ۱ بھی ملاحظہ کیجیے۔ [8] اغانی جلد پنجم زیر حالات اسحاق۔

تھے۔ سیر و تفریح کے لئے اکثر باغات میں چلے جاتے تھے۔ دسترخوانوں کو پھولوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ پھولوں کے رنگوں اور خوشبوؤں کے بارہ میں شعراء غزلیں کہتے تھے[1]۔ غرضکہ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

دولت بے شمار ہو گئی تھی۔ ایرانی عنصر جو مدنیت و تہذیب میں ڈوبا ہوا تھا بڑھ گیا تھا۔ ساتھ ہی ترفہ و تنعم میں بھی وہ ڈوبے ہوئے تھے۔ باندیاں بکثرت ہو گئی تھیں جو مختلف ممالک سے برابر لائی جا رہی تھیں۔ خوبصورتی عام اور بے حجاب ہو گئی تھی۔ کیونکہ عام طور پر باندیوں سے پردہ نہیں کرایا جاتا تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لہو و لعب، عریاں گوئی، رندی اور مے آشامی کا زور کافی بڑھ گیا تھا۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ شعراء نے لوگوں کے اس رجحان کو محسوس کر لیا اور بشار بن برد، صریع الغوانی اور ابو نواس جیسے شاعروں نے اس طوفان کو اور بڑھایا۔ اس آگ کو اور بھڑکایا اور اس کا راستہ اور آسان بنا دیا۔

قوم شراب پی کر مست ہوتی تھی اور ضرورت محسوس کرتی تھی کہ انھیں ایسے اشعار ملیں جو ان کے اس رجحان کی سیری کا سامان مہیا کریں، ان کے اعمال کو مزین کر کے دکھائیں اور برابر شراب پیتے چلے جانے پر انھیں ابھاریں۔ ان شعراء کے اشعار میں انھیں اپنی خواہش کی سیرابی کا سامان مل جاتا تھا۔ اگر وہ

---

[1] اغانی صفحہ ۱۳۰ جلد ۱۲

کسی نوجوان لڑکی یا عورت کے ساتھ تشبیب کرنا چاہتے تو ان شعراء کے اشعار میں انھیں اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کا سامان ایسا مل جاتا تھا جس میں کھلم کھلا عریانی کے ساتھ بغیر کسی استعارہ اور کنایہ کے یہ سب کچھ کہا گیا ہوتا تھا۔ بشار بن برد کے تو دو دن اس قسم کی آزاد عورتوں کے لئے مخصوص تھے جن میں وہ ان کو اس قسم کے فحش اور عریاں اشعار سنایا کرتا تھا اور وہ ان اشعار کو اس سے سیکھ کر لوگوں میں ان کو پھیلاتی تھیں۔

ترف کا حجاز سے عراق کی طرف انتقال

لہذا کوئی تعجب نہیں اگر زندگی ان دنوں لہو ولعب کی زندگی تھی اور اگر شعراء کے اشعار اس عہد میں باستثناء چند عموماً فحش، عریاں اور فسق و فجور سے پُر ہوتے تھے۔

یہاں ایک بات بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہے۔ یہی عراق جو بنو امیہ کے عہد حکومت میں وہ علاقہ تھا جو شام اور حجاز کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت پسند واقع ہوا تھا[1]۔ اب عباسی عہد حکومت میں لہو ولعب کا مرکز بلکہ لہو ولعب والوں کی نگاہوں کا محور بن گیا تھا اور سارے شہر عراق کے لہو ولعب ہی سے خوشہ چینیاں کرتے تھے۔

اس کا سبب چند امور تھے۔ جن میں سے اہم ترین ـــ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے

---

[1] فجر الاسلام صفحہ ۲۱۵

دو چیزیں تھیں۔

(اول) مال عراق وہ جگہ تھی جہاں ساری دولتمند مملکت اسلامیہ کے اموال آکر جمع ہوتے تھے ــــ اس وجہ سے کہ عراق ہی مرکز خلافت تھا ــــ اور مال ہی لہو و لعب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جہاں یہ ہوتا ہے وہاں لہو و لعب ضرور ہوتا ہے۔ غلام شراب، گانا بجانا وغیرہ وہیں ہوتا ہے جہاں ترفہ و تنعم ہوتا ہے اور ترفہ و تنعم بغیر مال کے نہیں ہو سکتا۔ عراق مال کے اعتبار سے سب ممالک سے بڑھا ہوا اور مرتبہ کے لحاظ سے سب سے فائق تھا۔ ہر فن کے باکمال آدمی ــــ ادب بھی فن سے الگ کوئی چیز نہیں ہے ــــ کا سکہ عراق ہی میں آکر چلتا تھا۔ اگر کوئی باکمال آدمی عراق نہیں آتا تھا تو اس کی شہرت ہی نہیں ہوتی تھی اور اس طرح اس کا فن ضائع ہو جاتا تھا کونسا مشہور مغنی تھا جو عراق میں نہیں تھا۔ کونسا بلند مرتبہ شاعر تھا جو عراق میں نہیں رہا اور کونسی باندی تھی جو خوبصورتی یا گانے میں کوئی امتیازی درجہ رکھتی ہو اور عراق نہ آئی ہو۔

(دوم) دوسرا سبب یہ تھا کہ عراق میں مخلوط نسل کے لوگ زیادہ تھے۔ قدیم زمانہ سے مختلف قومیں اور متعدد تہذیبیں یہاں حکمراں رہیں۔ عباسی عہد حکومت میں عراق خلافت کا پایہ تخت اور مختلف اقوام کا مقصود نظر رہا۔ ساتھ ہی یہ ایرانیوں کے ارستقراطی (aristocratic) عنصر کا مسکن تھا۔ ہند اور روم اور دیگر ممالک سے جو لوگ سفر کر کے آتے تھے وہ یہیں آکر اترتے تھے۔ ہر جنس کے بہتر سے بہتر

غلام یہیں لائے جاتے تھے۔ لہو ولعب میں ان سب کی اپنی تاریخ تھی۔ تہذیب و تمدن کی گہرائی تھی۔ اور ترفہ و تنعم کی تفنن آفرینیاں تھیں۔ جب یہ لوگ عراق میں آتے اور دیکھتے کہ راستے قطعاً ہموار ہیں تو ہر قوم اپنا فن پیش کرتی اور اپنی تہذیب و مدنیت کی انواع و اقسام سامنے لاتی۔ اس وجہ سے عراق ایک عام نمائش گاہ بن گیا تھا۔ چنانچہ عراق نے ان سے ہر چیز لی اور بحصۂ وافر لی باقی ممالک اور شہروں نے تو جو کچھ سیکھا عراق ہی سے سیکھا اور عراق ہی کی خوشہ چینی کی اور اسی سے کچھ حاصل کیا۔

٭٭

لیکن سچ یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے یہ تمام لوگوں کا حال نہیں تھا۔ کیونکہ سب کے سب نہ تو مالدار ہی تھے اور نہ سب کے سب ہزل گو ہی تھے۔ دنیا کی کسی قوم کا کسی زمانہ میں بھی یہ حال نہیں رہا۔ پھر پورا عالم اسلامی عراق ہی میں محدود نہیں تھا اور نہ عراق کے ملاہی وملاعب سارے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور نہ ہی سارا عراق اس تنعم کی زندگی بسر کر رہا تھا ـــــ لہٰذا اگر آپ کتاب الاغانی کا مطالعہ فرمائیں اور اس کے صفحات میں لہو ولعب کی ایک نوع سے گذر کر دوسری نوع کا حال پڑھیں یا دیوان ابونواس کا مطالعہ فرمائیں اور اس میں شراب وکباب اور رندی و مے آشامی کے کوائف دیکھیں تو اس سے آپ کو یہ خیال نہیں کر لینا چاہیئے کہ وہ اس پورے عہد کی تصویر ہے بلکہ واقعہ یہی ہے کہ وہ اس عہد کے متعدد نواحی اور مختلف وجوہ میں سے کسی ایک ناحیہ اور کسی ایک جہت کی تصویر ہوتی ہے۔ صاحب

اغانی کا عذر یہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب مغنیوں کے طبقات بیان کرنے کے لیے تصنیف کی ہے اور مغنی ہر عہد میں لہو و لعب کا مرکز اور رندی و آزادہ روی کا محور ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہمارا خیال ہے کہ ہمیں یہاں پہنچ کر اس نکتہ پر بھی متنبہ کر دینا چاہیئے جس کا احساس ابن خلدون کو ہوا اور وہ نکتہ یہ تھا کہ بڑے لوگوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے لذت اندوزیوں سے متعلق جھوٹی خبریں اور بے سروپا افسانے بھی گھڑے جاتے تھے۔ چنانچہ لوگ لہو و لعب کے افسانوں میں ان بڑے لوگوں کو ابھارنے کے لئے خوب نمک مرچ لگاتے اور مبالغہ آرائیوں سے کام لیتے تھے تاکہ اس کے نتیجہ میں انھیں ان بڑے لوگوں سے مال اور جاہ وغیرہ حاصل ہو سکے۔

دولتمندی اور تنگدستی میں لوگوں کے مختلف حالات

مملکت کے اموال کی تقسیم مساویانہ تو درکنار متقاربانہ بھی نہیں تھی۔ مختلف طبقات کے درمیان جو فرق تھا وہ خفیف درجہ کا نہیں تھا۔ بلکہ ان کے درمیان بڑی گہری گہری خلیجیں حائل تھیں۔ مملکت کے اموال کا بڑا حصہ خلفاء کے محلات، امراء، رؤساء، فوج، حکام سلطنت پر خرچ ہوتا تھا۔ یہ لوگ بیدردی کے ساتھ اسے مقربین شعراء، ادباء، علماء، موسیقار اور باندیوں، غلاموں، نوکروں چاکروں وغیرہ پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ اس کے بعد تجارت پیشہ لوگوں کا طبقہ تھا۔ یہ لوگ ثروت کے لحاظ سے پہلے

درجہ کے لوگوں سے کم ہوتے تھے۔ رہ گیا قوم کا عام طبقہ تو ان میں فقر و فاقہ عام تھا۔

مالدار طبقہ کو بغداد بہت پسند تھا۔ کیونکہ اُنھیں اپنے مذاق کی تمام چیزیں یعنی عیش و عشرت کی زندگی، فارغ البالی اور مسرت و فرحت میسر آسکتی تھیں۔

أَعَايَنْتَ فِي طُولٍ مِنَ الْأَرْضِ وَالْعَرْضِ

كَبَغْدَادَ دَارًا إِنَّهَا جَنَّةُ الْأَرْضِ؟

صَفَا الْعَيْشُ فِي بَغْدَادَ وَاخْضَرَّ عُودُهُ

وَعَيْشُ سِوَاهَا غَيْرُ صَافٍ وَلَا غَضٍّ

تَطُولُ بِهَا الْأَعْمَارُ إِنَّ غِذَاءَهَا

مَرِيٌّ وَبَعْضُ الْأَرْضِ أَمْرَأُ مِنْ بَعْضٍ

تم نے زمین کے طول و عرض میں بغداد کی طرح کی کوئی جگہ دیکھی ہے؟ بغداد تو زمین کی جنت ہے۔ بغداد میں زندگی بڑی صاف اور پاکیزہ ہے وہاں کی لکڑیاں بڑی سرسبز ہیں جبکہ دوسرے شہروں کی زندگی ناصاف اور ناخوشگوار ہے۔ بغداد میں عمریں بڑی لمبی ہوتی ہیں کیونکہ وہاں کی غذا خوشگوار ہے جبکہ بعض زمینیں دوسری زمینوں سے زیادہ تلخ اور ناخوشگوار ہوتی ہیں۔[1]

---

[1] تاریخ بغداد صفحہ ۶۸ جلد ا

رہ گئے فقرا اور ضرور تمند لوگ تو ان پر بغداد اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ تنگ تھا۔ ان کے لئے وہاں رہنا اور زندگی گذارنا ناممکن بن گیا تھا۔

بَغْدَادُ دَارٌ طِیْبُھَا اٰحِسْنٌ
نَسِیْمُھَا مِسْکٌ بِاَنْفَاسِیْ
یَصْلُحُ لِلْمُوْسِرِ لَا امْرِیءٍ
یَبِیْتُ فِیْ فَقْرٍ وَ اِفْلَاسٍ
لَوْ حَلَّھَا قَارُوْنُ رَبُّ الْغِنٰی
اَصْبَحَ ذَا ھَمٍّ وَ وَسْوَاسٍ
ھِیَ الَّتِیْ تُوْعِدُ لٰکِنَّھَا
عَاجِلَۃٌ لِلطَّاعِمِ الْکَاسِیْ
حُوْرٌ وَ وِلْدَانٌ وَ مِنْ کُلِّ مَا
تَطْلُبُہٗ فِیْھَا سِوَی النَّاسِ

بغداد ایسی جگہ ہے جہاں کی خوشبو اور ہوائیں مجھ سے تو میرا سانس تک چھین لینا چاہتی ہیں۔ وہ تو مالدار لوگوں کے لئے موزوں جگہ ہے اس آدمی کے لئے موزوں نہیں جو فقر و افلاس میں زندگی گذارتا ہو اگر بغداد میں دولتمند قارون بھی آجائے تو وہ بھی فکرمند اور وسواسی بن جائے گا۔ یہ وہی جگہ ہے جس کا ہم سے (مرنے کے بعد) وعدہ کیا جاتا

ہے اور کھانے پہننے والوں کو جلد (اسی دنیا میں) دیدی گئی ہے۔ اس

میں حوریں بھی ہیں غلمان بھی ہیں اور ہر وہ چیز ہے جس کی تم خواہش

کر و دیگر انسان نہیں ہیں۔

کوئی دوسرا شاعر کہتا ہے۔

اَذُمُّ بَغْدَادَ وَ الْمُقَامَ بِهَا

مِنْ بَعْدِ مَا خُبْرَةٍ وَ تَجْرِيبِ

مَا عِنْدَ سُكَّانِهَا لِمُخْتَبِطٍ

خَيْرٌ وَلَا فُرْجَةٌ لِمَكْرُوبِ

يَحْتَاجُ بِاَغْنِي الْمُقَامِ بِيَكْهُوا

اِلَىٰ ثَلَاثٍ مِنْ بَعْدِ تَرْتِيبِ

كُنُوْزُ قَارُوْنَ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ

وَ عُمْرُ نُوحٍ وَ صَبْرُ اَيُّوبِ

میں علم و تجربہ کے بعد بغداد اور وہاں قیام کرنے کی مذمت کرتا ہوں

..... کسی مصیبت زدہ فریادی کے لئے بغداد کے رہنے والوں کے

پاس کوئی بھلائی نہیں اور نہ کسی ستم رسیدہ کے لئے فراخی ہے۔ جو

وہاں رہنا چاہے اسے ہزار ملامتوں کے بعد بھی تین چیزوں کی ضرورت

ہے۔ اس کے پاس قارون کے خزانے ہونے چاہئیں، عمر نوح ہونی

چاہیئے اور صبر ایوب ہونا چاہیئے۔

تقویٰ اور صلاح و فلاح والے لوگوں اور زاہدوں نے بھی بغداد کو ناپسند کیا ہے..... ان کی ناپسندیدگی کی وجہ فسق و فجور اور ظلم و تعدی ہے جو انھوں نے بغداد میں دیکھا...... بعض نیک لوگوں کے سامنے جب بغداد کا ذکر کیا جاتا تو وہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

قُلْ لِمَنْ اَظْهَرَ التَّنَسُّكَ فِي النَّا
سِ وَ اَمْسٰى يُعَدُّ فِي الزُّهَّادِ
اِلْزَمِ الثَّغْرَ وَ التَّوَاضُعَ فِيْهِ
لَيْسَ بَغْدَادُ مَنْزِلَ الْعُبَّادِ
اِنَّ بَغْدَادَ لِلْمُلُوْكِ مَحَلٌّ
وَ مُنَاخٌ لِلْقَارِئِ الصَّيَّادِ

لوگوں میں جو زہد و عبادت ظاہر کرے اور زاہدوں میں شمار ہونے لگے اس سے کہہ دو کہ کسی دور دراز مقام پر تواضع کے ساتھ رہے۔ بغداد عبادت گذار لوگوں کی جگہ نہیں ہے۔ بغداد بادشاہوں کی کی جگہ ہے اور مال جمع کرنے والے شکاریوں کا ٹھکانہ ہے۔[1]

---

[1] معجم یاقوت عنوان "بغداد"۔

بشر بن الحارث کہتے ہیں کہ " بغداد تقویٰ شعار لوگوں پر تنگ ہے۔ کسی مومن کے لئے مناسب نہیں کہ وہاں قیام کرے"۔[۱]
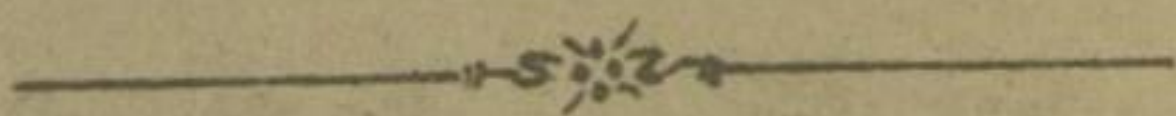
عراق میں اموال کی کثرت اور اقطار عالم سے لائے جانے اور خراجوں اور ٹیکسوں کی فراوانی، گرانی اور نرخوں کی بلندی کا ایک سبب تھا۔ چیزیں اس قدر گراں تھیں کہ مالدار لوگ اسے برداشت کر لیتے تھے مگر تنگدست لوگوں کے لئے ایک مصیبت بن گئی تھی۔ ابوالعتاہیہ نے اس کی شکایت اور وتیق مصوری کی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

مَنْ مُبْلِغٌ عَنِّي الْإِمَا — مَ نَصَائِحًا مُتَوَالِيَهْ

إِنِّي أَرَى الْأَسْعَارَ أَسْـ — عَارَ الرَّعِيَّةِ غَالِيَهْ

وَأَرَى الْمَكَاسِبَ نَزْرَةً — وَأَرَى الضَّرُورَةَ فَاشِيَهْ

وَأَرَى غُمُومَ الدَّهْرِ رَا — ئِحَةً تَمُرُّ وَغَادِيَهْ

وَأَرَى الْيَتَامَى وَالْأَرَا — مِلَ فِي الْبُيُوتِ الْخَالِيَهْ

مِنْ بَيْنِ رَاجٍ لَمْ يَزَلْ — يَسْمُو إِلَيْكَ وَرَاجِيَهْ

---

[۱] تاریخ بغداد صفحہ ۵ جلد ا خطیب بغدادی نے کچھ اور اسباب بھی علماء کی ناپسندیدگی کے بیان کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ بغداد کی زمین مغصوبہ ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو وہاں رہایش اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ اس کی مذمت میں بعض حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

يَشْكُوْنَ جَهْدَهٗ بِأَصْـ   وَاتٍ صِعَابٍ عَالِيَهْ
يَرْجُوْنَ رِفْدَكَ كَيْ يَرَوْا   فِيْمَا لَقُوْهُ الْعَافِيَهْ
مَنْ يُرْتَجَىٰ لِلنَّاسِ غَيْـ   رُكَ لِلْعُيُوْنِ الْبَاكِيَهْ
مِنْ مُصِيْبَاتٍ جُوَّعٍ   تُمْسِيْ وَتُصْبِحُ طَاوِيَهْ
مَنْ يُرْتَجَىٰ لِدِفَاعِ كَرْ   بٍ مُلِمَّةٍ هِيَ مَاهِيَهْ
مَنْ لِلْبُطُوْنِ الْجَائِعَا   تِ وَلِلْجُسُوْمِ الْعَارِيَهْ
يَا ابْنَ الْخَلَائِفِ لَا فَقَدْ   تَ وَلَا عَدِمْتَ الْعَافِيَهْ
إِنَّ الْأُصُوْلَ الطَّيِّبَا   تِ لَهَا فُرُوْعٌ زَاكِيَهْ
أَلْقَيْتُ أَخْبَارًا إِلَيْـ   كَ مِنَ الرَّعِيَّةِ شَافِيَهْ

کون ہے جو امام کو میری طرف سے نصیحتیں پہنچا دے؟ میں چیزوں کے نرخ رعیت کے لحاظ سے بہت گراں دیکھتا ہوں۔ ذرائع آمدنی بہت کم ہیں اور ضرورتیں عام ہیں۔ میں صبح و شام زمانہ کے غموں کو آتا جاتا دیکھ رہا ہوں۔ میں یتیموں اور بیوہ عورتوں کو خالی گھروں میں دیکھ رہا ہوں۔ کچھ تو آس لگائے بیٹھے ہیں اور جن کی نگاہیں متوقع ہو کر اٹھتی رہتی ہیں اور کچھ کمزور اور بلند آوازوں سے مصیبت کی شکایت کر رہے ہیں۔ انھیں آپ کی مدد کی توقع ہے تاکہ وہ جس مصیبت کو دیکھ رہے اس سے انھیں عافیت نصیب ہو سکے۔ رونے والی آنکھوں کے لئے آپ کے

ہو اور کسی سے آس لگائی جاسکتی ہے۔ مصیبت زدہ بھوک کی ماری ہوئی جن کی صبح شام بھوک میں خالی پیٹ گذرتی ہے۔ آئی ہوئی مدافعت کی کس سے امید کی جائے۔ مصیبت کتنی بڑی ہے؟ ان بھوکے پیٹوں اور ننگے جسموں کا کون ہے؟ اے خلیفوں کے بیٹے تو ہمیشہ ہمیشہ عافیت کے ساتھ رہے۔ یقیناً پاکیزہ جڑوں کی شاخیں بھی پاکیزہ ہی ہوا کرتی ہیں۔ میں نے رعیت کے حالات تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔[۱]
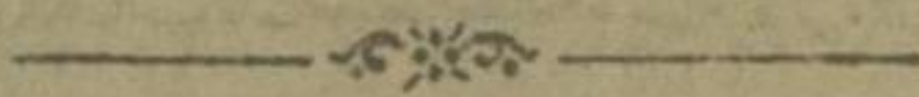
اس زمانہ میں مال و دولت کی یہ حالت تھی کہ پلک جھپکنے میں حاصل ہوتا اور پلک جھپکنے میں نکل جاتا تھا۔ خلفاء امراء گورنروں اور حکام کے عطایا کی ان دنوں کوئی حد نہیں تھی۔ ساتھ ہی اموال کی ضبطی کی بھی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ کسی کو ایک مغنی . . . کا کوئی گانا یا شاعر کا کوئی شعر یا ادیب کا کوئی شہ پارہ یا کسی کا کوئی جواب پسند آگیا اور اس نے خوش ہو کر ہزاروں کی بخشش کر دی۔ کبھی کوئی ایسی بات ناپسند ہو گئی اور اس کا خون بہا دیا اور تمام اموال ضبط کر لئے۔

عتابی نے اپنے زمانہ کی اسی حالت کو بیان کیا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم اپنے لٹریری ذوق اور قابلیت کے ذریعے سلطان کا تقرب کیوں حاصل

---

[۱] دیوان ابوالعتاہیہ صفحہ ۳۰۴

نہیں کرتے؟ عتابی نے کہا کہ اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ بے بات دسوں ہزار بخش دیتا ہے اور بے بات شہر پناہ کی دیوار سے نیچے پھنکوا دیتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے نتیجتہً میں کونسا آدمی بنوں گا[1]۔ مفضل ضبی کو مہدی کا آدمی بلانے آتا ہے تو وہ ڈر جاتا ہے اور اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ کسی نے اس کی چغلی کھا دی ہے۔ غسل کر کے نئے کپڑے پہن کر یعنی مرنے کے لئے تیار ہو کر جاتا ہے۔ جب سامنے پہنچتا ہے تو سلام کرتا ہے۔ مہدی سلام کا جواب دیتا ہے تو کہیں اس کے اوسان بجا ہوتے ہیں۔ مہدی اس سے پوچھتا ہے کہ فخر کے سلسلہ میں عربوں کا سب سے بہتر شعر کونسا ہے؟ اس کے بعد وہ اس سے کچھ اور سوالات کرتا ہے اور چونکہ مفضل ضبی کے جوابات بہت ٹھکانے کے تھے اس لئے مہدی نے خوش ہو کر اس سے اس کا حال دریافت کیا۔ مفضل نے اپنے قرض وغیرہ کی شکایت کی تو مہدی نے اسے تیس ہزار درہم عطا فرما دیئے[2]۔ جاحظ نے اپنی کتاب "الحیوان" میں نقل کیا ہے کہ ابو ایوب موریانی منصور کا وزیر اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا احکام اور فیصلے صادر کر رہا تھا کہ یکایک ابو جعفر منصور کا ایلچی آ گیا۔ ابو ایوب کا رنگ فق ہو گیا اور ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ اس پر اس کا اتنا خوف طاری ہوا کہ جس ہیئت سے بیٹھا تھا وہ ہیئت ہی نہ رہی۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ مگر منصور کے پاس سے واپس آیا تو چہرہ پھول کی طرح

---

[1] المستطرف صفحہ ۱۱۲ جلد ۱ [2] یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ اغانی صفحہ ۱۲۶ جلد ۱۴ اور مابعد موجود ہے۔

کھلا ہوا تھا۔ ہمیں اس کی حالت کو دیکھ کر بڑا ہی تعجب ہوا اور ہم نے اس سے کہا کہ آپ تو خلیفہ کے مخصوص ترین لوگوں میں سے ہیں۔ مقربین بارگاہ میں سے ہیں۔ آپ پر اس قدر خوف اور لرزہ کیوں طاری ہوا؟ ابو ایوب نے کہا کہ میں آپ کو عام لوگوں کی ایک ضرب المثل سناتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ باز نے ایک روز مُرغ سے کہا کہ روئے زمین پر تجھ سے زیادہ بیوفا بھی کوئی نہ ہوگا۔ مُرغ نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ باز نے جواب دیا کہ تیرا مالک ایک انڈا لیتا ہے۔ اس کے سیہنے کا انتظام کرتا ہے۔ پھر انڈے سے نکل کر تو اس کے ہاتھوں میں دانے چگتا ہے۔ حتیٰ کہ جب تو بڑا ہو جاتا ہے تو جہاں کوئی تیرے قریب آیا اور تو اِدھر اُدھر اڑا۔ اور پھر ہر وقت چیختا چلاتا رہتا ہے۔ مجھے یہ لوگ پہاڑ کی چوٹیوں سے پکڑ کر لاتے ہیں۔ مجھے سدھاتے اور اپنے سے مانوس کرتے ہیں۔ پھر وہ مجھے چھوڑ دیتے ہیں اور میں ہوا میں اُڑ کر اپنا شکار پکڑتا ہوں تو اسے لے کر سیدھا مالک کے پاس آتا ہوں۔ مُرغ نے اسے جواب دیا۔ کہ اگر تو نے بازوں کا بھی وہ منظر دیکھا ہوتا جو میں نے مرغوں کو سیخ پر لگا کر آگ پر سنکتے ہوئے دیکھا ہے تو بچا! تم مجھ سے زیادہ مالک سے بھاگتے۔ تو برادران! اگر آپ کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو مجھے معلوم ہیں تو اس ظاہری شان و شوکت کے ساتھ میرے اس خوف پر آپ کو بھی تعجب نہ ہوتا۔[1]

---

[1] الحیوان صفحہ ۱۳۲ جلد ۲

مامون رشید نے جب فضل بن سہل کو قتل کر دیا تو احمد بن ابی خالد کو وزارت کی پیش کش کی گئی۔ مگر انھوں نے معذرت کر دی اور فرمایا۔ میں نے کسی کو وزیر بنتے نہیں دیکھا جس کا حال سلامت رہا ہو۔[۱]

لوگ مامون رشید کو اطلاعات پہنچاتے تھے جو بعض اوقات قابل اعتماد بھی نہیں ہوتی تھیں۔ مگر یہ خبریں پہنچانے والے کہتے تھے کہ اگر ہم قابل اعتماد خبریں ہی آپ تک پہنچائیں تو سال بھر میں دو چار خبریں ہی آپ تک پہنچا سکیں۔[۲]

محمد بن حارث بن بُسْخُنَّر کو واثق خلیفہ نے کسی ایسے دن بلوایا جس میں وہ عام طور سے اُسے بلایا نہیں کرتا تھا۔ محمد بن حارث کو بڑی گھبراہٹ ہوئی اور اندیشہ ہوا کہ کسی نے ہو نہ ہو کوئی شکایت کر دی ہے۔ یا خلیفہ کی رائے میرے متعلق اچھی نہیں رہی کوئی نئی مصیبت آ گئی ہے۔ وہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ واثق نے انھیں دولتمند بنا دیا۔ اور ان کے لئے دس ہزار درہم اور کئی تخت لباس وغیرہ مرحمت فرما دیئے۔[۳]

فضیل بن عمران کی ابو جعفر منصور سے کوئی شکایت کی گئی۔ منصور نے فضیل بن عمران کو اپنے بیٹے جعفر کا میر منشی اور اس کے معاملات کا منتظم مقرر کر رکھا تھا۔ منصور سے شکایت کی گئی کہ فضیل جعفر کے ساتھ بیہودگی کرتا ہے۔ منصور نے فوراً دو آدمی بھیجے اور انھیں حکم دیا کہ انھیں فضیل جہاں کہیں ملے اس کی گردن اڑا دیں۔

---

[۱] طیفور صفحہ ۲۱۵ [۲] طیفور صفحہ ۶۸ [۳] اغانی صفحہ ۱۰۴ جلد ۳

ساتھ ہی جعفر کو بھی ایک خط لکھا جس میں اسے اپنے اس فیصلہ کی اطلاع دی گئی تھی مگر ان دونوں آدمیوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب تک فضیل کا کام تمام نہ کر دو اس وقت تک جعفر کو یہ خط نہ دینا۔ چنانچہ ان دونوں آدمیوں نے جا کر فضیل کی گردن اڑا دی۔ فضیل نہایت پاک دامن اور دیندار آدمی تھا۔ چنانچہ لوگوں نے منصور سے کہا کہ فضیل اس تہمت سے قطعاً بری ہے جو اس پر لگائی گئی ہے اور آپ نے بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ منصور نے فوراً دوسرا آدمی دوڑایا اور کہا کہ اگر تو فضیل کے قتل ہونے سے پہلے پہونچ گیا تو میں تجھے دس ہزار درہم انعام دوں گا۔ اسے فوراً جا کر قتل ہونے سے بچا لے۔ یہ آدمی پہنچا تو فضیل کا خون ابھی خشک نہیں ہوا تھا۔ جعفر کو اس بات کی بڑی ناگواری ہوئی اور اس نے اپنے غلام سوید سے کہا کہ "امیر المومنین ایک ایسے آدمی کے قتل کا کیا جواب دیں گے جو پاک دامن، دیندار، مسلمان، بے خطا اور پاک صاف تھا" سوید نے جواب میں کہا۔ "وہ امیر المومنین ہیں جو چاہیں کریں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اسے وہی بہتر سمجھ سکتے ہیں"

دولت مندی اور تنگدستی کے افراط سے اصلاح کی تحریک ابھری اور زہد کیطرف میلان بڑھا
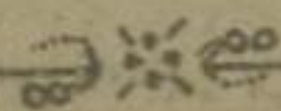
اس زندگی نے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ کچھ لوگ نہایت مرفہ الحال تھے

اور کچھ نہایت تنگدست ۔ کچھ لوگ لہو و لعب میں گرفتار تھے اور کچھ لوگ حقیقت پسندانہ مسلک حیات کے پابند، اس زمانہ کی تاریخ میں دو نمایاں تحریکات پیدا کیں۔

(اوّل) ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا جو بغداد کے فساق و فجار پر نکیر کرنے کو ثواب کا کام سمجھتا تھا۔ طبری نے ان کے ظہور کا سبب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ حربیہ اور شطار[1] کے غنڈوں نے جو بغداد اور کرخ دونوں جگہ موجود تھے لوگوں کو بُری طرح ستا رکھا تھا۔ علانیہ فسق و فجور کرتے۔ ڈاکے ڈالتے۔ لڑکوں اور عورتوں کو سڑکوں پر سے اٹھا کر لے جاتے۔ نہ کوئی انھیں منع کر سکتا تھا اور نہ ہی سزا دے سکتا تھا۔ کیونکہ خود بادشاہ کو ان کی حمایت کی ضرورت تھی اور وہی اس کے مقربین بارگاہ تھے۔ لہذا کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ جس فسق و فجور کے وہ مرتکب ہوتے تھے اس پر کوئی ان سے باز پرس کر سکے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے زمین میں فساد پھیلا رکھا ہے۔ ظلم اور تعدی حد سے بڑھتی جا رہی ہے اور رہزنی عام ہو گئی ہے اور بادشاہ بھی ان کو کوئی تنبیہ نہیں کرتا تو ہر محلہ اور ہر علاقہ کے نیک لوگ اُٹھے اور آپس میں ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے لئے چلے الخ

اس تحریک کے دو لیڈر تھے۔ اور ہر لیڈر کا ایک منشور تھا۔ ایک تو خالد

---

[1] بغداد کے دو محلے ہیں حربیہ بغداد کی مغربی جانب کے ایک محلہ کا نام تھا جو حرب بن عبداللہ منصور کی پولیس کے افسر اعلیٰ کے نام کی طرف منسوب تھا۔

درویش تھے ان کا منشور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا تھا۔ لیکن سلطان کے خلاف شورش پھیلانا نہیں تھا۔ حکومت وقت کی اطاعت کی حدود میں رہتے ہوئے اصلاح کی کوشش کرنا ان کا مطمح نظر تھا۔ دوسرے لیڈر سہل بن سلامہ انصاری تھے۔ ان کا منشور بھی اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرانا اور جو اس کی مخالفت کرے اس سے جنگ کرنا تھا مخالفت کرنے والا کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ سلطان ہو یا کوئی اور ہو۔ طبری کا بیان ہے کہ ایک بڑی مخلوق ان کے پیچھے لگ گئی۔ جو شخص سہل کی اس تحریک کو قبول کر لیتا وہ اپنے مکان پر ایک پختہ برج بناتا اور اس پر قرآن کریم کے نسخے اور ہتھیار آویزاں کر دیتا ــــ یہ ۲۰۱ھ اور ۲۰۲ھ کا واقعہ ہے۔ یہ تحریک اپنے دونوں لیڈروں کی گرفتاری اور قید کے بعد ختم ہو گئی[۱]۔

ظاہر ہی ہے کہ اس تحریک کا سبب، ابن خلدون کے بیان کے مطابق اہل دین اور صالح لوگوں کا فساق و فجار کو روکنے اور ان کے ظلم و تعدی کو ختم کرنے پر جمع ہو جانا تھا۔ یہ تحریک برابر جاری رہی کبھی بڑھ جاتی کبھی سرد پڑ جاتی ان کے بعد فرقہ حنابلہ کا ظہور ہوا جن کی دعوت بھی اسی طرح امر بالمعروف اور نہی

---

[۱] اس تحریک کی تفصیلات طبری صفحہ ۲۴۱ - ۸۰ م ۲ جلد ۱۰ اور مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۳۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔

عن المنکر کرنا ہی تھا۔ ان کی تفصیلات بیان کی جائیں تو مضمون بہت طویل ہو جائیگا

(دوم) دوسری تحریک، زہد کی تحریک تھی ــــ بات یہ ہوئی کہ کچھ لوگ

زہد اور اس کے اسباب

جب مالداری اور تونگری حاصل کرنے سے مایوس ہو گئے اور انھوں نے دیکھا کہ طبعی طور پر وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتے کہ صاحب اقتدار طبقہ کا قرب حاصل کر سکیں، یا انھوں نے اس کی کوشش کی مگر اس میں ناکام رہے تو قناعت کے دامن میں ان لوگوں نے پناہ ڈھونڈی اور اپنی طبیعتوں کو اس کا عادی بنانا چاہا اور کہنا شروع کیا کہ جو کچھ تم چاہتے ہو جب وہ نہ ہو سکا تو جو کچھ ہوتا ہے تم اسی کو چاہنے لگو۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں بے انتہا خواہشات و شہوات کو دیکھنے سے گھن سی آنے لگی۔ انھوں نے دیکھا کہ نفس انسانی کی جب کوئی خواہش اور تمنا پوری ہو جاتی ہے تو اس کے سامنے دوسری بے شمار خواہشات و شہوات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہر خواہش کو پورا کرنے میں نہ جانے کتنی کتنی مشقتیں اور مصیبتیں پیش آتی تھیں لہذا انھوں نے اس کو بہتر سمجھا کہ ان خواہشات کا قلع قمع کر دیں اور انھوں نے بھی وہی کچھ کہنا شروع کر دیا جو کسی نے کہا تھا ؎

وَ مَا النَّفْسُ اِلَّا حَیْثُ یَجْعَلُهَا الْفَتیٰ

فَاِنْ اُهْمِلَتْ تَاقَتْ وَ اِلَّا اسْتَقَرَّتِ

نفس انسانی اس کے سوا کیا ہے کہ آدمی جہاں جی چاہے اسے رکھ دے۔

اگر اسے کھلا چھوڑ دے تو خواہشات میں گرفتار ہو جاتا ہے ورنہ ایک مقام پر جاگزیں ہو جاتا ہے۔

یا جو کسی دوسرے شاعر نے کہا تھا۔

وَ النَّفْسُ رَاغِبَۃٌ اِذَا رَغَّبْتَھَا
وَ اِذَا تُرَدُّ اِلٰی قَلِیْلٍ تَقْنَعُ،

نفس کو اگر رغبت دلاؤ تو وہ رغبت کرنے لگتا ہے لیکن جب اسے تھوڑے کی طرف لوٹا دو تو وہ قناعت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

کچھ لوگ محبت میں نامراد و مایوس ہو کر یا جاہ و منصب اور مال و دولت کے سلسلہ میں کسی جانکاہ حادثہ کا شکار ہو کر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتے تھے کہ زہد کے دامن میں پناہ لیں اور اس سے اپنے آپ کو مانوس کر کے جس چیز سے وہ محروم ہو گئے تھے اس سے زہد کے ذریعہ سے تسلی حاصل کریں۔

بہت سے لوگ دین داری کی وجہ سے بھی زاہد بن گئے تھے کیونکہ زہد میں کرنا کچھ نہیں پڑتا اور حساب آسان ہے۔ وہ محمد بن واسع کی طرح کہنے لگتے ہیں کہ "مجھے تو یہ پسند ہے کہ آدمی صبح کرے تو صبح کا کھانا اس کے پاس نہ ہو اور شام کرے تو شام کا کھانا اس کے پاس نہ ہو اور اس کے باوجود وہ اپنے خدا سے راضی ہو۔" انھوں نے اپنے نفسوں کو خواہشات و شہوات سے موڑ لیا۔ موت اور قبروں کو زیادہ تر یاد رکھتے اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرتے۔ انھوں نے

فانی پر باقی کو ترجیح دی اور کسی خلیفہ یا والی سے عطیات لینے کے لئے ہاتھ پھیلانے چھوڑ دیئے۔ اور تھوڑے پر راضی ہو گئے۔ ان کا عمل ویسا ہی رہا جیسا کہ ابراہیم ابن اسحٰق حربی کا تھا کہ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس طرح گذارا کہ روٹی کے سوکھے ٹکڑوں اور نمک پر بسر کی اور بعض مرتبہ نمک بھی نہیں ہوتا تھا مگر انھوں نے معتضد سے وہ ایک ہزار دینار قبول نہیں کئے جو اس نے ان کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ایک مرتبہ سارے رمضان کے مہینہ میں ان کا خرچہ ایک درہم اور ساڑھے چار دانق رہا تھا۔[۱]

یہ ساری انواع و اصناف اس عہد میں موجود تھیں جس کی تاریخ ہم بیان کر رہے ہیں جس طرح بشار بن برد، ابو نواس اور ان جیسے لوگ لہو و لعب کے رجحان کی نمائندگی کرنے اور اس کی آگ کو بھڑکاتے تھے اسی طرح ابو العتاہیہ وغیرہ زہد کے رجحان کی نمائندگی کرتے اور زاہدوں کی آرزوئیں بیان کرتے تھے۔ ابو نواس نے لہو و لعب کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا ؎

جَرَیْتُ مَعَ الْھَوٰی طَلَقَ الْجُمُوْحِ

وَھَانَ عَلَیَّ مَاْثُوْرُ الْقَبِیْحِ

وَجَدْتُ اَلَذَّ عَارِیَۃِ اللَّیَالِیْ

---

[۱] یاقوت کی معجم الادباء جلد اول میں ان کے حالات دیکھئے۔

فَتِرَانَ النَّغَمِ بِالْوَتَرِ الْفَصِيحِ
وَ مُسْمِعَةٍ مَتٰی مَا شِئْتَ غَنَّتْ
مَتٰی کَانَ الْخِیَامُ بِذِی طُلُوحٍ
تَمَتَّعْ مِنْ شَبَابٍ لَیْسَ یَبْقٰی
وَ صِلْ بِعُرَی الْغَبُوْقِ عُرَی الصَّبُوحِ

میں عشق کے ساتھ مُنہ زور کھلے گھوڑے کی طرح بھاگ لیا اور سلمہ بُری باتیں میرے لئے آسان ہو گئیں، راتوں کی عاریت پر دی ہوئی لذیذ ترین چیز مجھے تو عمدہ ستار پر نغمات کی ہم آہنگی معلوم ہوتی ہے۔ بعض گانا سنانے والیاں ایسی ہیں کہ جب خیمے ذی طلوح کے مقام پر ایستادہ ہوں تو وہ وہی کچھ گاتی ہیں جو تو چاہے۔ جوانی سے فائدہ حاصل کر کیونکہ یہ رہنے والی چیز نہیں ہے اور شام کے پیمانوں کو صبح کے پیمانوں کے ساتھ ملا دے۔

تو اس کے مقابلہ میں ابوالعتاہیہ نے کہا۔

رَغِیْفُ خُبْزٍ یَابِسٍ
تَأْکُلُهٗ فِیْ زَاوِیَهْ
وَ کُوْزُ مَاءٍ بَارِدٍ
تَشْرَبُهٗ مِنْ صَافِیَهْ

وَ غُرْفَۃٌ مُنَزِّهَۃٌ
نَفْسُکَ فِیْهَا خَالِیَہْ
اَوْ مَسْجِدٌ بِمَعْزَلٍ
عَنِ الْوَرٰی فِیْ نَاحِیَہْ
تَدْرُسُ فِیْہِ دَفْتَرًا
مُسْتَنِدًا بِسَارِیَہْ
مُعْتَبِرًا بِمَنْ مَضٰی
مِنَ الْقُرُوْنِ الْخَالِیَہْ
خَیْرٌ مِنَ السَّاعَاتِ فِیْ
فَیْیِٔ الْقُصُوْرِ الْعَالِیَہْ
تَعْقُبُهَا عُقُوْبَۃٌ
تُصْلٰی بِنَارٍ حَامِیَہْ
فَهٰذِہٖ وَصِیَّتِیْ
مُخْبِرَۃٌ بِحَالِیَہْ
طُوْبٰی لِمَنْ یَسْمَعُهَا
تِلْکَ لَعَمْرِیْ کَافِیَہْ
فَاسْمَعْ لِنُصْحِ مُشْفِقٍ یُدْعٰی اَبَا الْعَتَاهِیَہْ

روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا جسے تو ایک کونے میں بیٹھ کر کھالے۔ صاف اور
ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ جسے تو پی لے۔ ایک تنگ کمرہ جس میں تو تنہا
رہے۔ یا دنیا والوں سے الگ ایک کونہ میں کوئی مسجد جس کے ستون سے
ٹیک لگا کر تو کوئی کتاب پڑھ رہا ہو۔ تاکہ قرون ماضیہ کے گذرے ہوئے
لوگوں سے عبرت حاصل کرے۔ چند گھنٹے اونچے اونچے محلات کے
سایہ میں گذارنے سے بہتر ہے۔ وہ ایسا نتیجہ چھوڑ جاتے ہیں کہ تجھے دہکتی
ہوئی آگ میں بھننا پڑے گا۔ یہ ہے میری وصیت جس میں میں نے
اپنا حال تجھے بتا دیا ہے۔ خوش خبری ہے اس کے لئے جو اس وصیت کو
سُن لے۔ میری جان کی قسم یہ وصیت اس کے لئے کافی ہے۔ ایک
شفق آدمی کی نصیحت کو سُن۔ وہ شفق جسے لوگ ابوالعتاہیہ کے نام
سے پکارتے ہیں۔

لوگ جھگڑتے تھے کہ ان دونوں میں سے بڑا شاعر کون ہے۔ ابونواس
یا ابوالعتاہیہ؟ لیکن وہ درحقیقت فنی نقطۂ نگاہ سے غور کر کے کسی ایک کو دوسرے
پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔ دونوں شاعر ایک خاص رجحان کی نمائندگی کرتے تھے
اور ہر فریق اسے ترجیح دیتا تھا جو اس کے دل کی بات کہتا اور اس کے رجحان
کی نمائندگی کرتا تھا۔

علم، ادب اور فن پر ان حالات کے اثرات

اس اجتماعی حالت کے جس کا ہم نے ابھی بیان کیا ہے، اپنے علمی، فنی اور ادبی نتائج تھے۔ ایک نتیجہ یہ تھا کہ چونکہ اموال کا بڑا حصہ خلفاء امراء اور ان کے متعلقین کے ہاتھ میں تھا اور وہ بیش قرار عطایا دیتے رہتے تھے۔ ساتھ ہی دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں دولت کی بہت تھوڑی ہی مقدار تھی۔ ان باتوں نے مل کر تمام فنون جمیلہ کو ــــ شعر بھی ان ہی میں سے ایک ہے ــــ اس حالت تک پہنچا دیا تھا کہ وہ خلفاء و امراء کے زیر سایہ ہی پروان چڑھتے تھے۔ ان کی فضا سے الگ وہ مرجھا جاتے تھے ان حالات میں یہ امر قطعًا معقول ہوتا کہ اس سے آدمی کے شعور کو انگیخت ملتی۔ اس کے رجحانات میں ہیجان بپا ہوتا۔ اس کے دل میں جوش پیدا ہوتا۔ وہ شعر کہتا اور اپنے شعور کو تسکین دیتا اپنے جوش کو ہلکا کرتا۔ شعر گوئی سے اس کا مقصد اپنے فنی رجحان کی سیرابی سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتا اور اسی کو وہ اپنا سب سے بڑا اجر اور معاوضہ سمجھتا۔ یہ بات بھی قطعًا معقول ہوتی کہ ایک فنکار فقر و فاقہ میں بھی اور تونگری اور دولت مندی میں بھی۔ فراخی میں بھی اور تنگی میں بھی محض اپنی فنی بھوک کی سیری کے لئے عمدہ سے عمدہ فنی مظاہرہ کرتا۔ لیکن بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ یہ فنی بلندی ان میں بہت کم تھی۔ ان میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جو یہ دیکھتے تھے کہ فن کی ذرا سی چیز اور شعر کے چند ابیات جب ان میں

ممدوح کے ذوق کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔۔۔ فن کے ذوق کا نہیں ۔۔۔ بے شمار دولت کی بارش کا سبب بن جاتے تھے جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اگر وہ خود اپنے رجحان یا فن کی پیروی کرتے تھے تو فقر و فاقہ میں مبتلا رہتے تھے۔ لہٰذا سب کے سب خلفاء و امراء کی خواہشات کی پیروی میں دوڑ پڑے اور سوائے چند قلیل اور نادر فن کاروں کے سب کے سب محلات شاہی کی طرف جانے والے سیلاب میں بہہ گئے۔ ان کے دروازوں پر دنوں اور مہینوں کھڑے رہتے تب کہیں اذن باریابی ملتا۔ شعراء اور فن کار بھی سامانِ زینت میں سے شمار ہونے لگے تھے۔ خوشنما فقروں اور جملوں سے مکانات اور محلات کی آرائش کی جاتی تھی وہ اس میں ایک حد تک معذور بھی تھے۔ ان میں سے کتنے تھے جو آئے دن دیکھتے تھے کہ جو لوگ شعر اور فن میں ان سے بہت ہی فروتر تھے۔ وہ امیر کی مدح میں دو تین شعر کہہ کر ہزار ہا درہم لیجاتے تھے۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی اپنے مسلک کی پابندی چھوڑ کر وہی راستہ اختیار کرنے لگتے تھے جس پر چل کر انھیں بھی مال و دولت مل سکے۔ بعینہ یہی حال گانے کا بھی تھا۔ اصفہانی کا بیان ہے کہ جتنا کچھ ابراہیم موصلی نے ہارون رشید سے لیا ہے اس کا مجموعہ دو لاکھ دینار سے بہت زیادہ تھا[1]۔ اغانی کا آپ کوئی صفحہ نہیں اُلٹیں گے جس میں آپ کو کسی شاعر کا حال نہ مل جائے

---

[1] اغانی صفحہ ۲۰ جلد ۵

کہ اس نے کسی کی مدح میں شعر کہے اور ہزاروں روپئے اسے مل گئے۔ ان قصوں میں
کتنا ہی مبالغہ سے کام کیوں نہ لیا گیا ہو مگر بہر حال بنیاد تو صحیح ہی ہے۔

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شعر و شاعری کا سب سے بڑا میدان محض مدح و ستائش
قرار پا گیا ـــــ اور ہماری نظر میں ـــــ یہ باب صحیح قسم کے اشعار سے دور کا تعلق بھی
نہیں رکھتا۔ شعراء نے یکے بعد دیگرے مدح و ستائش کے مناسب اور نامناسب
ہر قسم کے مضامین ڈھالنے شروع کر دیئے حتیٰ کہ اس کا آخری قطرہ تک چوس لیا
مگر دوسرے ابواب۔ یعنی مثلاً بلند رجحانات کا بیان، طبیعی، خوبصورتی اور فطرت
کی جمال آفرینیوں سے متعلق نفس انسانی کے شعور کی تحلیل وغیرہ تو اول تو کسی نے
انھیں چھیڑا ہی نہیں اور اگر چھیڑا بھی تو بہت ہی سرسری انداز سے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ادب اور فن کا مورخ جب اس عہد کی تاریخ لکھنے
بیٹھتا ہے تو وہ صرف عراق ہی کی تاریخ لکھتا ہے۔ مصر، شام، حجاز کا ادب چونکہ ہلکا تھا
اور وہاں کا فن ناقابلِ ذکر تھا لہذا اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ ایک عمدہ شاعر
اور فنکار کو اپنے سامان کا خریدار عراق کے سوا کہیں ملتا ہی نہیں تھا اس لئے سب
ادھر ہی کھنچ کر چلے آتے تھے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس زمانہ کا ادب بہترین طور پر ان دونوں نمایاں رجحانات
کی مصوری کر دیتا ہے۔ لہو و لعب کے رجحان کی اور زہد و ورع کے رجحان کی۔
جہاں تک لہو و لعب کے رجحان کا تعلق ہے تو اس میں وہ چیزیں داخل ہیں جو شراب

نسیب اور غزل وغیرہ کے سلسلہ میں کہی گئیں۔ یہ چیزیں آپ کو ابو نواس، مسلم بن الولید جیسے شعرا کے دواوین میں اور کتاب الاغانی میں مل سکتی ہیں۔ رہ گیا زہد و ورع کا رجحان تو اس میں وہ چیزیں داخل ہیں جو موت، لعنت۔ حساب وکتاب، کے سلسلہ میں یا زاہدوں کی زندگی اور ان کے منقول اقوال وافعال کے بیان میں کہی گئی ہیں۔ لمبی لمبی فصلیں ان کی نفسیات کی تشریح اور ان کی حکمت آموز باتوں کے بیان میں لکھی گئی ہیں۔ آپ جاحظ کی کتاب "البیان والتبیین" کی تیسری جلد دیکھئے۔ اس میں وہ ایک باب "کتاب الزہد" کے نام سے لکھتے ہیں جس کی ابتدا وہ اس طرح کرتے ہیں۔ "ہم اللہ کے نام اور اس کی مدد سے زاہد و مرتاض لوگوں کی باتیں بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان کے اخلاق ومواعظ کو بھی بیان کرتے ہیں۔" یہ اقوال اور قصے لوگوں کے اس فریق کے لئے غذا کا سامان مہیا کرتے ہیں جو زندگی میں زاہدانہ طرز پر عمل رہے تھے۔ اس کے بعد ادب اور لٹریچر سے متعلق مصنفین بالکل جاحظ ہی کے انداز پر چل نکلے ہیں اور زہد کے باب کو ارکان ادب میں سے ایک رکن کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن قتیبہ بھی اپنی کتاب "عیون الاخبار" میں زہد کے لئے ایک خاص باب لکھتے ہیں۔ اور ابن عبد ربہ بھی اپنی کتاب "العقد الفرید" میں اسی انداز کے ساتھ ایک خاص باب زہد سے متعلق لکھتے ہیں۔ یہی حال دوسری تصانیف کا بھی ہے۔ آپ ان فصلوں کو پڑھئے آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک ایسی زندگی کی مصوری کرتی ہیں جو لہو ولعب کی زندگی کے قطعاً برعکس ہے۔

رہ گیا علم۔ تو وہاں علم کے دو شعبے ہوتے تھے۔ ایک علم دینی اور دوسرے علم دنیوی ــــ بشرطیکہ یہ تعبیر صحیح ہو ــــ جہاں تک دنیوی علوم کا تعلق تھا ان میں فلسفہ، طب، ریاضت اور فلکیات سے متعلق علوم شامل تھے۔ یہ علوم بھی خلفار امرا اور مالدار طبقہ کی گود ہی میں پروان چڑھے۔ اس عہد میں بہت کم آپ کو کوئی ملے گا۔ جو ان علوم میں سے کسی علم سے تعلق رکھتا ہو اور کوئی نہ کوئی امیر یا دولت مند آدمی اسے مالی مدد نہ بہم پہنچاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ــــ نسبتہً ــــ ذرا فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

رہ گیا دینی علم، تو اس کا باعث زیادہ تر اخروی اجر اور عقید تمندی ہوتا تھا۔ یہ علم محلات شاہی سے باہر پروان چڑھا اور پھلا پھولا۔ مثلاً علم تفسیر۔ علم حدیث وغیرہ۔ یہی وجہ تھی کہ اس قسم کے علوم کی نشو ونما صرف عراق تک ہی محدود نہ تھی بلکہ یہ علوم ہر علاقہ اور ہر ملک میں نظر آتے تھے جہاں کہیں بھی یہ دینی باعث موجود تھا وہاں یہ علوم بھی موجود تھے۔ چنانچہ جب آپ علوم قرآن، علوم حدیث یا علوم لغت کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو آپ کو مصر، شام اور حجاز کی تاریخ لکھنی پڑے گی جیسا کہ آپ عراق کی تاریخ لکھیں گے۔ ان علمار کے حالات اور تراجم آپ پڑھئے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے زیادہ تر حضرات اکثر حالات میں فقر وفاقہ اور تنگدستی کا شکار رہے۔ ان میں تھوڑے پر قناعت اور بے لوثی کی صفات آپ کو زیادہ تر ملیں گی اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

جب ہم علمی تحریکات پر بحث کریں گے تو ان علماء کا کچھ حال ہم آپ کو بتائیں گے کہ انھوں نے طلب علم میں کتنی مشقتیں اور کتنی مصیبتیں اٹھائیں۔ سخت تنگدستی اور فقر وفاقہ کے باوجود کتنے طویل طویل سفر کئے جنھیں پڑھ کر حیرت واستعجاب کی کوئی حد نہیں رہتی۔ علمی زندگی کے لئے ان حضرات کی زندگی بلند ترین نمونہ شمار کیجاتی ہے۔
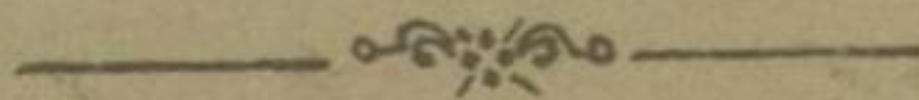
فصل ششم

(زندقہ کی زندگی اور ایمان کی زندگی)

زندقہ اور ایمان میں جنگ

جیسا کہ ہم نے گذشتہ فصل میں، لہو و لعب عشق و ہوس اور تنعم و تعیش کی زندگی کے پہلو بہ پہلو زہد قناعت، حقیقت شناسی، تنگدستی اور شقاوت کی زندگی کے نمونے دیکھے ہیں۔ اب اِس فصل میں ہم زندگی کے کچھ دوسرے رنگ دیکھیں گے، یہ زندگی دل اور عقل، رجحانات اور دین کی زندگی کا رنگ ہے۔ یہاں ہم شک وارتیاب، زندقہ اور الحاد کی کشمکش ایمان خالص اور اعتقاد صادق کے ساتھ دیکھیں گے ان دونوں تحریکوں کی جب ہم تاریخ پڑھتے ہیں تو ایسا خیال ہوتا ہے کہ ہم ایک میدان جنگ میں کھڑے ہیں جہاں جنگ کا بازار گرم ہے جس میں ہر طرح کے وسائل حرب سے کام لیا جا رہا ہے۔ کبھی دھوکے اور مکاریوں اور دوسرے پیچیدہ اور مخفی وسائل سے کام لیا جاتا ہے۔ کبھی

تلواریں سونت لی جاتی ہیں اور خون بہائے جانے لگتے ہیں۔ کبھی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں اور ان میں دلائل سے ہر فریق اپنے مقابل کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ پھر جنگ کا پانسہ کبھی اس فریق کے حق میں پلٹتا ہے کبھی دوسرے فریق کے حق میں۔ آج ملحدین فتحمند ہو رہے ہیں۔ وہ شکوک و شبہات پیدا کر کے، بچوں اور نوجوانوں کو گمراہ کر کے اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ اگر ظاہرا طور پر وہ کامیاب نہیں ہوتے تو دوسرے گمراہی کے پیچیدہ اور مخفی طریقوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً تشیع کا لبادہ پہن کر، اسلام کے لیے غیرت کے جذبات وغیرہ ابھار کر۔ تو دوسرے دن مؤمنین کو فتح نصیب ہوتی ہے اور وہ ان ملحدین کو سخت سزائیں دیتے، ان کے خلاف کارروائیاں کرتے، انھیں قتل کرتے اور انھیں پراگندہ کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کتابیں تصنیف کر کر کے ان کے شبہات کو دور کرتے اور ان کے دلائل کا ابطال کرتے ہیں۔

لیکن مؤرخین نے جیسا کہ سیاسی جنگوں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں

عہد عباسی میں زندقہ کے پھیلنے کا سبب

ان جنگوں کے حالات اور واقعات بیان کرنے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ تلاش و تحقیق کرنے والا کتابوں میں کہیں کہیں ان کے کچھ تھوڑے سے بکھرے ہوئے حالات پالیتا ہے ـــــ وہ اگر چاہے تو بڑی مشکل سے ـــــ ان بکھرے ہوئے حالات سے ایک مکمل بات یا ایک مسلسل زنجیر بنا سکتا ہے۔

زندقہ اس زمانہ میں جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی زبانوں پر زندقہ کا لفظ بار بار آتا ہے۔ اور لوگوں کو جھوٹ یا سچ بکثرت زندقہ کے ساتھ متہم کیا جاتا ہے۔ رائے عامہ اس کے معنیٰ کو بڑی بار یکی کے ساتھ سمجھتی تھی۔ چنانچہ وہ شاعر کا کوئی شعر سنتے اور جونہی ان کی توجہ کسی بات کی طرف جاتی وہ فوراً شاعر کو زندقہ کے ساتھ متہم کر دیتے۔ کسی کو کچھ کرتے دیکھا یا کوئی بات کہتے سنا۔ خواہ وہ مذاق میں کہی گئی ہو یا حقیقت میں کہی گئی ہو یا کسی کو کوئی اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور فوراً اس پر زندقہ کی تہمت لگا دی۔[1]

بنو امیہ کے عہد مملکت اور بنو عباس کے دور حکومت میں جب ہم اس لفظ کی شہرت کا موازنہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اموی عہد حکومت میں یہ لفظ بہت کم اور نادر ہی بولا جاتا تھا جبکہ عباسی دور حکومت میں اس کا استعمال بہت عام ہو کر پھیل چکا تھا۔ مثلاً بنو امیہ کے دور مملکت میں ولید بن یزید بن عبدالملک کے استاد عبدالصمد بن عبدالاعلیٰ پر زندقہ کی تہمت لگائی گئی تھی۔ اسی طرح ولید بن یزید پر بھی یہی تہمت تھی۔ مگر پھر بھی یہ چیز بہت کم اور نادر تھی۔ لیکن عباسی عہد حکومت میں زندقہ سے متعلق واقعات بے شمار ملتے ہیں اور بے شمار لوگوں پر اس کی تہمت لگائی جاتی تھی۔

---

[1] فجرالاسلام میں ہم نے لفظ زندقہ کے اشتقاق کے متعلق مختلف اقوال نقل کر دیئے ہیں۔ وہاں اس کو دیکھ لیں۔

اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ زندقہ اپنے بعض مفاہیم کے لحاظ سے ـــ یعنی شک یا الحاد ـــ عادۃً علمی بحث و تحقیق کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اور بحث و تحقیق عباسی دور حکومت میں زیادہ نمایاں اور واضح صورت میں نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو علم اموی عہد مملکت میں عام طور سے پھیلا ہوا تھا وہ خالص دینی علم تھا۔ مثلاً حدیثیں جمع کرنا۔ قرآن کریم کی تفسیر کرنا۔ ان دونوں سے مسائل شرعیہ کا استنباط کرنا وغیر ذلک۔ یہ چیزیں انسانی نفوس میں شک و شبہ کا بیج نہیں بوتیں کہ آدمی زندقہ میں گرفتار ہو جائے۔ جو چیز ان شکوک و شبہات کو ابھارتی ہے وہ زیادہ تر اس قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔ یعنی کلامی مذاہب، مختلف مذاہب و ادیان کے بنیادی مسائل کے گرد دینی ابحاث، اس طرح کی فلسفیانہ بحث جو مثلاً مادہ اور صورت جزء لایتجزیٰ، جوہر اور عرض وغیرہ کے سلسلہ میں ارسطو اور افلاطون وغیرہ نے کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتیں اموی دور حکومت میں بہت کم تھیں۔ اور عباسی عہد حکومت میں ان کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔

دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ بعض ایرانی یہ سمجھتے تھے کہ بنو امیہ کے ہاتھ سے نکل کر خلافت بنو عباس کے ہاتھ میں آجانے سے ان کا مطلب پورا نہیں ہوا۔ وہ ایک عربی ہاتھ ـــ یعنی بنو امیہ کے ہاتھ ـــ سے نکل کر مسلمانوں کے ایک دوسرے ہاتھ یعنی عباسیوں کے ہاتھ میں پہنچ گئے ہیں۔ حالانکہ در اصل ان کا مطمح نظر تو یہ تھا کہ حکومت ایرانی ہو۔ اپنے ظاہر کے اعتبار سے بھی اور حقیقت کے اعتبار سے

بھی۔ اپنے غلبہ و تسلط، زبان، دین غرضکہ ہر اعتبار سے ایرانی ہو۔ انھوں نے دیکھا کہ جب تک اسلام کا تسلط اور غلبہ باقی ہے ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جہاں جہاں ممکن ہوا انھوں نے کھلم کھلا مانویت، مزدکیت اور زردشتیت کو پھیلانے کی کوششیں شروع کیں اور جہاں ممکن نہ ہوا انھوں نے خفیہ طریقے اختیار کئے اس سے زندقہ پھیلا۔

اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجیے کہ دولتِ امویہ ـــــ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ـــــ دولتِ عربیہ تھی۔ حکومت انہی کے ہاتھ میں تھی اور ملک بھی انہی کا تھا۔ حکام اور امرا عرب ہوتے تھے آزاد شدہ غلام ذلت و خواری کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ عرب کے لوگ زیادہ تر زندقہ سے ناواقف تھے اور نہ اس کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ وہ اپنی حکومت اور اپنے دین پر مطمئن تھے۔ دولت عباسیہ کے قیام کے بعد آزاد شدہ غلاموں نے اطمینان کا سانس لیا۔ خصوصیت کے ساتھ ایرانی غلاموں نے۔ زیادہ تر اقتدار انہی کے ہاتھوں میں آگیا تھا۔ انھوں نے عربوں پر غلبہ پا لیا تھا۔ جب یہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو اس سے پہلے وہ اپنے پرانے مذہب کی پیروی کیا کرتے تھے جنھیں وہ بھول نہیں سکے تھے۔ اُموی دورِ حکومت میں انھیں اس کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کوئی اپنی مذہبی بات پھیلا سکیں۔ ان کا پہلا مقصد سیاسی آزادی حاصل کرنا تھا نہ کہ دینی آزادی۔ چنانچہ ان کی خفیہ دینی تحریکات، اجتماعات اور تدبیرات عموماً سیاسی ہوتی تھیں نہ کہ دینی۔ زندقہ کا تعلق دین سے ہے سیاست سے نہیں ہے۔ لیکن جب وہ سیاسی طور پر کامیاب ہو گئے اور انھیں اطمینان اور غلبہ

حاصل ہو گیا تو ان کے سروں میں نئے اور پرانے ادیان نے آنکھ مچولی کھیلنی شروع کر دی تھی۔ یہیں سے زندقہ پیدا ہوا۔

خلفائے عباسیہ کے عہد میں زندقہ کی تاریخ

ہم دیکھتے ہیں کہ زنادقہ کا نام ابو جعفر منصور کے زمانہ میں رند مشرب اور عیاش طبع لوگوں کے ساتھ وابستہ ملتا ہے۔ چنانچہ طبری کا بیان ہے کہ منصور نے محمد بن ابی العباس کے ساتھ کچھ زندیقوں اور رند مشرب لوگوں کو بھیجا تھا۔ ان لوگوں میں حماد عجرد بھی شامل تھا۔ چنانچہ یہ لوگ محمد بن ابی العباس کے ساتھ بصرہ میں کچھ دن تک رہے جہاں ان سے رندی و عیاشی کا مظاہرہ ہوتا تھا منصور کا مقصد ایسا کرنے سے یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں محمد بن ابی العباس سے نفرت پیدا ہو جائے[1] اور محمد بن ابی العباس کو ناپسند کرنے لگیں گے اور اس کے لئے اپنے بعد مہدی کو خلافت کے لئے نامزد کرنا آسان ہو جائے گا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مہدی نے اپنی تمام تر توجہات زنادقہ کی طرف مبذول رکھیں تاکہ جہاں محمد بن ابی العباس کا ان زنادقہ سے قرب اسے خلافت سے دور کر دے وہیں مہدی ان کے خلاف اپنی دارو گیر کے ذریعہ سے خدا اور لوگوں کا قرب حاصل کر سکے۔

بہر حال منصور کے متعلق یہ پتہ نہیں لگتا کہ اس نے اپنے عہد میں ان زندیقوں

---

[1] طبری صفحہ ۳۰۰ جلد ۹

کی دار و گیر میں کچھ مبالغہ سے کام لیا ہو۔ اس کی سیاست ــ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے ــ صرف ظاہری فتنوں کے قلع و قمع تک محدود تھی۔ لیکن جب مہدی برسر اقتدار آیا تو اس کی تاریخ کے نمایاں ترین مسائل میں سے زنادقہ کی دار و گیر اور ان کی تلاش و جستجو تھی۔ اس نے اس مقصد کے لئے ایک خاص افسر مقرر کیا تھا جس کے عہدہ کا نام ہی "صاحب الزنادقہ" رکھا گیا تھا۔ اغانی میں ہے کہ "جب مہدی بصرہ میں آیا تو اس کے ساتھ حمدویہ صاحب الزنادقہ بھی تھا۔ اور مہدی نے بشار کو اس کے حوالہ کیا تھا کہ اُسے جان سے مار ڈالو۔"[1] دوسرے مقام پر ہے کہ " مہدی نے عبدالجبار صاحب الزنادقہ کو حکم دیا جس نے بشار کو قتل کر دیا۔"[2] یہ پہلا موقعہ ہے کہ ہم ایک خاص افسر کی تقرری کے متعلق سنتے ہیں جس سے زندیقوں کے معاملات کا تعلق ہوتا تھا کہ وہ ان کی تلاش و جستجو کرے اور ان کو سزائیں دے۔ طبری ۱۶۷ھ کے حادثات میں بیان کرتے ہیں کہ اس سال مہدی نے زندیقوں کی تلاش میں کوشش کی اور عالم اسلام کے کونہ کونہ میں ان کی جستجو کر کے ان کو قتل کر دیا اور ان لوگوں کے معاملات پر عمر کلوازی کو مقرر کیا۔[3]

مہدی کے بارہ میں مسعودی کا بیان ہے کہ مہدی نے ملحدوں اور دین کے متعلق مداہنت کرنے والوں کو قتل کرنے میں بڑے مبالغہ سے کام لیا کیونکہ اس کے

---

[1] اغانی صفحہ ۷۳، جلد ۳ [2] اغانی صفحہ ۷۲، جلد ۳ [3] طبری صفحہ ۹ جلد ۱۰

عہد میں ان کا زور بہت نمایاں ہو گیا تھا اور یہ لوگ اس کی خلافت کے زمانہ میں اپنے اعتقادات کھلم کھلا بیان کرنے لگے تھے۔ کیونکہ مانی، ابن دیصان اور مرقیون کی کتابیں خوب پھیل چکی تھیں۔ عبداللہ ابن المقفع وغیرہ نے ان کتابوں کو نقل کیا اور فارسی اور پہلوی کی زبانوں سے عربی زبان میں ان کا ترجمہ کیا۔ نیز ابن ابی العوجاء، حماد عجرد، یحییٰ ابن زیاد اور مطیع ابن ایاس وغیرہ نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں جن سے مانیہ، دیصانیہ اور مرقونیہ وغیرہ فرقوں کی تائید مقصود تھی۔ اس کے نتیجہ میں زندیقوں کی تعداد کافی بڑھ گئی اور ان کی آراء لوگوں میں پھیلنے لگیں۔ اول اول تو مہدی نے ان علمائے متکلمین کو حکم دیا جو مناظرہ کا سلیقہ رکھتے تھے کہ ان ملحدین کی تردید میں کتابیں لکھیں اور ان معاندین کے خلاف دلائل و براہین قائم کرکے ان لوگوں پر حق کو واضح کریں جو شک و ارتیاب میں گرفتار ہو چکے تھے[1]

اس سے معلوم ہوا کہ زنادقہ کے خلاف مہدی نے دو کام کئے۔ ایک تو ایسا ادارہ اور محکمہ قائم کیا جو ان کی تلاش و جستجو کرکے ان کے خلاف کارروائی کرے اور دوسرے ان سے مناظرہ کرنے اور ان کی تردید میں کتابیں تصنیف کرنے کے لئے ایک علمی مجلس قائم کی۔

---

[1] مسعودی صفحہ ۲۱۰ جلد ۲

مختصر یہ ہے کہ مہدی کو ان لوگوں کی بڑی فکر رہتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کرنا نہیں بھولا کہ جب خلافت اس تک پہنچے تو وہ بھی ان کو سخت سزائیں دے۔ چنانچہ طبری کا بیان ہے کہ "ایک روز کا واقعہ ہے کہ مہدی کے سامنے ایک زندیق کو پیش کیا گیا۔ اس نے اس زندیق سے توبہ کر لینے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ تو مہدی نے اس کی گردن اڑوا دی اور اسے سولی پر لٹکوا دیا۔ اور اپنے بیٹے موسیٰ — (یہ مہدی کے بیٹے ہادی ہیں) سے کہا! بیٹا! اگر خلافت تمھیں ملے تو اس جماعت یعنی مانی کے معتقدین کے لئے ہر وقت کمربستہ رہنا —— یہ ایسا فرقہ ہے کہ لوگوں کو بظاہر اچھی باتوں کی دعوت دیتا ہے۔ مثلاً فواحش سے اجتناب برتنا دُنیا سے بے تعلق رہنا۔ آخرت کے لئے کام کرنا۔ پھر آہستہ آہستہ انھیں یہ سبق پڑھاتا ہے کہ گوشت کھانا حرام ہے۔ پاک پانی سے نہانا نہیں چاہیئے۔ جانوروں کو قتل نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہ بڑی ہی سنگدلی اور قساوت کی بات ہے۔ اس کے بعد لوگوں کو دو خداؤں کی پرستش سکھاتا ہے۔ ایک نور اور دوسرے ظلمت اس کے بعد پھر یہ تعلیم دیتا ہے کہ بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کر لینا جائز ہے۔ پیشاب سے نہا لینا جائز ہے۔ راستوں سے بچوں کو چُرا کر اغوا کر لینا جائز ہے تاکہ تم ان کو تاریکی کی گمراہی سے نکال کر نور کی ہدایت میں پہنچا سکو۔ لہٰذا ان کے سر پر ہمیشہ لکڑی برسانے رہنا اور تلوار ننگی رکھنا۔ اور ان کو قتل کر کے خدائے وحدہٗ لاشریک کا قرب حاصل کرنا۔ میں نے تیرے دادا عباس کو خواب میں دیکھا ہے

کہ انھوں نے مجھے دو تلواریں پہنائیں اور مجھے دو خدا ماننے والوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ موسیٰ نے وعدہ کیا ــــ اس کے عہد خلافت کو ابھی صرف دس مہینے گذرے تھے ــــ کہ خدا کی قسم اگر میں زندہ رہ گیا تو اس پورے فرقہ کو قتل کردوں گا اور ان میں سے کسی دیکھنے والی آنکھ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کہتے ہیں کہ موسیٰ نے حکم دیا تھا کہ کھجور کے ایک ہزار تنے مہیا کئے جائیں۔ طبری کہتے ہیں کہ موسیٰ نے یہ حکم فلاں مہینے میں دیا تھا۔ اور اس کے دو ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔[1]

ہادی نے اپنے باپ کی وصیت کو پورا کیا۔ چنانچہ وہ بھی زنادقہ کو قتل کرتا تھا۔ طبری سنہ ۱۶۹ھ کے حادثات میں بیان کرتے ہیں کہ ہادی نے اس سال زنادقہ کی تلاش و جستجو میں بڑی شدت برتی۔ چنانچہ ان کے بہت سے لوگوں کو اس جرم میں قتل کیا۔ جن لوگوں کو اس نے قتل کیا ان میں یقطین کا منشی یزدان بن باذان اور اس کا بیٹا علی بن یقطین ــــ یہ دونوں نہروان سے تعلق رکھتے تھے ــــ بھی شامل تھے علی بن یقطین کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حج کرنے کے لئے گیا۔ جب اس نے لوگوں کو طواف میں چلتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا کہ میں ان لوگوں کو ان بیلوں کے سوا اور کس چیز سے تشبیہ دوں جو گندم گاہنے کے لئے کھلیان میں گھوم رہے ہوں۔ علاء بن الحداد اعمی اس کے متعلق کہتا ہے۔

---

[1] طبری صفحہ ۴۲ جلد ۱۰

أَيَا أَمِينَ اللّٰهِ فِي خَلْقِهِ
وَ وَارِثَ الْكَعْبَةِ وَالْمِنْبَرِ
مَاذَا تَرَى فِي رَجُلٍ كَافِرٍ
يُشَبِّهُ الْكَعْبَةَ بِالْبَيْدَرِ
وَ يَجْعَلُ النَّاسَ إِذَا مَا سَعَوْا
حُمُرًا تَدُوسُ الْبُرَّ وَالدَّوْسَرِ

اے خدا کی مخلوق میں اللہ کے امین اور کعبہ اور منبر کے وارث اس کافر آدمی کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے جو کعبہ کو کھلیان سے اور جب لوگ طواف کے لئے دوڑتے ہیں تو ان کو گیہوں اور سرسوں کو گاہنے والے گدھوں سے تشبیہ دیتا ہے۔

چنانچہ موسیٰ نے اسے قتل کر کے سولی پر لٹکا دیا[1]۔

جب ہارون رشید خلیفہ ہوا تو وہ بھی زنادقہ کی دار و گیر کرنے میں اپنے پیشرو خلفاء کے نقوش قدم پر چلا۔ چنانچہ ۱۷۱ھ کے حادثات میں طبری بیان کرتے ہیں کہ ہارون رشید نے اس سال ان تمام لوگوں کو پناہ دیدی تھی جو بھاگ گئے تھے یا چھپ گئے تھے۔ البتہ زنادقہ میں سے کچھ لوگوں کو پناہ نہیں دی گئی تھی جن میں

---

[1] طبری صفحہ ۲۳ جلد ۱۰

یونس بن فروہ اور یزید ابن الفیض بھی شامل تھے[1]

حتیٰ کہ مامون کو بصرہ کے دس زندیقوں کے متعلق اطلاع ملی جو "مانی" کے قول کی طرف رجحان رکھتے اور نور و ظلمت کے قائل تھے۔ جب لوگوں نے مامون رشید کو ان میں سے ہر ایک کا نام لے کر بتایا گیا تو مامون نے حکم دیا کہ ان سب کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے چنانچہ وہ حاضر کیے گئے تو ان کو ایک ایک کر کے بلاتا جاتا اور ان کے دین کے متعلق ان سے پوچھتا۔ سب یہی بتاتے کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا دین اسلام ہے تو مامون ان کا امتحان اس طرح لیتا کہ مانی کا پتلا ان کے سامنے رکھ دیتا اور انھیں حکم دیتا کہ وہ اس پر تھوکیں اور اس سے اپنی برأت کا اعلان کریں۔ نیز ایک دریائی پرندہ "درج" کو ذبح کرنے کا حکم دیتا ان باتوں سے وہ لوگ انکار کر دیتے اور مامون ان کو قتل کر دیتا[2]۔

معتصم کے عہد میں تو زندقہ کی تاریخ میں بڑا حادثہ پیش آیا۔ یہ حادثہ "افشین" کا مقدمہ تھا۔ افشین معتصم کا کمانڈر انچیف تھا۔ جب اس نے بغاوت کی تو اس کے مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے ممبران محمد بن عبدالملک زیات اور احمد بن ابی دؤاد تھے۔ افشین پر کئی قسم کی تہمتیں لگائی گئی تھیں۔ بڑی بڑی تہمتیں یہ تھیں۔

---

[1] طبری صفحہ ۵۰ جلد ۱۰ [2] مسعودی صفحہ ۲۴۹ جلد ۲

۱ـــــ دو آدمیوں نے ـــــ اشروسنہ میں ـــــ ایک مکان پایا جس میں چند بت رکھے ہوئے تھے۔ ان دونوں آدمیوں نے اس مکان سے بتوں کو نکال کر مکان کو مسجد میں تبدیل کر دیا ان میں سے ایک امام بن گیا اور دوسرا مؤذن بن گیا افشین نے ان دونوں آدمیوں کو گرفتار کر کے ان کے ایک ایک ہزار کوڑے لگوائے حتیٰ کہ ان کی کمر کا گوشت بالکل اڑ گیا۔

افشین نے اس الزام کے جواب میں کہا کہ اس نے شہنشاہانِ سغد سے یہ معاہدہ کیا ہوا تھا کہ ہر قوم کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ امام اور مؤذن نے جو کچھ کیا وہ دینی آزادی کی اس ضمانت کے خلاف تھا جو وہ دے چکا تھا اس لئے ان دونوں کو سزا دی گئی۔

۲ـــــ ایک تہمت یہ تھی کہ اس کے مکان سے ایک کتاب برآمد ہوئی جو سونے اور جواہرات اور دیبا سے مزین کی گئی تھی اور اس کتاب میں کفریہ باتیں درج تھیں۔ اس تہمت کے جواب میں اس نے اس کتاب کا اقرار کیا اور بتایا کہ وہ کتاب اسے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہے۔ اس کتاب میں ایرانی آداب و رسوم کا بیان ہے۔ اور اس میں کفریہ باتیں بھی شامل ہیں۔ اسے چونکہ مال و دولت کی ضرورت نہیں تھی اس لئے اس نے اس کتاب کے اوپر سے سونے اور جواہرات وغیرہ اتارنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کتاب کی شان اس سے زیادہ نہیں ہے جیسا کہ کتاب کلیلہ و دمنہ اور کتاب مزدک کی شان ہوتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں

ملک کے بہت سے قاضیوں تک کے مکانات میں موجود ہیں جن پر کوئی بھی اعتراض نہیں کرتا۔

۳۔۔۔ اس کے خلاف تیسری تہمت یہ تھی کہ وہ جھٹکے کا گوشت کھاتا ہے اور کہتا ہے کہ جھٹکے کا گوشت ذبیحہ کے گوشت سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ ہر چہارشنبہ کے دن ایک کالی بکری کو کھڑا کر کے وہ اس کی کمر پر تلوار مار کر اس کے دو حصے کر دیتا اور ان دونوں حصوں کے درمیان چلتا اور پھر ان کا گوشت کھایا کرتا تھا۔

اس الزام کے جواب میں افشین نے کہا کہ جس شخص نے یہ شہادت دی ہے اس کے دشمنوں تک کو اس کا اعتراف ہے کہ وہ قابلِ اعتبار اور بھروسہ کے آدمی نہیں ہیں۔ گواہ کے مکان اور خود افشین کے مکان کے درمیان ایسا کوئی دروازہ یا روشن دان موجود نہیں ہے جس کے ذریعہ سے وہ یہ باتیں دیکھ سکتا اور اس کے حالات کا پتہ لگا سکتا۔

۴۔۔۔ چوتھا الزام یہ تھا کہ رعایا کی طرف سے جو خطوط اشروسنی زبان میں اس کے پاس آتے ہیں ان کی ابتداء کچھ اس طرح کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ "خدائے خدائیگان کے نام اس کے بندے فلاں ابن فلاں کی طرف سے" اس میں اور فرعون کے اس دعوے میں کہ "میں تمھارا سب سے بڑا پروردگار ہوں" کیا فرق رہ جاتا ہے۔

اس الزام کا اس نے جواب دیا کہ یہ لوگ میرے باپ دادا کے نام اسی طرح کے

خطوط لکھا کرتے تھے اور اسلام لانے سے پہلے خود میرے نام بھی اسی طرح کے خطوط لکھتے تھے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں ان کی نگاہوں میں اپنا رتبہ کم کردوں کہ اس طرح ان کی اطاعت و فرماں برداری میں فرق پڑ جاتا۔

۵ — پانچویں تہمت اس کے خلاف یہ تھی کہ اس کے بھائی نے "توہیار" کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ اس روشن دین (دین مجوسیت) کی مدد کرنے والا میرے، تمھارے اور بابک کے سوا کوئی نہیں رہا تھا۔ بابک نے اپنی حماقت سے اپنے آپ کو قتل کرالیا۔ اگر تم نے مخالفت کی تو مسلمانوں کے پاس میرے سوا کوئی آدمی نہیں ہے جسے تیرے مقابلہ کے لئے بھیج سکیں۔ میرے پاس شہسوار بہادر اور جری لوگ موجود ہیں۔ اگر میں تمھارے پاس چلا آؤں تو ہم سے جنگ کرنے کے لئے صرف تین قسم کے آدمی باقی رہ جائیں گے۔ عرب۔ مغاربہ۔ اور ترک۔ عرب کے لوگ تو کتوں کی طرح ہیں۔ ان کے آگے ایک ٹکڑا پھینک دو اور پھر گرز سے ان کا سر کچل دو۔ اور یہ مکھیاں ۔۔۔ یعنی مغربی لوگ ـــــ تو یہ تو سر کھانے والے لوگ ہیں۔ ان سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ رہ گئے شیاطین کے بچے ـــــ یعنی ترکی لوگ ـــــ تو وہ کچھ وقت تک مقابلہ کر سکتے ہیں جب تک ان کے ترکشوں میں تیر باقی رہیں، ان کے تیر ختم کرادو۔ اس کے بعد ان پر اپنے گھوڑے دوڑا دو اور ان کا آخری آدمی تک قتل کر دو۔ اس طرح وہ دین دوبارہ واپس آسکتا ہے جو ہمیشہ سے ایرانیوں کا مذہب رہا ہے۔

اس بڑی تہمت کا خلاصہ یہ تھا کہ افشین نے "قوہیار" سے ساز باز کرکے مملکت اسلامیہ کا تختہ اُلٹنے، خلافت کو مٹانے اور دینِ اسلامی کو ختم کرنے اور دوبارہ ایرانی مملکت قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا جس میں ایرانیوں کی زبان ایرانیوں کا دین اور ایرانیوں کی حکومت ہوتی۔

افشین نے اوّل تو اس خط کا انکار کیا اور کہا کہ اس کے بھائی نے اگر ایسا کوئی خط لکھا ہے تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اور اگر مجھے ذمہ دار ٹھیرایا جائے تو دراصل میری طرف سے یہ ایک حیلہ اور تدبیر تھی جس کے ذریعہ سے میں "قوہیار" پر اپنا اعتماد جماکر اسے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد میں "قوہیار" کو گرفتار کرکے خلیفہ کے حضور میں پیش کر دیتا تاکہ خلیفہ کی بارگاہ میں میرا رتبہ اور بلند ہو جاتا۔

۶۔ چھٹی تہمت اس پر یہ تھی کہ اس نے ختنہ نہیں کرایا تھا۔

اس کے جواب میں افشین نے کہا کہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ لیا جائے گا تو وہ مر جائے گا۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ختنہ نہ کرانے سے آدمی اسلام سے نکل جاتا ہے۔

چنانچہ اسے قید میں ڈال دیا گیا اور اس کا کھانا پینا بند کر دیا گیا حتیٰ کہ وہ مر گیا۔ پھر اسے سولی پر لٹکا کر جلا دیا گیا۔[1]

[1] اس کے مقدمہ کی تفصیلات طبری جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۴ تا ۳۶۹، ابن الاثیر صفحہ ۱۹۰ اور تاریخ ابن خلدون میں دیکھیے۔

ابو تمام نے افشین کی شان میں بے شمار مدحیہ قصیدے کہے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے

لَقَدْ لَبِسَ الْاَفْشِیْنُ قَسْطَلَةَ الْوَغیٰ

مُحِشًّا بِنَصْلِ السَّیْفِ غَیْرَ مُوَاکِلِ

وَ جَرَّدَ مِنْ آرَائِہٖ حِیْنَ اَضْرَمَتْ

بِہِ الْحَرْبَ حَدًّا مِثْلَ حَدِّ الْمَنَاصِلِ

وَ سَارَتْ بِہٖ بَیْنَ الْقَنَابِلِ وَالْقَنَا

عَزَائِمُ کَانَتْ کَالْقَنَا وَالْقَنَابِلِ

وَ قَدْ ظَلِلَتْ عِقْبَانُ اَعْلَامِہٖ ضُحًی

بِعُقْبَانِ طَیْرٍ فِی الدِّمَاءِ نَوَاھِلِ

تَرَاہُ اِلَی الْھَیْجَاءِ اَوَّلَ رَاکِبٍ

وَ تَحْتَ صَبِیْرِ الْمَوْتِ اَوَّلَ نَازِلِ

افشین نے جنگی ہتھیار پہن لئے ہیں۔ تلوار کا پھل اور آنکڑا جو کبھی دشمن کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے اپنی آراء سے جب جنگ کی آگ روشن ہو جاتی ہے تو وہ ایسی دھاریں ننگی کر دیتا ہے جو تیر کے پھل کی دھار کی طرح تیز ہوتی ہیں۔ نیزوں اور سواروں کے درمیان اس کے ارادے اس طرح چلتے ہیں جیسے نیزے اور سوار چلا کرتے ہیں۔ صبح سویرے

اس کے جھنڈے کے عقابوں پر عقاب پرندے کے سائے پڑتے ہیں ایسے عقاب جو خونوں میں نہلائے ہوئے ہوں۔ تم دیکھو گے کہ جنگ کی طرف وہ پہلا بڑھنے والا سوار ہوگا اور موت کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں میں وہ پہلا اُترنے والا مسافر ہوگا۔

لیکن جب اسے سولی دے کر جلا دیا گیا تو ابو تمام ہی نے اس کی مذمت میں ایک لمبا قصیدہ کہا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

قَدْ كَانَ بَوَّأَهُ الْخَلِيفَةُ جَانِبًا

مِنْ قَلْبِهِ حَرَمًا عَلَى الْأَقْدَارِ

فَإِذَا ابْنُ كَافِرَةٍ يُسِرُّ بِكُفْرِهِ

وَجْدًا كَوَجْدِ فَرَزْدَقٍ بِنَوَارِ

خلیفہ نے تو اسے اپنے دل کے ایک کونہ میں جگہ دی تھی اور تقدیروں کا محافظ بنا دیا تھا۔ مگر دیکھو تو۔ کافر عورت کا بیٹا دل میں عشقیہ انداز سے کفر کو چھپائے ہوئے نکلا جیسے فرزدق نے نوار کے عشق کو دل میں چھپا رکھا تھا۔

آگے چل کر وہ کہتا ہے

مَا زَالَ سِرُّ الْكُفْرِ بَيْنَ ضُلُوعِهِ

حَتَّى اصْطَلَى سِرَّ الزِّنَادِ الْوَارِي

ناراً يساور جسمه من حرّها

لهبٌ كما عصفرت شقّ إزار

طارت له شعلٌ يهدّم لفحها

أركانه هدماً بغير غبار

نصّلن منه كلّ مجمع مفصلٍ

ونعلن ناقرة بكلّ فقار

مشبوبة رفعت لأعظم مشركٍ

ما كان يرفع ضوءها للساري

صلّى لها حيّاً وكان وقودها

ميتاً ويدخلها مع الفجّار

يا مشهداً صدرت بفرحته إلى

أمصارها القصوى بنو الأمصار

رمقوا أعالي جذعه فكأنّما

وجدوا الهلال عشيّة الإفطار

کفر متواتر اس کی پسلیوں کے درمیان چھپا رہا تا آنکہ اس نے چقماق کی چھپی ہوئی پوشیدہ آگ سے اپنے آپ کو سینک لیا۔ ایسی آگ جو اس کے جسم پر چھائی جارہی تھی۔ اس کی گرمی میں ایسی لپٹ اور شعلہ تھا

جیسے اس نے ازار کے ایک حصّہ کو عصفر کے زرد رنگ میں رنگ لیا ہو۔ اس آگ سے ایسے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور اس کی لپٹیں اس کے اعضاء کو ایسے گرا رہی تھیں جیسے کسی عمارت کو منہدم کیا جا رہا ہو مگر اس سے غبار نہ اٹھ رہا ہو اس نے اس کے ایک ایک جوڑ بند کو جدا کر دیا اور کمر کے شکوں پر ایک مصیبت ڈھا دی۔ نیز آگ جو ایک عظیم ترین مشرک کے لیے بلند کی گئی تھی وہ شرک جو رات کے چلنے والے مسافروں کے لیے کبھی اپنی روشنی بلند نہیں کیا کرتا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا اس آگ کے لیے نمازیں پڑھتا رہا اور مرا تو اسی کا ایندھن بنا اور مرنے کے بعد گنہگاروں کے ساتھ اُسی میں داخل ہو گا۔ یہ منظر جس کی خوشی کو لے کر مختلف شہروں کے لوگ اپنے دور دراز شہروں کی طرف لوٹے۔ انھوں نے اس کے جسم کے اوپر کے حصّہ کو اس انداز سے دیکھا جیسے افطار کی شام کو لوگ عید کا چاند دیکھ لیں۔

تبریزی کہتے ہیں کہ "افشین نہ کافر تھا نہ منافق۔ وہ ایک ایرانی آدمی تھا۔ اس کے حسن اطاعت اور فرمانبرداری کی وجہ سے معتصم نے اسے اپنا مقرب بنا لیا اور اپنے اہم معاملات میں اس پر اعتماد کرنے لگا۔ حتّٰی کہ بابک خرمی سے جنگ کرنے کا معاملہ بھی اس کے سپرد کر دیا۔ وہ کئی ہزار کی افواج لے کر اس کی طرف روانہ ہوا اور اس نے اسے گرفتار کر لیا...... مگر حاسدوں نے اس کے اور معتصم کے درمیان فساد کا بیج بو دیا۔ معتصم سے انھوں نے کہا کہ وہ تمھاری مخالفت کے لیے تیار ہے

کو رہا ہے اور افشین سے کہا کہ معتصم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمھیں قتل کرا دے اس اندیشہ سے کہ معتصم کا داؤ نہ چل جائے وہ معتصم سے محتاط رہنے لگا معتصم نے اس کی اس احتیاط سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ جو کچھ اسے بتایا گیا تھا وہ بالکل صحیح تھا چنانچہ معتصم نے اسے گرفتار کر کے سولی دے کر اسے جلا دیا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تمام حادثہ کا سبب ابن ابی داؤد تھے کیونکہ ابن ابی داؤد اور افشین میں چل گئی تھی۔ "یہاں اس تحقیق کا موقع نہیں ہے کہ افشین پر جو تہمتیں لگائی گئی تھیں ان میں کچھ اصلیت تھی یا نہیں۔ اس کا محل تاریخی تحقیقات ہی ہو سکتی ہیں۔ ہمیں یہاں صرف اس پہلو سے بحث کرنی تھی کہ وہ زندقہ کے ساتھ متہم کیا گیا تھا اور کیا کیا تہمتیں اس پر لگائی گئی تھیں اور کس طریقہ سے اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور بس۔

مختلف معانی جن پر زندقہ کا لفظ بولا جاتا تھا

اس کے بعد یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جس عہد کی ہم تاریخ بیان کر رہے ہیں اس عہد میں "زندقہ" کا مفہوم کیا سمجھا جاتا تھا اور جب وہ کسی آدمی کو زندقہ کے ساتھ متہم کرتے تھے تو ان کی کیا مراد ہوتی تھی اور اس کا باعث کیا ہوتا تھا؟

سچ یہ ہے کہ "زندقہ" کے لفظ کے معنی اور مفہوم سب لوگوں کے نزدیک یکساں نہیں تھے۔ خواص اور علماء کے ذہن میں اس کا جو مفہوم تھا وہ اس مفہوم سے قطعاً مختلف تھا جو عوام کے ذہن میں ہوتا تھا:

عام لوگ عموماً اس لفظ کا اطلاق ہر رند مشرب اور آزاد منش پر کر دیا کرتے تھے۔ وہ اس قسم کے لوگوں کو زندیق کہہ دیا کرتے تھے۔ ابراہیم بن سیار شاعر پر زندقہ کی تہمت تھی حالانکہ اس کے متعلق کوئی ایسی بات مشہور نہیں ہے جس کا تعلق دین سے ہو۔ اس کے متعلق اتنا ہی مشہور ہے کہ وہ آزاد منش اور رند مشرب آدمی تھا۔ بڑا نادرہ گو تھا۔ لڑکوں سے محبت کرتا تھا اور رند مشرب لوگ ہی اسے پسند کرتے تھے۔[۱] آدم، جو عمر بن عبدالعزیز کے پوتے تھے ان پر بھی زندقہ کی تہمت تھی۔ کیونکہ وہ بھی رند مشرب اور آزاد منش شاعر تھے شراب پیتے تھے اور شراب خوری میں بڑی افراط سے کام لیتے تھے۔ بعض مرتبہ ان کی زبان پر ـــــ نشہ کی حالت میں ـــــ کچھ ایسے اشعار بھی آجاتے تھے جن کا دین سے بھی لگاؤ ہوتا تھا۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

اِسْقِنِیْ وَاسْقِ خَلِیْلِیْ	فِیْ مَدَی اللَّیْلِ الطَّوِیْلِ
لَوْنُهَا اَصْفَرُ صَافٍ	وَهِیَ کَالْمِسْكِ الْفَتِیْلِ
فِیْ لِسَانِ الْمَرْءِ مِنْهَا	مِثْلُ طَعْمِ الزَّنْجَبِیْلِ
رِیْحُهَا یَنْفَحُ مِنْهَا	سَاطِعًا مِنْ رَأْسِ مِیْلِ
مَنْ یَنَلْ مِنْهَا ثَلَاثًا	یَنْسَ مِنْهَاجَ السَّبِیْلِ
فَمَتٰی مَا نَالَ خَمْسًا	تَرَكَتْهُ كَالْقَتِیْلِ

---

[۱] ملاحظہ ہو اغانی صفحہ، جلد ۱۱

لَيْسَ يَدْرِیْ حِيْنَ ذَاكُمْ مَا دَبِيْرٌ مِنْ قَبِيْلٍ
إِنَّ سَمْعِیْ عَنْ كَلَامِ الـــــلَّوْمِ فِيْهَا الثَّقِيْلِ
لَشَدِيْدُ الْوَقْرِ إِنِّیْ غَيْرُ مِطْوَاعٍ ذَلِيْلِ
قُلْ لِمَنْ يَلْحَاكَ فِيْهَا مِنْ فَقِيْهٍ أَوْ نَبِيْلِ
أَنْتَ، دَعْهَا وَارْجُ أُخْرٰى مِنْ رَحِيْقِ السَّلْسَبِيْلِ
تَعْطَشُ الْيَوْمَ وَتُسْقٰى فِیْ غَدٍ نَعْتَ الطُّلُوْلِ

مجھے اور میرے دوست کو تمام لمبی رات تک شراب پلاتا رہ۔ اس کا رنگ صاف زرد ہے وہ بٹی ہوئی مشک کی طرح ہے۔ اسے پی کر آدمی کے منہ میں ایسا مزہ آتا ہے جیسے سونٹھ پی کر آتا ہے۔ اس کی بو اس سے اس طرح پھیلتی اور بلند ہوتی ہے کہ ایک میل پرے سے سونگھ لو۔ جب اس کے تین پیگ مل جائیں وہ سیدھے راستہ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اور اگر کہیں قسمت سے پانچ پیگ مل جائیں تو وہ اسے مقتول کی طرح کر کے چھوڑتے ہیں۔ اس کے بعد اسے اس کی بھی خبر نہیں رہتی کہ جنوبی ہوا کونسی ہوتی ہے اور شمالی ہوا کونسی میرے کان اس آدمی کی باتوں کو سننے سے جو مجھے شراب کے بارہ میں ملامت کرے بہرے ہیں۔ ان میں سخت ڈاٹ لگی ہوئی ہیں۔ میں ایسے آدمیوں کا فرمانبردار اور باتیں سننے والا نہیں ہوں جو مجھے شراب کے بارہ میں برا بھلا کہے وہ خواہ کوئی فقیہہ ہو یا کوئی بہت باعزت آدمی ہو اس سے کہہ دے۔

تو یہ سب کچھ کہہ رہا ہے ؟ میاں جلنے بھی دو۔ تم اسے چھوڑ دو۔ تم رحیق
اور سلسبیل کی دوسری شراب کی آس لگائے بیٹھے رہو۔ آج پیاسے رہو۔
کل تمہیں ٹیلوں کے نیچے شراب پلائی جائے گی۔

یا مثلاً وہ کہتا ہے :-

اِسْقِنِیْ وَاسْقِ غُصَیْنًا   لَا تَبِعْ بِالنَّقْدِ دَیْنًا
اِسْقِنِیْهَا مُرَّةَ الطَّعْمِ   تُرِیْكَ الشَّیْنَ زَیْنًا

مجھے اور شاخچہ کو شراب پلا دے۔ نقد کے عوض قرض فروخت نہ کر۔ مجھے
وہ تلخ مزہ والی شراب پلا دے جو تجھے عیب کو بھی ہنر بنا کر دکھلائے۔

ان اشعار کی وجہ سے آدم پر زندقہ کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ مہدی اس کو گرفتار کر کے تین سو کوڑے اس کے لگواتا ہے تاکہ وہ زندقہ کا اقرار کرے مگر آدم کہتا ہے کہ " خدا کی قسم میں نے پل بھر کے لئے بھی کبھی خدا کے ساتھ شرک نہیں کیا۔ آپ نے کسی قریشی کو زندیق بنتے دیکھا ہے ؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ نشہ کا مجھ پر غلبہ ہوا اور یہ شعر میرے دل پر وارد ہو گئے۔ میں ایک قریشی نوجوان ہوں۔ نبیذ پیتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں رندی کے طور پر کہتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد سے آدم نے شراب نوشی اور رند مشربی کو بالکلیہ خیرباد کہہ دیا تھا، حتیٰ کہ حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ شراب پینے والوں اور شراب کے نام تک سے بیزار ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

شَرِبْتُ فَلَمَّا قِيلَ لَسْتَ بِنَازِعٍ
نَزَعْتُ وَثَوْبِي مِنْ أَذَى اللُّؤْمِ طَاهِرُ

میں نے شراب پی - لیکن جب کہا جانے لگا کہ میں اس سے باز آنے والا نہیں ہوں تو میں اس سے باز بھی آگیا - میرا لباس کمینگی کی گندگی سے بہرحال پاک ہے -

آپ دیکھئے کہ آدم نے کبھی بھی علمی زندقہ کا ارتکاب نہیں کیا - شراب کے نشہ کا اس پر غلبہ ہوتا تو وہ اس قسم کی باتیں کہہ گذرتا جو بیہودہ ہوتی تھیں - لوگوں نے اس بنا پر اس پر بھی زندقہ کی تہمت لگادی - یہ تہمت اسی زندقہ کے عام اور مشہور مفہوم کے اعتبار سے لگائی گئی تھی -

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے شعراء لوگوں کو فسق وفجور کی دعوت دینے میں افراط سے کام لینے لگے تھے اور انھیں لاابالی پن پر ابھارتے رہتے تھے وہ اپنی دعوت میں اسی پر اکتفاء نہیں کرتے تھے کہ بغیر دین کو بیچ میں لائے ہوئے وہ اپنی دعوت دیدیں بلکہ بسا اوقات وہ دین کو بھی نشانہ بنا لیتے تھے - وہ علانیہ ایسی باتیں کہتے تھے جس سے دین کے ساتھ تمسخر اور تلعب کا پہلو نکلتا تھا - وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے تھے جو شراب کو حرام کہتے تھے - وہ ان لوگوں کا تمسخر اڑاتے تھے جو انھیں جہنم کے عذاب سے ڈراتے یا یوم حشر اور حساب وکتاب کا ذکر کرتے تھے - چنانچہ بشار کہتا ہے -

لَا خَيْرَ فِي الْعَيْشِ اِنْ كُنَّا كَذَا اَبَدًا

لَا نَلْتَقِي وَ سَبِيْلُ الْمُلْتَقَى نَهَجٌ

قَالُوْا: حَرَامٌ تَلَاقِيْنَا! فَقُلْتُ لَهُمْ

مَا فِي التَّلَاقِي وَلَا فِي قُبْلَةٍ حَرَجٌ

ایسی زندگی میں کوئی بھلائی نہیں اگر ہم ہمیشہ اسی طرح رہیں کہ ایک دوسرے سے نہ مل سکیں حالانکہ ملاقات کا راستہ صاف اور کشادہ ہے لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا ایک دوسرے سے ملنا حرام ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ ایک دوسرے سے ملنے اور بوس وکنار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس قسم کی چیزیں ابتداءً خفیف انداز میں شروع ہوئیں۔ اس کے بعد شدت اختیار کرتی چلی گئیں تا آنکہ ایک گونہ الحاد تک پہنچ گئیں۔ ان میں سے ہمیں سب سے زیادہ شدت ابونواس میں ملتی ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔

وَ مُلِحَّةٍ بِاللَّوْمِ تَحْسَبُ اَنَّنِيْ

بِالْجَهْلِ اُوْثِرُ صُحْبَةَ الشُّطَّارِ

بَكَرَتْ عَلَيَّ تَلُوْمُنِيْ فَاَجَبْتُهَا

اِنِّيْ لَاَعْرِفُ مَذْهَبَ الْاَبْرَارِ

فَدَعِي الْمَلَامَ فَقَدْ اَطَعْتُ غَوَايَتِيْ

وَصَرَفْتُ مَعْرِفَتِیْ اِلَی الْاِنْکَارِ
وَرَأَیْتُ اِیْثَارَ اللَّذَاذَۃِ وَالْھَوٰی

وَتَعَجُّلًا مِنْ طِیْبِ ھٰذِی الدَّارِ
اَحْرٰی وَاَحْزَمُ مِنْ تَنَظُّرِ اٰجِلٍ

عِلْمِیْ بِہٖ رَجْمٌ مِنَ الْاَخْبَارِ
مَا جَاءَنَا اَحَدٌ یُخَبِّرُ اَنَّہٗ

فِیْ جَنَّۃٍ مَنْ مَاتَ اَوْ فِی النَّارِ

بعض اصرار کے ساتھ ملامت کرنے والیاں ایسی ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے شاطروں کی صحبت کو اختیار کئے ہوئے ہوں۔ وہ صبح صبح ملامت کرنے کے لئے آجاتی ہیں۔ میں انھیں جواب دیتا ہوں کہ میں نیک لوگوں کا مذہب و مسلک اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اپنی ملامت کو چھوڑو۔ میں تو خود گمراہی کا مطیع بنا ہوا ہوں اور میں نے اپنی معرفت کو انکار میں تبدیل کر رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لذت اور خواہشات کو پورا کر لینا ہی بہتر ہے۔ اس جہان کی تمام اچھی چیزوں کو جلد اور نقد صورت میں اختیار کر لینا، مدت کے بعد ملنے والی چیز کا انتظار کرنے کے مقابلہ میں زیادہ مناسب اور زیادہ محتاط طریقہ ہے جبکہ وہ مدت کے بعد ملنے والی چیزیں ایسی ہوں کہ ان کے متعلق میرا علم محض

اٹکل پچو بھی ہو۔ جو لوگ مر گئے ان میں سے ہمارے پاس لوٹ کر یہ خبر دینے کے لئے کوئی نہیں آیا کہ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں۔

اور وہ کہتا ہے۔

يَا نَاظِرًا فِي الدِّيْنِ مَا الْأَمْرُ
لَا قَدَرٌ صَحَّ وَلَا جَبْرُ
مَا صَحَّ عِنْدِي مِنْ جَمِيْعِ الَّذِي
تَذْكُرُ إِلَّا الْمَوْتُ وَالْقَبْرُ

اے دین میں غور و فکر کرنے والے! آخر یہ معاملہ کیا ہے کہ نہ قدر کی بات صحیح ٹھہری نہ جبر کی؛ جو کچھ تو بیان کرتا ہے ان سب میں سے میرے نزدیک کوئی بات بھی تو سوائے موت اور قبر کے صحیح نہ ٹھہر سکی۔

اور وہ کہتا ہے؛

قُلْتُ وَالْكَأْسُ عَلَى كَفِّيْ تَهْوِي لِالْتِثَامِيْ
أَنَا لَا أَعْرِفُ ذَاكَ الْيَوْمَ فِيْ ذَاكَ الزِّحَامِ

جبکہ شراب کا پیالہ میرے ہاتھ میں تھا اور وہ میرے منہ سے لگنے کے لئے نیچے آ رہا تھا میں نے کہا کہ میں اس اژدحام میں اس دن کو نہیں پہچانتا۔

لہ یہ اشعار موشح صفحہ ۲۶۷ و مابعد سے نقل کئے گئے ہیں۔ نیز قاضی عبدالعزیز جرجانی کی کتاب الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ کے صفحہ ۵۰ و مابعد سے اس کتاب میں آپ کو اس قسم کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

یہ بعض شعراء جن کی زبان پر اس قسم کی باتیں آجاتی تھیں۔ اس قسم کی باتیں کہنے کے باوجود اپنے دین کے متعلق قطعاً مطمئن ہوتے تھے۔ بات یہ تھی کہ نشہ کے غلبہ میں ان کی زبان پر اس قسم کے اشعار آجاتے تھے اور وہ انھیں اپنی زبان سے ادا کر دیتے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ آدم بن عبد العزیز بن عمر ابن عبد العزیز کے اشعار کے متعلق آپ اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں۔

جو لوگ ان اشعار کو سنتے تھے وہ آپس میں اختلاف کرنے لگتے تھے۔ کچھ لوگ ان جیسے اشعار کی وجہ سے ناراض ہو جاتے تھے اور ان کے قائل پر الحاد بے دینی اور دین سے نکل جانے کا فتویٰ لگا دیتے تھے۔ دوسرے لوگ ان اشعار کو حقیقت پر محمول نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اسے ایک قسم کا مذاحیہ کلام سمجھتے تھے جو محض نکاتہ انداز میں رندانہ طریقہ پر کہہ دیا جاتا تھا۔ اس آخری بنیاد کے مطابق عموماً اس عہد میں ظریف آدمی کو بھی زندیق کہہ دیا جاتا تھا۔ ابو نواس، عباس ابن فضل بن ربیع کی تعریف میں کہتا ہے۔

نَدِیْمُ کَأْسٍ مُحَدِّثُ مَلِکٍ

فِیْهِ مُغَنٍّ وَظَرْفُ زِنْدِیْقٍ

شراب کے پیالہ کا ندیم، بادشاہ کا مصاحب۔ اس میں ایک مغنی کا غرور اور ایک زندیق کی ظرافت پائی جاتی ہے۔

بلکہ بعض لوگ اس تہمت میں مشہور تھے کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق زندیق

کی باتیں نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ ظرافت میں مشہور ہو جائیں۔ چنانچہ اغانی میں ہے کہ محمد بن زیاد ظرافت کے طور پر زندقہ کا اظہار کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے بارہ میں ابن مناذر کا قول ہے کہ

يَا ابْنَ زِيَادٍ، يَا أَبَا جَعْفَرٍ

أَظْهَرْتَ دِينًا غَيْرَ مَا تُخْفِي

مُزَنْدِقُ الظَّاهِرِ بِاللَّفْظِ فِي

بَاطِنِ إِسْلَامِ فَتًى عَفِّ

لَسْتَ بِزِنْدِيقٍ وَلٰكِنَّمَا

أَرَدْتَ أَنْ تُوسَمَ بِالظَّرْفِ

اے ابن زیاد، اے ابو جعفر! جو کچھ تمہارے دل میں ہے تم اس کے برخلاف اپنا دین ظاہر کرتے ہو۔ ظاہر میں لفظی طور پر زندیق بنتے ہو مگر باطن میں ایک پاک دامن نوجوان آدمی کا سا اسلام رکھتے ہو۔ تم زندیق نہیں ہو لیکن تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں ظرافت کے لقب کے ساتھ یاد کیا جائے۔[1]

کسی اور نے بھی کہا ہے

تَزَنْدَقَ مُعْلِنًا لِيَقُولَ قَوْمٌ　　إِذَا ذَكَرُوهُ زِنْدِيقٌ ظَرِيفٌ

---

[1] اغانی صفحہ ۱۵ جلد ۱۷

فَقَدْ بَقِیَ التَّزَنْدُقُ فِیْہِ وَسْمًا وَمَا قِیْلَ الظَّرِیْفُ وَلَا اللَّطِیْف

اس نے علانیہ زندقہ کی باتیں کیں تاکہ لوگ جب اس کا نام لیں تو اُسے
ظرافت آشنا زندیق کہیں۔ لیکن اس کی شہرت زندقہ کے ساتھ تو
باقی رہ گئی مگر کسی نے نہ اسے ظریف کہا اور نہ لطیف المزاج۔

مختصر یہ ہے کہ اس معنی میں زندقہ —— یعنی لاابالیانہ پن کے معنی میں —— پھر بتدریج ترقی کرتے کرتے ذومعنی الفاظ کے ساتھ کبھی کبھی دین کے خلاف استہزاء کے معنی میں۔ پھر اس میں غلو اور مبالغہ کرنے اور بے سوچے سمجھے ملحدانہ الفاظ کہدینے کے معنی میں —— غرضکہ یہ تمام استعمالات اسی عہد میں عام اور مشہور تھے۔ عام لوگوں کے اذہان میں زندقہ کے یہ سارے معانی ہوتے تھے۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے لوگ کہدیا کرتے تھے کہ "زندقہ کی تین نشانیاں ہیں۔ شراب پینا۔ فیصلہ دینے میں رشوت لینا۔ اور زناکاری کی کمائی کھانا"[1]

زندقہ کا ایک اور مفہوم بھی تھا جسے خواص سمجھتے تھے۔ اس کی حقیقت ان کے نزدیک یہ تھی کہ آدمی بظاہر تو مسلمان ہوجائے لیکن دل میں اپنے قدیم ایرانی مذہب سے تعلق باقی رکھے۔ خصوصیت کے ساتھ مانی کے مذہب سے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عہد میں ایسے بہت سے لوگ تھے جو دل سے تو ایمان نہیں لائے تھے البتہ اسلام کے

---

[1] العقد الفرید صفحہ ۱۸۰ جلد ا

غلبہ کی وجہ سے بظاہر مسلمان ہو گئے تھے کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ جاہ، عزت اور مال و دولت حاصل کرنے کا ذریعہ اسلام لانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن وہ دل میں اپنے پرانے دین کے لئے خلوص رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی اغراض اس سے بھی گہری ہوا کرتی تھیں۔ وہ دیکھتے تھے کہ اسلامی عقائد کو خراب کرنے کا ذریعہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ خود کو اولاً اسلام کے ساتھ منسوب کر لیا جائے تاکہ ان کی جانب سے کسی کو کوئی خطرہ باقی نہ رہے اور لوگ آسانی کے ساتھ ان کی باتیں قبول کر سکیں۔ چنانچہ وہ مسلمان بن کر مختلف صورتوں میں اپنی تعلیمات کا جادو پھونکتے رہتے تھے۔ کبھی علم اور دین کے مسائل میں اور کبھی ادب اور لٹریچر میں اور کبھی عربوں کی برائیاں گھڑنے میں۔ وقتاً فوقتاً ان کی حرکتوں کا علم ہوتا رہتا اور ان کو سزائیں دیجاتی رہتی تھیں لیکن یہ لوگ اس طرح ختم نہیں ہوتے تھے۔ یہ لوگ کبھی تو انفرادی طور پر اس قسم کے کام کرتے تھے اور کبھی اجتماعی طور پر۔ یہ عہد جس کی ہم تاریخ بیان کر رہے ہیں اس قسم کی مثالوں سے بھرا ہوا تھا۔ عبد الکریم ابن ابی العوجار پر جب زندقہ کی تہمت لگائی گئی کہ وہ اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر رسول اللہ صلعم کی احادیث کو خراب کرتا رہا تھا، تو جب اسے منصور قتل کراتا ہے اور وہ اقرار کرتا ہے کہ اس نے چار ہزار جھوٹی، بناوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر لوگوں میں پھیلا دی ہیں[1]۔ اسی طرح

---

[1] امالی المرتضیٰ صفحہ ۸۹ جلد ۱

حماد الراویہ لغت اور ادب کو خراب کرتا رہا۔ وہ اپنی طرف سے شعر بنا بنا کر متقدمین شعراء کی طرف منسوب کرتا اور انھیں ان کے اشعار میں گھسیڑ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اکثر راویوں کو کہنا پڑا کہ حماد نے شعر کو خراب کر دیا ہے۔ وہ ایسا آدمی تھا جسے صنعت شعر پر اتنی بڑی قدرت حاصل تھی کہ وہ ہر شخص کے اشعار میں اس کے انداز کے اشعار بنا بنا کر ملا دیا کرتا تھا[1]۔ صالح بن عبد القدوس اشعار میں زندقہ کے مضامین ملا دیا کرتا تھا۔ یونس ابن ابی فردہ نے عربوں کی برائیوں پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں اس نے اپنے خیال کے مطابق عربوں اور اسلام کے عیوب جمع کر دیئے تھے۔ اس کتاب کو لے کر وہ شہنشاہ روم کے دربار میں حاضر ہوا اور اس سے انعام میں بہت سامال حاصل کیا[2]۔

یہ اور ان جیسے دوسرے لوگ علمی انداز میں زندقہ کو پھیلاتے تھے۔ وہ درحقیقت مانی اور مزدک کے دین کے پیرو ہوتے تھے۔ نور اور ظلمت پر ایمان رکھتے تھے۔ بالفاظ دیگر علمی طور پر وہ مجوسیت کے متبع اور مبلغ ہوتے تھے لیکن تقیہ کے طور پر بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے تاکہ اس طرح لوگوں کو گمراہ کر سکیں اس خاص مفہوم کی طرف رہنمائی ہمیں اس روایت سے ملتی ہے جو اغانی نے بیان کی ہے کہ بشار نے حماد عجرد کی ہجو میں جب یہ شعر کہے تھے کہ

---

[1] امالی المرتضیٰ صفحہ ۹۰ جلد ۱ [2] ایضاً صفحہ ۹۰ جلد ۱

يَا ابْنَ نَهْبَى رَأْسٌ عَلَيَّ ثَقِيلُ
وَاحْتِمَالُ الرَّأْسَيْنِ أَمْرٌ جَلِيلُ
فَادْعُ غَيْرِي إِلَى عِبَادَةِ رَبَّيْنِ
فَإِنِّي بِوَاحِدٍ مَشْغُولُ

اے نہبی کے بیٹے! مجھ پر تو ایک سر ہی بہت گراں ہے۔ دو سروں کو اٹھانا تو بہت بڑی بات ہے دو پروردگاروں کی عبادت کے لئے میرے سوا کسی دوسرے کو بلالے کیونکہ مجھے تو ایک ہی سے فرصت نہیں ہے۔

تو حماد نے کہا تھا کہ مجھے بشار سے اور کوئی شکایت نہیں۔ مجھے بشار کے اس تجاہل عارفانہ پر غصہ آتا ہے جو اس نے زندقہ کے بارہ میں استعمال کیا ہے۔ وہ لوگوں کو اس شبہ میں ڈالنا چاہتا ہے کہ اس کے خیال میں زندیق لوگ سر کی پرستش کرتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ بشار بیچارہ کو زندقہ کی کچھ خبر ہی نہیں۔ کیونکہ سر دو کی پرستش ایک ایسی بات ہے جسے عام لوگ ہی کہتے ہیں حقیقت سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ حالانکہ بشار کو بخدا زندقہ کا علم مانی سے بھی زیادہ ہے[1]۔ ابو نواس کہتا ہے کہ میں یہی سمجھتا تھا کہ حماد عجرد پر اس کے رندانہ اشعار کی وجہ سے

---

[1] اغانی صفحہ ۷۰، جلد ۱۳

زندقہ کی تہمت لگادی گئی تھی۔ لیکن جب مجھے زنادقہ کے قید خانہ میں حماد کے ساتھ قید کیا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ حماد تو زنادقہ کے اماموں میں سے ایک امام ہے۔ اس کے دو دو شعروں کے ایسے قطعات ہیں جنھیں زندیق لوگ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں[1]۔

اس عہد میں بہت سے لوگ زندقہ میں مشہور تھے۔ ان میں سے تینوں حماد یعنی حماد بن عجرد، حماد الراویہ، اور حماد بن الزبرقان، بشار بن برد، ابن المقفع یونس بن ابی فروہ، مطیع بن ایاس، عبد الکریم ابن ابی العوجاء، صالح بن عبد القدوس، علی ابن الخلیل، اور ابن المناذر زیادہ مشہور ہیں۔ اغانی وغیرہ میں ان کے حالات کے ضمن میں ایسے بہت سے قصے ملیں گے جن سے ان کے زندقہ کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بعض لوگوں کے درمیان بعض اوقات بڑی دوستی اور محبت ہوتی تھی اور بعض اوقات دشمنی، عداوت اور طعن و تشنیع بھی۔

موالی اور عربوں میں زندقہ

ہم دیکھ رہے ہیں کہ مذکورہ اشخاص میں زیادہ تر ایران کے آزاد شدہ غلام ہی ہیں۔ یہ بات بالکل طبعی تھی کیونکہ اس معنی میں زندقہ کی طرف ـــــ کے اسلام لے

---

[1] اغانی صفحہ ۸۴، جلد ۱۳

پیچھے ایرانی ادیان میں سے مجوسیت کا کوئی دین چھپا ہوا ہوتا تھا ــــ طبعاً وہی لوگ زیادہ رجحان رکھتے تھے جن کی اصل مجوسی ہوتی تھی۔ تاہم عربوں بلکہ ہاشمیوں میں سے بھی ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن پر زندقہ کی تہمت تھی۔ مثلاً حسین عبد اللہ بن عبید اللہ بن عباس بن عبد المطلب اور عبد اللہ بن معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر ابن ابی طالب[1] اور مثلاً طبری کے بیان کے مطابق خلیفہ مہدی کے سامنے داؤد بن علی اور یعقوب بن فضل بن عبد الرحمن بن عباس بن ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کو پیش کیا گیا۔ ان دونوں پر زندقہ کی تہمت تھی اور مہدی کے سامنے ان دونوں نے اس کا اقرار کیا[2]۔ لیکن عربوں میں زندقہ شاذ و نادر ہی پایا جاتا تھا۔ جن لوگوں پر زندقہ کی تہمت لگائی گئی ہے وہ زیادہ تر اس کے پہلے مفہوم کے اعتبار سے ہے یعنی رندانہ مشربی اور فسق و فجور اور تمسخر وغیرہ کے لحاظ سے یا ان کو زندقہ کے ساتھ متہم کرنا وہ جال ہوتا تھا جو سیاسی خصومتوں کی وجہ سے ان کے خلاف لگا دیا جاتا تھا۔

اس قسم کے زندقہ میں ہم نشینوں کا ایک بڑا گروہ بھی بڑی شہرت رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اس طرح زیادہ تر ایرانی الاصل ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے

---

[1] ان دونوں کے زندقہ کا حال اغانی صفحہ ۷۵، جلد ۱۱ و ما بعد میں دیکھیے۔

[2] طبری صفحہ ۲۳ جلد ۱۰

تھوڑی تھوڑی مقدار ہر علم سے حاصل کی ہوتی تھی مگر کسی علم میں بھی ان کو گہرائی
نصیب نہیں ہوتی تھی۔ یہ لوگ اپنے متعلق بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہوتے تھے اور
ان میں زیادہ تر زندیق ہوتے تھے۔ جاحظ کہتے ہیں کہ "ان میں سے کسی مبتدی کو
جہاں ذرا عربی کے کچھ چلتے ہوئے فقرے یاد ہوئے اور علم کی موٹی موٹی باتیں معلوم
ہوئیں اور فوراً اس نے بزرجمہر کی "امثال"، "اردشیر کا عہد"، عبدالحمید کے "رسائل"
اور ابن المقفع کا "الادب" پڑھا اور مزدک کی کتاب کو اپنے علم کا سرچشمہ اور کلیلہ
دمنہ کے دفتر کو اپنی حکمت کا خزانہ قرار دیا اور اسے فوراً یہ وہم سوار ہوا کہ وہ تدبیر و انتظام
میں فاروق اکبر اور تفسیری علم میں ابن عباس اور حلال و حرام کے علم میں معاذ
بن جبل اور فیصلہ اور احکام پر جرأت کرنے میں علی ابن ابی طالب اور جزء اور طفرہ
جیسے مسائل میں ابوالہذیل علاف اور مکامنات اور مجانسات جیسے مسائل میں
ابراہیم ابن سیار نظام اور عبادات اور اثبات وغیرہ مسائل میں حسین نجار اور
لغت اور علم انساب میں اصمعی اور ابوعبیدہ بن گیا ہے۔ اس کا سب سے پہلا نشانہ
قرآن کریم بنتا ہے اور اس کے نظم و ترتیب پر اعتراضات شروع ہو جاتے ہیں۔
کبھی کہا جاتا ہے کہ اس میں تناقض پایا جاتا ہے۔ پھر آگے بڑھ کر احادیث کی
تکذیب کر کے اپنی ظرافت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ احادیث کی رُوات پر نکتہ چینیاں
کی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص رسول اللہ کے صحابہ کی خوبیاں بیان کرتا ہے تو ان کا
ذکر آتے ہی وہ اپنی باچھیں چبانے لگتا ہے اور ان کے محاسن سے پہلو تہی کر کے

اِدھر اُدھر نکل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر ان کے سامنے شریح کا نام لیا جائے تو وہ اس پر جرح کر دیں گے۔ اگر حسن بصری کا ذکر کیا جائے تو انھیں بڑا ہی گراں گذریگا۔ اگر ان کے سامنے شعبی کا تذکرہ کیا جائے تو وہ انھیں احمق بتائیں گے۔ اور اس کے بعد اپنی اس مجلس کا خاتمہ اردشیر بابکان کی سیاست، نوشیرواں کی تدبیر مملکت، آل ساسان کے حسنِ انتظام کے تذکرہ پر کر دیں گے۔ اگر انھوں نے دیکھا کہ لوگوں کی نگاہیں خشمگیں ہیں اور مسلمان جز بز ہو رہے ہیں تو احادیث کا مقابلہ و موازنہ معقولات سے کرنا شروع کر دیں گے۔ قرآن کے محکمات و منسوخات کا تذکرہ چھیڑ دیں گے اور بتائیں گے کہ جو چیزیں آنکھوں سے نظر نہیں آتیں ان کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور غائب چیزوں کو حاضر چیزوں سے تشبیہہ دینا شروع کر دیں گے۔ انھیں منطق کے سوا دوسری کتابیں پسند ہی نہیں آتیں...... ان کے کردار اور اخلاق کے متعلق عام طور سے یہی کچھ مشہور ہے۔[1]

بعض مرتبہ "زنادقہ" کا لفظ ایرانی دین کے پیروؤں پر بھی بول دیا جاتا ہے۔ یعنی بغیر اس کے کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ جاحظ کی کتاب الحیوان میں ہمیں اکثر یہ استعمال بھی ملتا ہے۔ چنانچہ جاحظ کہتے ہیں۔ "ان زنادقہ کی کتابیں اوراق کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہوتی ہیں۔ ان پر سیاہ چمکدار روشنائی سے

---

[1] ثلاث رسائل للجاحظ صہ ۴۲

لکھا جاتا ہے۔ اور خط بھی نہایت پاکیزہ ہوتا ہے[۱]۔ ان کی کتابیں علم اور حکمت کے اعتبار سے کچھ مفید نہیں ہوتیں۔ نہ ان میں کوئی چلتی ہوئی ضرب المثل ہوتی ہے نہ عمدہ خبر، نہ ادبی صنعت نہ کوئی عجیب و غریب حکمت کی بات نہ فلسفہ نہ کلام کا کوئی مسئلہ...... اس میں سب سے بڑا حصہ نور اور ظلمت کے ذکر کا ہوتا ہے یا شیاطین کی شادیوں کے افسانے اور دیوؤں کی جنگوں کا تذکرہ۔ ان میں آپ کو صندید کا تذکرہ ملے گا اور صبح کے ستون سے ڈرانے کا حال۔ اس کے بعد جاحظ ان کی کتابوں کی مذمت کرتے ہیں اور ان کے مضامین کا مذاق اڑاتے ہیں[۲]۔

جاحظ کہتے ہیں کہ "یہ زنادقہ بہت سے لوگوں پر اثر انداز ہوئے خصوصیت کے ساتھ صوفیوں اور نصرانیوں پر۔ چنانچہ یہ لوگ ذبیحہ کا گوشت کھانے سے احتراز کرتے تھے اور خون بہانے کو بہت برا جانتے تھے۔ گوشت خوری میں زہد سے کام لیتے تھے۔" جاحظ آگے چل کر کہتے ہیں کہ۔ کچھ لوگ جو خود کو حلقہ بگوش اسلام کہتے تھے شکار کرنے سے بڑے گھناؤنے پن کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ سنگدلی تھی اور اس سے انسانوں کی خونریزی کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں گھٹ جاتی تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک رحمدلی تو بہر حال ایک ہی شکل کی چیز ہے۔

---

[۱] حیوان صفحہ ۲۰ جلد ۱ [۲] حیوانی صفحہ ۲۹ جلد ۱

جو کتے پر رحم نہیں کرتا وہ ہرن پر کب رحم کر سکتا ہے اور جو ہرن پر رحم نہیں کھاتا وہ بکری کے بچے پر کب رحم کھا سکتا ہے۔ جو ایک چڑیا پر ترس نہیں کھا سکتا وہ ایک انسانی بچہ پر کب ترس کھا سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی بڑی بڑی باتوں تک پہنچا دیتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے یہ لوگ زندیقوں کے طریقہ سے کس قدر مشابہت رکھتے ہیں[۱]۔

زندقہ کا ایک دوسرا مفہوم بھی تھا جسے جاحظ وغیرہ اکثر استعمال کر جاتے ہیں وہ اس لفظ کا اطلاق ایسے لوگوں پر کر دیتے ہیں جو غور و فکر کے بعد دنیا کے تمام ادیان سے انکار کر دیتے تھے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ دہریت اور الحاد کے ہم معنی ہوتا تھا۔ ابو العلاء نے اپنے رسالہ "الغفران" میں کہا ہے کہ "زنادقہ وہی لوگ ہیں جنھیں دہریہ بھی کہہ دیتے ہیں یہ لوگ نہ نبوت کے قائل ہوتے ہیں نہ کسی کتاب کے"۔

اسی مفہوم میں جاحظ بھی ایک جگہ کہتے ہیں کہ "زندقہ نصاریٰ میں بڑا عام تھا"[۲]۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زندقہ کے لفظ سے، جاحظ کا مقصد شک و ارتیاب وغیرہ ہے۔

ان تمام باتوں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ زندقہ کا لفظ صرف ایک

---

[۱] حیوان صفحہ ۱۳۶ - ۱۳۷ جلد ۴ [۲] ثلاث رسائل للجاحظ صفحہ ۱۷

مفہوم ہی میں مستعمل نہیں ہوتا تھا بلکہ کم از کم چار معنوں میں بولا جاتا تھا۔

۱ــــ آزادہ روی، تمسخر، مجور، رندانہ گوئی وغیرہ۔ اس کے ڈانڈے کبھی کبھی دین سے مل جاتے تھے۔ لیکن اس کا قائل سوچ سمجھ کر دہ باتیں نہیں کہتا تھا بلکہ محض لا اُبالیانہ پن اور رندانہ روش کے ماتحت کہہ گذرتا تھا۔

۲ــــ دین مجوسیت کی پیروی، خصوصاً مانی کے دین کا اتباع جس کے ساتھ اسلام کا مظاہرہ بھی پایا جائے جیسا کہ افشین، بشار، حماد اور ابن المقفع پر تہمت لگائی گئی تھی۔

۳ــــ دین مجوسیت کا اتباع خصوصاً دین مانی کی پیروی بغیر اسلام کے مظاہرہ کے جیسا کہ جاحظ نے زنادقہ کی بعض کتابوں کے متعلق ذکر کیا ہے۔

۴ــــ ملحدین جن کا کوئی دین نہ ہو۔ مثلاً وہ لوگ جن کی نمائندگی معرّی کرتا ہے۔ لیکن ظاہر یہی ہے کہ یہ لفظ ــــ زیادہ تر ان لوگوں پر بولا جاتا تھا جو بباطن مانویت کے پیرو تھے اور بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس کے مفہوم میں وسعت آتی گئی۔ چنانچہ رندمشرب لوگوں اور ایسے ملحدوں کو بھی زندیق کہنے لگے جن کا کوئی دین ہی نہیں ہوتا تھا۔
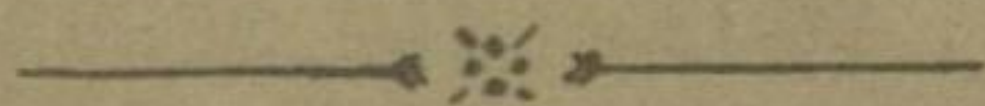
بہرحال زندقہ اپنے مختلف معانی میں اس عہد میں پھیلا ہوا تھا۔ ابوالعلاء نے اپنے رسالہ "الغفران" میں خلیفہ اموی، دعبل شاعر، بشار،

ابونواس، صالح بن عبدالقدوس، ابومسلم خراسانی، یعنی مملکت عباسیہ کا مؤسس اول، بابک، افشین، اور حلاج صوفی وغیرہم کو زنادقہ میں سے شمار کیا ہے۔" چنانچہ دعبل کے بارہ میں وہ کہتے ہیں کہ" مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دعبل ابن علی کا کوئی دین نہیں تھا۔ وہ بظاہر شیعہ بنا ہوا تھا لیکن اس سے اس کی غرض محض روپیہ کمانا تھا۔ مجھے اس میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے کہ دعبل دراصل حکمی (ابونواس) اور اس کے طبقہ کے لوگوں کی رائے پر عمل پیرا تھا۔ ان لوگوں میں زندقہ خوب پھیلا ہوا تھا اور ان کے شہر میں ہی اس نے نشو ونما پائی تھی۔" پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ" ابونواس کے بارہ میں بڑا اختلاف ہے۔ اس کے متعلق دعویٰ تو یہ کیا جاتا ہے کہ وہ بڑا خدا پرست تھا اور اپنے دن کی نمازوں کو رات کے وقت قضا پڑھ لیا کرتا تھا لیکن صحیح یہی ہے کہ اس کا مذہب وہی کچھ تھا جو اس کے عہد کے دوسرے لوگوں کا تھا۔"

اس عہد میں زنادقہ کا ہونا ایک طبعی امر تھا جس کے اسباب مختلف تھے کچھ لوگ تو ایسے تھے کہ انھیں زندقہ کی طرف ان کا وہ دین مائل کرتا تھا جس سے وہ پرانے زمانہ سے مانوس چلے آتے تھے۔

زندقہ کے اسباب و وجوہ

اور یہ دین مجوسیت تھا۔ اس دین میں ان کی کئی نسلیں گذر چکی تھیں۔ ان کی اپنی عادات و رسوم تھیں جو سلف سے

ان میں چلی آرہی تھیں۔ لیکن انھوں نے دیکھا کہ جاہ و مرتبہ اور عزت و شرف کے مناصب تک وہ اس کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے کہ مسلمان ہو جائیں چنانچہ وہ اسلام لے آئے

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِهِمْ

لیکن ابھی تک ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا تھا۔

مگر اسلام کو انھوں نے محض اپنا ظاہری لبادہ بنایا تھا۔ جب وہ اپنے خاص لوگوں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھتے تھے تو اس لبادہ کو اتار دیا کرتے تھے ـــ اور جب کبھی انھیں موقعہ ملتا ـــ تو وہ اسلام اور عربوں کے خلاف سازشیں کرتے اور شعوبیت اور دیگر مذاہب دینیہ کی طرف لوگوں کو دعوتیں دیتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں ادیان کے بارہ میں شک و شبہ نے زندقہ کی طرف دعوت دی تھی یہ لوگ آخری حدود تک عقل کے تسلط اور غلبہ کے قائل تھے۔ وہ صرف ان چیزوں پر ایمان لانا چاہتے تھے جنھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہوں۔ جن امور میں عقل کی مجال بھی نہیں ہے وہ وہاں بھی عقل کے فیصلوں پر چلنا چاہتے تھے۔ بالآخر انھوں نے سارے کے سارے ادیان کو چھوڑ دیا تھا اور الحاد کے داعی بن گئے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا سب سے بڑا مقصد ان کی اپنی خواہشات اور شہوات ہوتی تھیں۔ ان کے نزدیک زندگی شراب اور کباب تک ہی محدود تھی۔ وہ اپنی عقلوں کو سوچنے سمجھنے کی تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے۔ دین بھی ایک سوچنے سمجھنے ہی کی چیز تھی، دین کے خلاف انھیں اس وقت بڑا غصہ آتا تھا

جب وہ ان کی شہوات سے معارض ہوتا اور ان کی لذتوں کو محدود کرنا چاہتا۔ اس حالت میں جبکہ وہ نشہ میں چور ہوتے تھے وہ ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ زبان سے نکالتے اور دین کا مذاق اور تمسخر اڑاتے —— زندیقوں کی یہ ساری اقسام ہی عباسی عہد میں موجود تھیں۔ جمہور مومنین ان کو ناپسند کرتے اور ان کے خلاف جنگ کرتے تھے۔

لیکن یہ کہنا بھی بالکل ہی صحیح ہوگا کہ زندقہ کی تہمت اس زمانہ میں کسی خاص حد تک محدود نہیں تھی۔ چنانچہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا نہایت ہی قلبی دوست ہوتا۔ اس کے بعد ان کے تعلقات خراب ہو جاتے تو سب سے پہلے

جھوٹ اور سچ زندقہ کی بکثرت تہمتیں

جو وہ اس کے خلاف تہمت لگاتا تھا۔ وہ یہی ہوتی تھی کہ وہ تو زندیق ہے۔ مثال کے طور پر بشار اور حماد نے جو ایک دوسرے کی ہجو کی ہے اسے ملاحظہ فرمایئے۔ یا مثلاً اس قول کو دیکھئے جو خلاد ارقط کہتا ہے کہ یونس کے حلقہ میں ابن مناذر کا ذکر کیا گیا اس پر حلقہ والوں میں سے زیادہ تر لوگوں نے ابن مناذر پر طعن و تشنیع کی حتیٰ کہ لوگوں نے اسے زندقہ کی طرف بھی منسوب کر دیا۔ جب میں اس حلقہ سے اٹھ کر اس سائبان کے نیچے پہنچا جو مسجد کے اگلے حصہ میں بنا ہوا تھا یکایک میں نے قرات کی آواز سنی جو قریب ہی قبلہ کی دیوار کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ ابن مناذر کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں دوبارہ اس حلقہ کی طرف لوٹا تو میں نے حلقہ والوں سے کہا کہ تم اس شخص کے متعلق یہ کچھ کہہ رہے تھے مگر وہ تو اسی جگہ کھڑا ہو کر

نماز پڑھ رہا ہے جہاں سے خدا کے سوا اسے اور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔[1]

پھر یہ لوگ بڑی جلدبازی سے تہمتیں لگا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ابوالعتاہیہ کے

خلاف زندقہ کی تہمت محض اس کے ان اشعار کی وجہ سے لگا دیتے ہیں۔

كَأَنَّ عَتَابَةَ مِنْ حُسْنِهَا

دُمْيَةُ قَسٍّ فَتَنَتْ قَسَّهَا

يَا رَبِّ لَوْ أَنْسَيْتَنِيهَا بِمَا

فِي جَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ لَمْ أَنْسَهَا

عتابہ اپنے حسن کی وجہ سے گویا راہب کی گڑیا معلوم ہوتی ہے جس نے

اپنے راہب کو اپنے عشق میں مبتلا کر دیا ہو۔ اے پروردگار اگر تو مجھے

جنت الفردوس کی حوروں کے ذریعہ سے عتابہ کو بھلانا چاہے تو میں

اسے ہرگز نہ بھول سکوں گا۔

اور اس کے ان اشعار کی وجہ سے کہ

إِنَّ الْمَلِيكَ رَآكِ أَحْسَنَ خَلْقِهِ وَرَأَى جَمَالَكْ

فَحَذَا بِقُدْرَةِ نَفْسِهِ حُورَ الْجِنَانِ عَلَى مِثَالِكْ

خدا نے تجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ حسین دیکھا اور تیری خوبصورتی کو

---

[1] اغانی صفحہ ۲۹ جلد ۱۷

نظر استعجاب و پسندیدگی سے دیکھ کردہ اپنی قدرت کے ساتھ جنت کی حوروں میں
تیرے ہی نمونہ پر چلا (یعنی اس نے حوریں تیرے نمونہ پر تیار کردیں)

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر

یہ کہ جب وہ دیکھتے تھے کہ ابوالعتاہیہ ہمیشہ موت ہی کا ذکر کرتا ہے تو کہنے لگتے تھے
کہ ابوالعتاہیہ زندیق ہے کیونکہ وہ موت ہی کا ذکر کرتا ہے، جنت اور جہنم کا ذکر
نہیں کرتا[1]۔

ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں لوگ زندقہ کی تہمت لگانے
میں بہت افراط سے کام لینے لگے تھے۔ باوجودیکہ تہمت کے جھوٹی ہونے کا اندیشہ
بھی ہوتا تھا۔ ابوالعلاء اپنے رسالہ "الغفران" میں کہتے ہیں کہ کتاب "الورقہ"
کے مصنف نے ابونواس کے طبقہ کے بہت سے شعراء اور اس سے پہلے کے
شعراء کا ذکر کیا ہے اور انھیں زندیق قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کی
پوشیدہ باتیں ہماری نگاہوں میں تو نہیں ہوتیں ان کو تو سوائے علام الغیوب کے
اور کون جان سکتا ہے۔ لہذا یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

جیسا کہ ادبی مخاصمتیں زندقہ کی تہمت لگانے کا سبب بن جاتی تھیں اسی طرح
دینی اور سیاسی مخاصمتیں بھی اس کا سبب بنجایا کرتی تھیں۔ صاحب اغانی کا بیان
ہے کہ "حُمید بن سعید معتزلہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھا۔ اس نے بعض مسائل

---

[1] اغانی صفحہ ۱۵۱ جلد ۳ [2] اغانی صفحہ ۱۴۲ جلد ۳

میں احمد ابن ابی داؤد سے اختلاف کیا۔ احمد نے معتصم کو اس کے برخلاف بھڑکا دیا کہ وہ تو شعوبی اور زندیق ہے۔[1] اصمعی ہمیشہ برمکیوں کا مقرب بنا رہتا تھا اور ان کی مدح کیا کرتا تھا لیکن جب ان کو سزا دی گئی تو وہی اصمعی ان کے بارہ میں کہنے لگا تھا۔

اِذَا ذُکِرَ الشِّرْکُ فِیْ مَجْلِسٍ
اَضَاءَتْ وُجُوْہُ بَنِیْ بَرْمَکٍ
وَ اِنْ تُلِیَتْ عِنْدَھُمْ اٰیَۃً
اَتَوْا بِالْاَحَادِیْثِ عَنْ مَزْدَکٍ

جب ان کی مجلس میں شرک کا بیان کیا جاتا ہے تو بنو برمک کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اور اگر ان کے سامنے قرآن کی کوئی آیت تلاوت کر دی جائے تو وہ پھر مزدک کی باتیں نقل کرنے لگ جاتے ہیں۔

پھر کیا تعجب کی بات نہیں کہ بشار ساری عمر رندانہ اور لاابالیانہ اشعار کہتا رہا اور دور سے یا قریب سے دین و مذہب پر بھی برابر چھینٹے اڑاتا رہا۔ یہ سب کچھ وہ تقریباً اسی سال یا اس کے لگ بھگ کرتا رہا مگر اس پر کسی نے نکتہ چینی نہیں کی۔ بجز اس کے کہ ایک زمانہ میں خلیفہ نے اسے عورتوں سے متعلق عشقیہ اشعار کہنے سے منع کر دیا تھا۔ بلکہ

---

[1] اغانی صفحہ ۱۷ جلد ۱۔

ہم تو خود مہدی کو دیکھتے ہیں ـــــ جس نے زنادقہ کے خلاف سب سے زیادہ دار و گیر کا بازار گرم کیا تھا ـــــ کہ وہ اس کی حمایت کرتا تھا اور فقہا بھی اس کے اشعار کی تاویلیں کر لیا کرتے تھے[1]۔ لیکن جب وہ اسی سال کا یا اس سے بھی متجاوز ہو گیا اور اس نے مہدی کے وزیر یعقوب بن داود کی ہجو میں یہ اشعار کہے۔

بَنِیْ اُمَیَّۃَ ھُبُّوْا طَالَ نَوْمُکُمْ

اِنَّ الْخَلِیْفَۃَ یَعْقُوْبُ بْنُ دَاوُدِ

ضَاعَتْ خِلَافَتُکُمْ یَا قَوْمِ فَانْتَظِرُوْا

خَلِیْفَۃَ اللّٰہِ بَیْنَ الزِّقِّ وَالْعُوْدِ

اے بنو امیہ اٹھو! تمھیں سوتے ہوئے عرصہ دراز گذر گیا۔ اب تو خلیفہ یعقوب بن داؤد بن بیٹھا ہے۔ اے قوم! تمھاری خلافت ختم ہو گئی۔ اس دن کا انتظار کرو کہ اللہ کے خلیفہ کی نعش چمڑے اور لکڑی کے درمیان رکھ دی جائے۔

اس نے مہدی کی بھی ہجو لکھی اور بڑی فحش ہجو لکھی۔ تو اس کے بعد بشار کو ـــــ محض اس بات پر سزا دی گئی کہ وہ زندیق ہو گیا ہے چنانچہ اس کے کوڑے لگوائے گئے اور وہ مرگیا۔ بعینہ یہی صورت ابن المقفع کے بارہ میں پیش آئی۔

---

[1] اغانی صفحہ ۵۷ جلد ۳

منصور کا اس سے سیاسی جھگڑا ہوا اور سفیان بن معاویہ بن یزید بن مہلب کا بھی جھگڑا ہوا۔ ان دونوں نے اسے قتل کیا اور زندقہ کی اس پر تہمت لگا دی۔

حقیقت یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے زندقہ کو اپنے مخالفین سے انتقام لینے کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا۔ اس میں شعراء، علماء، امراء اور خلفاء سب ہی شامل تھے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو جن کا عقیدہ بالکل صحیح ہوگا مگر ان میں آزادیِ رائے پائی جاتی ہوگی۔ جن کی بناء پر بعض مسائل میں انھوں نے جمہور علماء سے اختلاف کیا ہوگا تو ان کو بھی زندقہ کے نام سے بدنام کر دیا گیا ہوگا۔

زندیق کے بارہ میں فقہی فیصلہ

ہمیں زنادقہ کے بارہ میں فقہی حکم حنفیہ کے ہاں —— جو عراقی ہیں —— اس حکم سے ترا شدید ملتا ہے جو شافعیہ کے ہاں ہے۔ اکثر حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ مرتد اگر توبہ کر لے تو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن زندیق اگر توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس مسئلہ میں شافعیہ اس کے خلاف گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زنادقہ کی طرف سے اگر توبہ کا ظہور ہو جائے تو ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔[1]

---

[1] اس سلسلہ میں الاوم صفحہ ۵۶ اجلد ۶ ملاحظہ فرمایئے۔ زندیق کے بارہ میں صاحب فتح القدیر نے حنفیہ کی دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ یعنی امام مالک اور امام احمد کے قول کے مطابق اور دوسری روایت یہ کہ توبہ قبول کر لی جائے گی یعنی امام شافعی کے قول کے مطابق صفحہ ۲۷۳ جلد ۴۔

بہر حال اس عہد میں جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں زندقہ کی تحریک بڑی سخت
تھی۔ جس پر بہت سے لوگ بھینٹ چڑھائے گئے۔ کبھی سچ مچ اور کبھی جھوٹ موٹ۔

ایمان

زندقہ اور شک کی اس تحریک کے مقابلہ میں دوسری طرف صادق ایمان
کی تحریک تھی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس عہد کی زندگی کی تمام اہم پہلوؤں
کو سمجھ سکیں تو ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس طرح ہم نے زندقہ کے پہلو کی مصوری
کی ہے اسی طرح ایمان کے پہلو کی بھی پوری پوری مصوری کر دیں۔ جہاں تک میں نے
سمجھا ہے اس عہد میں ایمان کا پہلو زیادہ عام اور زیادہ مشہور تھا۔ اور زندقہ
ــــ شک یا الحاد کے معنی میں ــــ مؤمنین کی بڑی تعداد کے مقابلہ میں بہت
تھوڑے سے مفکرین ہی کا حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین اور دینی مقالات مرتب
کرنے والوں کے لئے زنادقہ کا نام لے دینا ممکن ہوا جبکہ انھیں بعض لوگوں کے
زندیق ہونے میں شک بھی تھا۔ لیکن ان کے لئے مؤمنین کے نام گنانا آسان
نہیں تھا کیونکہ ایمان تو ایک بنیادی چیز تھی جو عموماً پائی ہی جاتی تھی۔ برخلاف
زندقہ کے کہ عام رجحانات کے برعکس وہ شاذ و نادر ہی پایا جاتا تھا۔ زنادقہ کے
ناموں میں تھوڑا سا اضافہ اس لئے ہو گیا کہ ان حضرات نے رند مشرب اور لا ابالی
لوگوں کو بھی زندیق کہنا شروع کر دیا خواہ دین کے بارہ میں ان کے دلوں تک شک
وارتیاب پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ بالفاظ دیگر آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان بیچاروں نے
دین کے بارہ میں تو ایجابی یا سلبی کسی حیثیت سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ ان میں سے

زیادہ تر لوگوں کا حشر زنادقہ کے ساتھ ہوا بھی تو سیاسی حیثیت سے ہوگا دینی حیثیت سے نہیں۔ نیز زیادہ تر زنادقہ ایسے بھی تھے کہ ان کا زندقہ درحقیقت اس بنا پر نہیں تھا کہ وہ اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے ناپسند کرتے تھے جس کی خاص تعلیمات تھیں جو ان لوگوں کی عقل میں نہیں آتی تھیں بلکہ دراصل ان کا زندقہ وطنی اور قومی جہت سے تھا اور زیادہ تر یہ چیز ایرانی قوم کے لوگوں میں تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان کی حکومت کا زوال عربوں کے ہاتھوں پیش آیا تھا۔ عربوں کے لیے ایسا کرنا ہرگز ممکن نہ ہوتا اگر وہ اس نئے دین کے متبع نہ بنے ہوتے۔ یہ نیا دین اسلام تھا۔ اس بنا پر وہ عربوں سے بھی نفرت کرتے تھے اور اسلام سے بھی۔ رہ گیا وہ زندقہ جو مختلف ادیان کے متعلق کسی گہری، عمیق بحث و تحقیق کا نتیجہ ہو، جس سے بعض اوقات شک یا انکار کی کیفیت پیدا ہو جائے تو یہ چیز ان لوگوں میں شاذ و نادر ہی تھی۔

※

مؤمنین کا بلند تر نمونہ ایمانِ صادق میں بہت سے لوگوں نے شہرت پائی۔ ایمانِ صادق کا بلند ترین نمونہ اور معیار عبداللہ بن المبارک، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، داؤد طائی۔ اور فضیل بن عیاض جیسے حضرات تھے[1]۔ آپ ان کے حالات زندگی پڑھئے۔ ان میں آپ کو

[1] ان کے حالات "وفیات الاعیان"، "طبقات ابن سعد"۔ اور "تراجم المحدثین" میں دیکھئے۔

نمایاں طور پر تقویٰ، طہارت، ورع، قناعت، ایمانِ صادق، امرار اور خلفاء کی وابستگی سے دور بھاگنا، کسی منصب کو قبول کرنے سے الگ رہنا جو عباسیوں نے ان کو پیش کیا ہو، ملے گا۔

شاید اس نوع کی زندگی کی بہترین تصویر ابن قتیبہ کا وہ بیان ہے جو انھوں نے ابن السماک کے مرثیہ میں داؤد طائی کے لئے نقل کیا ہے۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں "یقیناً داؤد نے اپنے دل کی آنکھوں سے اس آخرت کو دیکھ لیا تھا جو ان کے سامنے موجود تھی۔ دل کی اس بصیرت نے آنکھوں کی بصارت کو چندھیا دیا تھا چنانچہ صورت یہ ہو گئی تھی کہ جن چیزوں کی طرف تم دیکھتے ہو وہ ان کی طرف شاید دیکھتے ہی نہیں تھے۔ اور شاید تم ان چیزوں کو نہیں دیکھتے جنھیں وہ دیکھتے تھے۔ لہذا تمھیں ان پر حیرت ہوتی تھی اور انھیں تم پر۔ جب انھوں نے تمھیں دیکھا کہ تم دنیا کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو اور سب کچھ بھلا بیٹھے ہو اور فتنہ میں گرفتار ہو گئے ہو کہ دنیا نے تمھاری عقلوں کو کند کر دیا ہے اور اس کی محبت میں تمھارے دل مُردہ ہو چکے ہیں تو انھیں تم سے وحشت ہونے لگی جب میں انھیں دیکھتا تھا تو یوں نظر آتا تھا کہ مُردوں کے درمیان میں ایک زندہ آدمی کھڑا ہے۔ اے داؤد! اپنے زمانہ کے لوگوں میں تمھاری کتنی عجیب شان تھی! تم اپنے نفس کا اعزاز چاہتے تھے اس لئے تم نے اس کے ساتھ اہانت کا سلوک کیا۔ تم اسے راحت دینا چاہتے تھے اس لئے تم نے اسے

تعب و مشقت میں مبتلا رکھا۔ تم عمدہ کھانے کھانا چاہتے تھے اس لئے تم نے
اپنے آپ کو روکھا سوکھا کھلایا۔ تم نرم لباس پہننا چاہتے تھے اس لئے تم نے
اپنے آپ کو موٹا جھوٹا پہنایا۔ پھر تم نے اپنے نفس کو مار دیا اس سے پہلے کہ اس پر
موت طاری ہو۔ تم نے اسے دفن کر دیا اس سے پہلے کہ وہ واقعی دفن ہو جائے۔
تم نے اپنے نفس کو مشقتوں کا خوگر بنایا تاکہ اسے عذاب نہ دیا جائے۔ تم نے
اپنے نفس کو دنیا سے بے نیاز کر دیا کہ کوئی اس کا ذکر تک نہ کرے۔ تمھارا
نفس دنیا سے بے رغبت ہو گیا چنانچہ تمھاری نظر میں آخرت کے مقابلہ میں
دنیا کی کوئی قدر ہی نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ تم نے حاصل کرنا چاہا تھا
اس میں تم کامیاب ہو گئے۔ تمھاری پہچان تمھارے باطن میں تھی۔ تمھارے
ظاہر میں نہیں تھی۔ تم نے اپنے دین کی سمجھ بوجھ (فقہ) حاصل کی اور لوگ گا
گاتے رہے۔ تم نے رسول اللہ کی حدیثیں سنیں اور لوگ باتیں ہی بناتے
رہے۔ تم گونگے بن گئے اور لوگ بولتے رہے۔ نہ تم نیک لوگوں پر حسد کرتے
تھے اور نہ شریر لوگوں کی عیب جوئی۔ نہ تم بادشاہوں سے عطیے قبول
کرتے تھے اور نہ دوستوں کے ہدیے۔ سب سے زیادہ اُنس تمھیں اس وقت
حاصل ہوتا تھا جب تم تنہائی میں اپنے خدا سے لو لگا کر بیٹھتے تھے اور سب سے
زیادہ وحشت تمھیں اس وقت ہوتی تھی جب لوگوں کو تم سے انس ہوتا تھا اور
وہ تمھیں گھیر لیتے تھے۔ تم جیسی باتیں کس نے سنیں اور تم جیسا صبر اور تم جیسا تحمل

ارادہ کس نے کیا؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنے بعد آنے والے عابدوں کو بڑی مشقت میں ڈال دیا ہے۔ تم نے اپنے آپ کو اپنے گھر میں مقید رکھا کہ تم سے باتیں کرنے والا اور تمھارے پاس بیٹھنے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ تمھارے نیچے بستر تھا اور نہ تمھارے دروازہ پر کوئی پردہ۔ تمھارے پاس کوئی مٹی کا ایسا برتن نہیں تھا جس میں تمھارے پینے کے لئے پانی ٹھنڈا ہو سکے۔ کوئی لگن ایسا نہیں تھا جس میں تمھارے صبح یا شام کے لئے کھانا رکھا جا سکے۔ تمھارا برتن تمھارا دل تھا اور تمھارا پیالہ تمھارا وضو کرنے کا بدھنا۔

اے داؤد! تمھیں نہ ٹھنڈے پانی کی خواہش ہوتی تھی نہ اچھے اور لذیذ کھانے کی نہ نرم اور ملائم لباس کی۔ کیوں نہیں! تمھیں ان چیزوں کی رغبت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ مستقبل تمھارے سامنے واضح ہو چکا تھا۔ کتنی چھوٹی چیزیں تھیں وہ جو تم نے خرچ کر دیں اور ان نعمتوں کے مقابلہ میں جن کی تمھیں بجا طور پر توقع ہے وہ کتنی حقیر چیزیں تھیں جنھیں تم نے چھوڑ دیا۔ جب تمھارا انتقال ہو گیا تو تمھارے پروردگار نے تمھاری موت سے تمھاری شہرت کر دی اور تمھیں تمھارے عمل کی چادر کا لباس پہنایا۔ تمھارے متبعین بے شمار ہو گئے۔ اگر تم دیکھو کہ تمھارے جنازہ میں کون کون لوگ حاضر ہیں تو تمھیں معلوم ہو کہ تمھارے پروردگار نے تمھیں کتنا اعزاز اور شرف عطا فرمایا ہے۔ آج تمھارا خاندان اپنی تمام زبانوں کے ساتھ بول سکتا ہے کیونکہ تمھارے

ذریعہ سے خدا نے تمھارے خاندان کا شرف واضح کر دیا ہے"۔

سفیان ثوری اپنے صلاح، تقویٰ، ورع اور علم کے باوجود تجارت پر زندگی بسر کرتے تھے۔ حکام سے عطایا قبول نہیں کرتے تھے۔ عباسیوں نے انھیں کوفہ کا قاضی بنانا چاہا اور ان کو بلایا گیا۔ وہ اپنی زندگی کے طویل عرصہ تک اِدھر اُدھر بھاگتے اور چھپتے رہے کبھی عراق سے یمن اور یمن سے مکہ وغیر ذلک کہ کہیں عباسیوں کے ہاتھ نہ آجائیں۔ سلطان سے چھپے ہوئے ہی تھے کہ سنہ ۱۶۱ھ میں انتقال فرمایا۔

کتاب الاغانی اور شعراء کے دوادین میں جس طرح لہو ولعب اور رندی ولاابالیانہ زندگی کی مصوری کی گئی ہے اسی طرح علماء کے حالات زندگی کی کتابوں مثلاً طبقات ابن سعد، اور طبقات المحدثین وغیرہ میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی کی بھی مصوری کی گئی ہے۔ جب آپ کتاب الاغانی کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو یوں معلوم ہوگا کہ زندگی ساری کی ساری رندی ولاابالی اور عیش وعشرت ہی کی زندگی تھی۔ لیکن جب آپ محدثین اور صوفیہ کے طبقات کا مطالعہ فرمائیں گے تو ایسا نظر آئے گا کہ زندگی ساری کی ساری دین، ورع، تقویٰ، اور طہارت ہی کی زندگی تھی۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ اس عہد میں زندگی مختلف اقسام و[illegible] اور متفرق اندازوں اور رنگوں کی زندگی تھی تو آپ واقعی طور پر انصاف

کام ہیں گے۔ عباسی مدنیت اور تہذیب بھی باقی تمام مدنیتوں اور تہذیبوں ہی کی طرح تھی۔ یہاں مسجد بھی تھی اور شراب خانہ بھی۔ پڑھنے والے بھی تھے اور نے نواز بھی۔ صبح کے انتظار میں تہجد پڑھنے والے بھی تھے اور صبح صبح باغوں میں نکل جانے والے بھی۔ تہجد میں شب بیداری کرنے والے بھی تھے اور گلنے بجانے میں شب بیداریاں کرنے والے بھی۔ وہ بھی تھے جنھیں دولت کی فراوانی نے ہیضہ ہو رہا تھا اور وہ بھی تھے جن کے چلتے کام مفلسی سے رُک کر رہ گئے تھے۔ دین میں شک بھی تھا اور یقین کے ساتھ ایمان بھی۔ عباسی دور حکومت میں یہ سب کچھ تھا۔ اور بڑی کثرت کے ساتھ تھا۔

لیکن مومنین کی یہ قسم جن کے نام ہم نے اوپر گنائے ہیں مثلاً سفیان اور داؤد، وغیرہ۔ یہ حضرات شک اور زندقہ میں گرفتار لوگوں کے ساتھ معرکۂ جہاد میں قدم نہیں رکھتے تھے۔ انھیں غرض تھی تو بس اپنے ایمان سے تھی انھیں دوسروں کے الحاد کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ مومنین جو ملحدین کے رد وابطال کے لئے ہردم کمربستہ رہتے تھے وہ اس عہد کے معتزلہ تھے جیسے واصل بن عطا۔ ابوہذیل علاف۔ بشر بن المعتمر۔ ابراہیم نظام وغیرہ جو کچھ زنادقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا وہ اسے لے کر اس کا تحلیل وتجزیہ کرتے، ان کا مقابلہ کرتے اور ان کی تردیدیں کرتے اور ان کے خلاف دلائل وبراہین قائم

کرتے تھے، کتابوں میں اس قسم کے بہت سے مناظرے اور مباحثے موجود ہیں۔ معتزلہ پر جب ہم گفتگو کریں گے تو ان باتوں سے اس وقت تعرض کریں گے۔

لغات القرآن

جلد اوّل

سالہا سال کی دیدہ ریزیوں اور تفہیمی کاوشوں کا جگمگاتا شاہکار

جس کا برسوں سے انتظار تھا

قرآنی معارف و مطالب کا

بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا

فجر الاسلام

اس دور کی علمی حرکات اور ذہنی کیفیات کا تفصیلی جائزہ
جب آفتاب اسلام کی جلوہ باریوں سے قبل، بزم انسانیت کی تاریکیاں
آخری سانس لے رہی تھیں!!

علامہ احمد امین مصری مرحوم کی علمی و تاریخی کاوشوں کا شاہکار
اور "اسلام کی سرگذشت" کے سلسلۂ دراز کی پہلی کڑی ——
جسے مولانا عمر احمد صاحب عثمانی نے اردو زبان کا لباس پہنایا

نو سو صفحات پر مشتمل ضخیم اور علم افروز تصنیف

قیمت —— آٹھ روپے

اسلامی معاشرت

(تیسرا ایڈیشن)

مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآنی ارشادات بالخصوص عورتوں بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں مل سکے گی۔

قیمت:۔ دو روپے

مکتبہ طلوع اسلام
۲۷-بی ــ شاہ عالم مارکیٹ ــ لاہور

جوئے نور

آسمانی انقلاب کی شعلہ و شبنم آمیز داستان

از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ

اقوام گذشتہ کا

عبرت انگیز

انجام

قیمت چھ روپے

مکتبہ طلوع اسلام

۲۷-بی - شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

شعلۂ مستور

محترم پرویز صاحب نے قرآن اور تاریخ کی روشنی میں جناب مسیحؑ کی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ جس میں آپ کی پیدائش۔ ابتدائی زندگی۔ دعوت۔ آپ کے خلاف سازش۔ ہجرت وغیرہ کے واقعات کے علاوہ، عیسائیت کے غلط عقائد الوہیت، ابنیت، کفارہ وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث ہے۔

ضخامت پونے تین سو صفحات

قیمت مجلد چھ روپے

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے
متعلق محترم پرویز صاحب کے
انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

قیمت دو روپے

مکتبہ طلوع اسلام

۲۷-بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور